اس شمارے میں

اس شمارے میں

قومی میلہ مویشیاں ــــ گھوڑوں کی خرید وفروخت!

آج 5 مارچ ہے اور لاہور کے فوٹرلیس سٹیڈیم میں سالانہ میلہ اسپاں و مویشیاں (ہارس اینڈ کیٹل شو) کا آغاز ہو رہا ہے۔ زندہ دلانِ لاہور کے لئے حکومتِ پنجاب نے شہر کے مختلف گوشوں سے شہریوں کو اس میلے کی رونقیں دکھانے کے لئے "مفت" شٹل بس سروس، گیارہ مقامات سے چلانے کا اہتمام و انتظام کیا ہے۔

دوسری طرف آج کے دن گھوڑوں کی ایک اور "منڈی" بھی سج رہی ہے، جسے سیاسی زبان میں "ہارس ٹریڈنگ" کہتے ہیں، جس کا انتظام قومی اسمبلی کے علاوہ چاروں صوبائی اسمبلیوں میں کیا گیا ہے، جہاں ہمارے ووٹوں سے منتخب ہمارے معزز نمائندے، کروڑ پتی اور ارب پتی سینٹ کے امیدواروں سے اپنے ووٹ کی قیمت، حسبِ توفیق ایک سے لے کر پندرہ کروڑ تک وصول کر کے ثواب دارین حاصل کریں گے۔

ماضی میں سینٹ کے ہر الیکشن کے موقع پر "گھوڑوں کی خرید وفروخت" (ہارس ٹریڈنگ) کا یہ کاروبار کھلے اور چھپے انداز میں ہمیشہ ہوتا رہا ہے لیکن اس دفعہ تحریک انصاف کے چیئرمین عمران خاں نے اس وقت شور مچا دیا جب سینٹ کے ایک امیدوار نے ٹکٹ کے بدلے، شوکت خانم ہسپتال کے لئے 15 کروڑ روپے امداد کی پیشکش کر دی۔ عمران خاں پہلے ہی 2013ء کے الیکشن میں مبینہ دھاندلی کے خلاف سیاسی تاریخ کا طویل ترین "دھرنا" دے کر تھک چکے ہیں اور اب تک سراپا احتجاج ہیں۔ لہٰذا وہ سینٹ کے الیکشن میں کرپشن کا دروازہ بند کرانا چاہتے ہیں لیکن روپے پیسے کے اس کھیل میں، مذہبی جماعتوں سے لے کر سیاسی جماعتوں تک، سبھی لتھڑے ہوئے ہیں۔ اس لئے کوئی بھی ان کے شور وغل پر دھیان دینے کو تیار نہیں، حتیٰ کہ تحریک انصاف کے اپنے ممبرانِ اسمبلی بھی اندرون خانہ سودا بازی میں مصروف ہیں۔

عمران خاں کے شور شرابے اور واویلے پر وزیراعظم نے فوراً تمام پارلیمانی جماعتوں کے رہنماؤں کا اجلاس طلب کیا تھا تاکہ آئین میں 22 ویں ترمیم کر کے سینٹ کے الیکشن میں خفیہ رائے شماری کی بجائے ہاتھ کھڑے کر کے ووٹ ڈالنے کا طریقہ اپنایا جائے تاکہ کوئی رکن اسمبلی اپنی پارٹی کے مینڈیٹ کی خلاف ورزی کا مرتکب نہ ہو سکے۔ اس ترمیم کے لئے عمران خاں نے پارلیمنٹ میں واپس آنے کا بھی عندیہ دے دیا تھا لیکن بسا آرزو کہ خاک شدہ کے مصداق، پارلیمانی لیڈروں نے کسی آئینی ترمیم سے صاف انکار کر دیا اور اس طرح عمران خاں اور وزیراعظم کے سینٹ الیکشن میں "گھوڑوں کی خرید وفروخت" پر بند باندھنے کی خوش فہمی کے غبارے سے ہوا نکال دی۔

جناب وزیراعظم تو اپنے ممبرانِ اسمبلی کو "نصیحتاں نوں کھاؤ، کرلو جو کرنا ہے" کہہ کر سعودی عرب کی شاہی دعوتیں اڑانے کے لئے حرمین شریفین کے نئے بادشاہ سلمان کے بلاوے پر ریاض چلے گئے ہیں۔ زرداری صاحب اپنی صبح کی حلیف اور شام کی حریف جماعت ایم کیو ایم سے معاملات طے کر کے اپنے چار ارکان بلا مقابلہ منتخب کرا کے سینٹ کی چیئرمین کی کرسی کا نشانہ لئے مطمئن بیٹھے ہیں اور مولانا فضل الرحمٰن مدظلہ العالی خیبر پختونخوا سے اپنے ایک اور بھائی کو سینٹ کا ممبر بنوانے کی تگ ودو میں مصروف ہیں۔ سودا بازی میں وہ ماہر ہیں اور روپے پیسے کی ان کے پاس کوئی کمی نہیں ہے۔

یہ پرچہ آپ کے ہاتھ میں آنے تک، سینٹ کے نئے ممبران کے چہرے آپ کے سامنے آ چکے ہوں گے۔ ہماری سیاسی جماعتوں کے دیوالیہ پن کی انتہا یہ ہے کہ پیپلز پارٹی اور ایم کیو ایم نے اپنے کچھ چہیتوں کو، جن کا تعلق پنجاب سے ہے، کراچی اور سندھ سے منتخب کرایا ہے کیونکہ پنجاب میں ان کے پاس ایک بھی ووٹ نہیں تھا۔ اسی طرح حکمران جماعت نے ایک سندھی کو وفاقی دارالحکومت سے سینٹ کا رکن بنوایا ہے۔ گویا نئے سینٹ میں چند پنجابی، سندھ کی نمائندگی کا حق ادا کریں گے اور سندھی وفاقی دارالحکومت کی۔ دوسرے لفظوں میں پیپلز پارٹی کو سندھ میں، ایم کیو ایم کو کراچی میں کوئی اہل امیدوار نہیں مل سکا۔ اس لئے انہیں امیدوار پنجاب سے "امپورٹ" کرنے پڑے اور نون لیگ کا دامن اسلام آباد کے کسی اہل امیدوار سے خالی تھا جسے بہ امر مجبوری امیدوار سندھ سے "درآمد" کرنا پڑا۔

آئینِ پاکستان کے تحت قومی اسمبلی میں چاروں صوبوں کی نمائندگی، آبادی کی بنیاد پر ہے۔ اس لحاظ سے پنجاب کی نشستیں سب سے زیادہ اور بلوچستان کی سب سے کم ہیں لیکن سینٹ میں ہر صوبے کی یکساں نمائندگی ہے اور 23، 23 سیٹیں ہیں۔ قومی و صوبائی اسمبلیوں کے ممبران براہِ راست عوام کے ووٹوں سے منتخب ہو کر اسمبلیوں میں پہنچتے ہیں۔ انہیں انتخابات کے دوران ہر امیر و غریب کے دروازے پر جا کر ووٹوں کی بھیک مانگنی پڑتی ہے۔ اگرچہ منتخب ہو کر عوام کے یہ نمائندے بھی وی وی آئی پی کا روپ دھار لیتے ہیں اور جن ووٹروں کی "بھیک" سے ایوان میں پہنچے ہوتے ہیں، اگلے الیکشن سے پہلے، ان سے ہاتھ ملانا بھی توہین سمجھنے لگتے ہیں لیکن انہیں پھر بھی کسی حد تک عوامی مشکلات، مسائل دشواریوں اور مصیبتوں کا احساس ہوتا ہے لیکن سینٹ (ایوان بالا) کے جو ممبران اپنی سیٹوں کی بولی لگا کر، کروڑوں، اربوں روپے خرچ کر کے، قوم کی گردن پر سوار ہوں گے، انہیں عوامی احساسات و مشکلات، قومی امنگوں و مفادات اور ملکی معاملات و زمینی حقائق کا کیا ادراک ہوگا؟ نئے "منتخب" سینیٹروں کی "مدت کرامات" چھ سال ہوگی۔ لہٰذا وہ بلا خوف و خطر آئندہ چھ سال اپنی "انوسٹ منٹ" منافع کے ساتھ وصول کرنے میں مصروف رہیں۔ یہ وصولی "اندر" سے ہو یا "باہر" سے، اس سے انہیں کوئی غرض نہیں۔

"قومی پارلیمنٹ، قومی اسمبلی، سینٹ اور صدر پر مشتمل ہے۔ پارلیمنٹ کو قوم کی مجموعی دانش کا ادارہ قرار دیا جاتا ہے۔ اس میں صاف ستھرے کردار کے حامل افراد ہی جانے چاہئیں۔ قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے لئے جیتنے کی پوزیشن رکھنے والے امیدوار کو ٹکٹ دینا ہمارے ہاں پارٹی سربراہوں کے شاہانہ مزاج کا حصہ بن چکا ہے۔ آئین کے آرٹیکل 62، 63 کو عملاً مفلوج کر دیا گیا ہے۔ اسی لئے قومی و صوبائی اسمبلیوں میں جعلی ڈگری ہولڈر، ٹیکس نادہندگان حتیٰ کہ قتل اور ڈکیتی کے ملزم بھی منتخب ہو جاتے ہیں۔ اگر پارٹی کے سربراہان کی نیت میں فتور نہ ہو تو سینٹ میں بھی محب وطن اور اچھے کردار کے لوگ آ سکتے ہیں۔

راقم الحروف پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے، پری پول دھاندلی کے بارے میں نشاندہی کرتا رہا ہے۔ فاٹا کے بعض ارکان اسمبلی سینٹ کے امیدواروں سے لاکھوں ڈالر کے عوض ملائشیا اور دبئی میں معاہدے کرتے رہے ہیں اور ان کی قیمت فی ووٹ پچاس کروڑ سے تجاوز کر چکی ہے کیونکہ فاٹا کے کوٹے سے سینیٹر بننے کے لئے تین ارکان کی حمایت درکار ہے۔ اسی طرح صوبہ خیبر پختونخوا میں 17 ارکان صوبائی اسمبلی کی حمایت سے سینیٹر بننا آسان ہے۔ لہٰذا یہاں پر فی ووٹ سات اور آٹھ کروڑ دینا پڑتے ہیں۔ گویا آدھی سے زیادہ سیٹیں "برائے فروخت" ہیں۔ جب ایک آدمی دس سے بیس کروڑ روپے دے کر سینٹ کا رکن بنتا ہے تو ظاہر ہے وہ قومی مفادات کو اہمیت نہیں دے گا۔ بین الاقوامی کھلاڑیوں کے ہاتھ "برائے فروخت" بنا رہے گا۔ اسی تناظر میں بعض سیاسی رہنماؤں نے ارب پتیوں کو سینیٹر کی نامزدگی کے لئے منتخب کیا ہے۔ تائید کنندہ نہ ملنے پر کئی آزاد امیدواروں کے کاغذات نامزدگی مسترد کر دیئے گئے۔ ان کا برملا کہنا ہے کہ "وہ جس بھی صوبائی اسمبلی کے ممبر کے پاس کاغذات نامزدگی کی تصدیق اور تائید کے لئے گئے اُس نے ایک کروڑ روپے کا مطالبہ کر دیا"۔ (سابق سیکرٹری الیکشن کمیشن، کنور دلشاد)

یہ تو گویا گھر کے بھیدی نے ہی لنکا ڈھا دی ہے۔

میاں محمد ابراہیم طاہر

خصوصی فیچر

عالمی سیاست کا بدلتا منظر نامہ

دنیا میں بالادستی کے لئے بڑی طاقتوں امریکہ، چین، روس کی دوڑ دھوپ
آئندہ کیا کیا گل کھلائے گی اور چھوٹے ممالک کس طرح سے ان ممالک
کی محاذ آرائی اور مفادات تلے کچلے جاتے رہیں گے۔ آئندہ آنے والی نسلیں
یہ تماشا جلد ہی دیکھ لیں گی لیکن عالمی بالادستی کے لئے محاذ آرائی یا جنگ
جس لاوے میں تبدیل ہونے والی ہے وہ لاوا پھٹنے ہی والا ہے۔

☆ افضل مظہر انجم
0305-4758284

اکیسویں صدی دوسری دہائی میں داخل ہو چکی ہے۔ دنیا پر اپنی بالادستی قائم رکھنے اور بڑھانے والی طاقتیں نئے حالات کے تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنی سٹریٹیجی میں تبدیلیاں لانے پر مجبور ہو چکی ہیں۔ ایک دوسرے کے بڑھتے قدم روکنے اور زیادہ سے زیادہ ممالک میں اپنا اثر و رسوخ بڑھانے کی پالیسی تیز تر ہو چکی ہے۔ دنیا کو لیڈ کرنے کی دوڑ میں امریکہ، چین، روس میں سبقت کس کو حاصل ہو گی، نیا ورلڈ آرڈر کس کا چلے گا، دنیا کی حکمرانی کرنے میں کس کو کامیابی حاصل ہو گی؟ دیکھئے اور انتظار کریں۔

چین کے بڑھتے قدم امریکی پیش بندیاں

دوسری جنگ عظیم کے بعد تا حال دنیا کی عظیم سپر پاور خصوصاً 86-1985ء کے بعد عرصہ 30 سال سے دنیا کی واحد سپر پاور امریکہ نے نئی ابھرنے والی سپر پاور چین کے بڑھتے قدم روکنے کے لئے بھی اسی طرح کے اقدامات کرنا شروع کر دیئے ہیں جو سپر پاور روس کے خلاف 36 سالہ سرد جنگ کے دوران کیا کرتا تھا۔ نائن الیون کے بعد 13 سال کا عرصہ گزر چکا ہے اور دہشت گردی کی آڑ میں اسلامیت کی لہر کچلنے کے ساتھ ہی امریکن گریٹ گیم کا پہلا مرحلہ اختتام پذیر ہو چکا ہے۔ یہ علیحدہ موضوع یا بحث ہے کہ اس میں کس کی ہار ہوئی اور کس کی جیت لیکن بہر حال امریکہ اپنے مقاصد حاصل کرنے میں کامیاب رہا۔ امریکن گریٹ گیم چند سال پہلے سے ہی افغانستان سے نکل کر مشرق وسطی میں داخل ہو چکی ہے۔ جہاں امریکہ اپنے ازلی مخالفین لیبیا کے کرنل قذافی، مصر کی اسلامی حکومت کے وزیراعظم مرسی کو ہٹانے کے بعد عرصہ دراز سے شام اور یمن کی حکومت کے پیچھے

پڑا ہوا ہے۔

چین کو آزاد ہوئے 66 سال کا طویل عرصہ گزر چکا ہے۔ ابھی تک کسی بھی سیاسی یا جنگی معاملات میں سپر پاور امریکہ کے آڑے آنے کی کوشش نہیں کی لیکن آج چین کے معاشی طور پر انتہائی مضبوط ہونے کے علاوہ سپر طاقت کے ہم پلہ فوجی طاقت بننے کی وجہ سے سٹریجک کے معاملات میں امریکہ کے ٹانگ اڑانے کا نوٹس لے رہا ہے۔ اپنا اثر و رسوخ مختلف ممالک سے بڑھا رہا ہے۔ فوجی اور ایٹمی معاہدے کر رہا ہے۔ امریکہ نے خطرے کی اس بو کو سونگھتے ہوئے چین کے بڑھتے قدم روکنے کے اقدامات عملی طور پر شروع کر دیئے ہیں۔ اس سلسلے میں امریکی صدر باراک اوبامہ نے سب سے پہلے بھارت کا دورہ کیا۔

امریکی صدر کا دورہ بھارت

دنیا میں چین کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کو روکنے اور روس کی بجائے دوسری سپر پاور کی جگہ لینے والے چین کے آگے بند باندھنے کی پہلی کوشش کے طور پر امریکی صدر باراک اوبامہ نے بھارت کا دورہ کیا جہاں آج انتہا پسند ہندو سیاسی جماعت بھارتیہ جنتا پارٹی (بی جے پی) کے نریندر مودی پردھان منتری کا منصب سنبھالے ہوئے ہیں یہ وہی نریندر مودی جن کے گجرات میں مسلم کش فسادات کے بعد امریکہ میں داخلے پر پابندی لگانا پڑی تھی۔

بڑی طاقتوں کے مفادات کا کرشمہ ہے کہ یہی نریندر مودی اب امریکہ کی آنکھ کا تارا بنا ہوا ہے اور امریکی صدر اس کی تعریفیں کرتے نہیں تھکتے۔ دوسری طرف ان خاص حالات میں صدر اوباما کے دورہ کے موقع پر ہندوستانی وزیراعظم بھی ان کی آمد کا اتنی بے چینی سے انتظار کرتے پائے گئے کہ جونہی صدر اوبامہ طیارے سے باہر نکلے مودی نہایت بے قراری سے ان سے اس طرح لپٹ گئے گویا صدیوں کے بچھڑے ساتھی ہوں۔ بھارت نے امریکی صدر کو 26 جنوری بھارت کے یوم جمہوریہ کے موقع پر پریڈ میں بھارتی فوجی و صنعتی ترقی کے مظاہرہ کے موقع پر مدعو کیا تھا۔

صدر اوبامہ پہلے امریکی صدر ہیں جو یوم جمہوریہ کی تقریب میں شریک ہوئے۔ اس موقع پر امریکہ نے بھارت سے 4 ارب ڈالر کے تعاون کے علاوہ ہتھیاروں کی فراہمی و اسلحہ سازی، تجارتی معاہدوں پر بھی دستخط کئے۔ اس موقع پر امریکی کمپنیوں نے بھارت میں ایٹمی پلانٹ لگانے کے بھی معاہدے کئے گئے جس پر پاکستان اور چین نے تحفظات کا اظہار بھی کیا۔ امریکی صدر اور بھارتی وزیراعظم نے عرصہ سات سال پرانے سول جوہری سودے کو بھی حتمی شکل دی۔ سول نیوکلیئر لائبلٹی ایکٹ کی سخت شقوں کی وجہ سے اس شعبہ میں تعاون عرصہ دراز سے تعطل کا شکار تھا۔

امریکی صدر کے تاریخی دورہ کے دوران ڈرون طیاروں اور ٹرانسپورٹ طیارے C-130 کے آلات کی مشترکہ تیاری و پیداوار پر بھی پیشرفت ہوئی۔ دو پائلٹ پروجیکٹس، بغیر پائلٹ ائر وہیکل (یواے وی یعنی ڈرون طیارہ) اور سی 130 ملٹری ٹرانسپورٹس طیارے کے نظام کی بھارت میں تیاری کو حتمی شکل دی گئی۔ یہ ڈرون طیارہ Raven - RQ-11 کہلاتا ہے۔ راوین دنیا میں استعمال ہونے والا کم زون ڈرون ہے۔ جو مینوئل اور آٹومیٹک سے استعمال کیا جا سکتا ہے اور ازبکستان میں بھی نگرانی کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے۔ جس کی امریکی حکومت دیگر ممالک کو فروخت کرنے کے انتظامات مشترکہ طور پر کئے جا رہے ہیں۔

دنیا کی سب سے بڑی جہاز بنانے والی کمپنی بوئنگ بھارت میں مینوفیکچرنگ بیس قائم کرنے کی خواہش رکھتی

ہے۔ منصوبہ کے مطابق نہ صرف بھارت کے لئے سامان تیار کیا جائے گا بلکہ اسے دیگر ممالک کو ایکسپورٹ بھی کیا جا سکے گا۔ بھارت جس کا نمبر ایوی ایشن مارکیٹ میں نواں ہے، آئندہ پانچ برسوں میں تیسری بڑی ایوی ایشن مارکیٹ بننے کی پوزیشن حاصل کر لے گا۔

اس دورہ کے دوران امریکہ نے بھارت کو اقوام متحدہ کی سکیورٹی کونسل کا مستقل رکن بنانے کی کوششوں کا اعادہ بھی کیا۔ اس وقت سکیورٹی کونسل کے پانچ مستقل ممبران چین، امریکہ، روس، برطانیہ اور فرانس ہیں اور چھ غیر مستقل ممبر ہوتے ہیں۔ سلامتی کونسل کے مستقل ممبران کو کسی بھی مسئلے یا معاملے کو ویٹو کرنے کا حق ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ مسلم دشمن چاروں ممالک کے علاوہ صرف چین ہی وہ واحد طاقت ہے جو مسلمان ممالک کے قریب تصور کیا جاتا ہے اور بھارت کو مستقل ممبر بنانے کا مقصد صرف اور صرف پاکستان کو نیچا دکھانا ہے۔ بہرحال صدر اوباما کا اس موقع پر اہم دفاعی ایٹمی اور تجارتی معاہدے کرنے سے یہ صاف ظاہر ہے کہ امریکہ اس خطہ میں بھارت کو ایک بالادست قوت بنانا چاہتا ہے اور یہ اقدام چین اور پاکستان مخالف قدم ہے۔

امریکی صدر جب بھی اس خطہ کے دورہ پر آئے وہ دونوں ممالک پاکستان اور بھارت میں جاتے رہے لیکن ایسا پہلی مرتبہ ہوا ہے کہ امریکی صدر اوباما نے پاکستان کو نظرانداز کرتے ہوئے صرف بھارت کا دورہ کیا حالانکہ یہاں ایک جمہوری حکومت اقتدار سنبھالے ہوئے ہے۔ جنرل مشرف کے دور میں امریکی صدر بل کلنٹن پاکستان بھی آئے تھے۔ ضرور وہ فوجی سربراہ جنرل مشرف سے نہ ملے لیکن بھارت کے ساتھ پاکستان کا دورہ بھی کیا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ اس مرتبہ امریکی صدر کا بھارتی دورہ بھارت امریکہ کا چین و پاکستان کے خلاف کھلا محاذ بنانے کا عندیہ ہے جو دورے کے بعد جاری کئے گئے مشترکہ اعلامیہ کہ امریکہ اور بھارت ہی مل کر دنیا کو محفوظ بنا سکتے ہیں، سے صاف ظاہر ہے۔ تبھی پاکستان کے وزیراعظم نواز شریف نے نئی دہلی میں ہائی کمشنر سے بات چیت کرتے ہوئے اس بات پر تحفظ کا اظہار کیا کہ طاقت کا توازن بگڑنے سے خطے کا امن خطرے میں پڑ جائے گا۔

جنرل راحیل کا دورہ چین

عین اسی وقت جبکہ امریکی صدر باراک اوباما بھارتی دورہ کے موقع پر دفاعی، ایٹمی اور تجارتی تعلقات بڑھانے کے علاوہ دنیا کو دہشت گردی سے محفوظ رکھنے کے لئے تعاون کے علاوہ کلیدی کردار ادا کرنے کے بلند بانگ دعوے کر رہے تھے پاکستانی فوج کے سربراہ جنرل راحیل شریف چین کے دورہ پر تھے۔ دورہ کے دوران انہوں نے چین کی سیاسی قیادت کے علاوہ فوجی قیادت سے بھی ملاقات کی۔ بیجنگ میں چین کی پیپلز کانفرنس کے چیئرمین یوزینگ شینگ، وزیر خارجہ وانگ ژی اور وائس چیئرمین سینٹرل کمیشن جنرل فین چانگ لانگ سے بھی ملاقات کی۔

یوزینگ شینگ اور وانگ ژی سے ملاقات کے دوران چین نے پاکستان کے ساتھ ہر حال میں کھڑے ہونے کا دوبارہ اعلان کیا اور ساتھ ہی اس بات کو بھی دہرایا کہ چین کے لئے پاکستان کا کوئی متبادل نہیں ہو سکتا اور دونوں کی منزل ایک ہی ہے۔ پاکستان کے خدشات کو انہوں نے چین کے خدشات قرار دیا ہے۔ اس موقع پر دورے کی دعوت دینے پر جنرل راحیل شریف نے چینی قیادت کا شکریہ ادا کیا۔ اس دورہ کے دوران آرمی چیف کے پیپلز لبریشن آرمی ہیڈکوارٹر کے دورہ کے دوران فوجی قیادت نے بھی پاکستان اور چین کے درمیان دفاعی تعاون کو مزید بڑھانے پر اتفاق کیا۔ ساتھ ہی انٹیلی جنس شیئرنگ اور دہشت گردی خاتمے کے لئے آخری حد تک

جانے کا اعادہ بھی کیا گیا۔

چینی عسکری قیادت نے ہر مشکل میں پاکستان کا ساتھ دینے کے دیرینہ عزم کو بھی دہرایا۔ جس طرح سے ایک سپر پاور خطے کے صرف ایک ملک کے ساتھ ہی دفاعی اور ایٹمی معاہدوں کو دنیا میں امن کی جانب پیش رفت قرار دے رہی تھی خطے کے دوسرے ممالک کو بھی حق حاصل تھا کہ ایسے معاہدے جو سپر پاور کے حمایت یافتہ کو مضبوط تر بنا کر خطے میں تھانیداری کا فریضہ سونپنے کے مترادف تھا۔ اپنے تحفظ اور طاقت کے توازن کو برقرار رکھنے کے لئے دوسری کسی طاقت سے ایسے معاہدے کر کے اپنے دفاع کا مکمل انتظام وانصرام کر سکے۔ پاکستان کے عظیم دوست چین نے عین اسی موقع پر دنیا کے سامنے ببانگ دہل پاکستان کے ساتھ ہر حال میں کھڑے رہنے کا اعلان کیا جبکہ سپر پاور امریکہ بھارت کی پیٹھ ٹھونک کر اس قسم کے اعلانات کر رہا تھا۔ بہر حال نائن الیون کے بعد امریکہ نے مکمل کر پینترا بدلنے کی پالیسی پر عملدرآمد کا آغاز کر دیا ہے۔

روس کا معاشی مقاطع

امریکہ یورپ بشمول سکینڈے نیون ممالک پر مشتمل نیٹو ممالک پر مشتمل فوج کو نائن الیون کے بعد دوبارہ فعال کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے۔ روس کے مطابق کہ یہ معاہدہ طے ہوا تھا کہ نیٹو کو مشرقی یورپ تک نہیں بڑھایا جائے گا لیکن 1999ء میں روس کے اثر سے آزاد ہونے والے مشرقی یورپ کے ممالک پولینڈ چیکیا اور ہنگری کو بھی نیٹو کا ممبر بنا لیا گیا۔ 2004ء میں دیگر مشرقی یورپی ممالک بلغاریہ، رومانیہ، ایسٹ نینڈ، سلووینیا اور سلواکیہ کو بھی نیٹو میں شامل کر لیا گیا۔ مشرقی یورپ کے ممالک کے علاوہ مسلمان ریاستوں تاجکستان، ازبکستان، کرغیزستان کے آزاد ریاستوں کی صورت اختیار کرنے کے بعد دوسری سپر پاور روس اس درجہ سے نیچے اتر چکی تھی اور امریکہ روس کو دوبارہ اس درجہ پر فائز ہونے سے روکنے کے لئے ہر حربہ استعمال کرنا چاہتا تھا۔ دوسری طرف سکڑنے والا روس اپنی توسیعت کے لئے ہر ملنے والے موقع کی تلاش میں رہتا تھا سو یہ موقع ہمسایہ ملک یوکرائن میں اپنے فوجی داخل کرنے سے اُسے مل چکا تھا۔ امریکہ نے روس کے بڑھتے قدم بھی وہیں پر روکنے کے لئے معاشی پابندیوں اور تیل کا ہتھیار استعمال کیا۔

امریکہ کا تیل ہتھیار کامیاب تجربہ

جس طرح سے 1970ء کی دہائی میں عربوں نے تیل کے ہتھیار کو استعمال کر کے امریکہ، یورپ کو حیرت زدہ کر کے اور معیشت کو مفلوج کر کے رکھ دیا تھا، اس مرتبہ امریکہ نے بھی اس تیل کے ہتھیار کو استعمال کرنے کا تجربہ کیا جس میں وہ کامیاب رہا۔ 1970ء کی دہائی میں تو عرب ممالک نے تیل کی قیمتیں بڑھانے کے لئے اس ہتھیار کو استعمال کیا تھا لیکن اس مرتبہ امریکہ نے تیل کی قیمتیں گرا کر یہ ہتھیار استعمال کیا۔ کئی ممالک سے تیل حاصل کرنے والا امریکہ ایک نئی گیس شیل کے استعمال کو استفادہ میں لا کر تیل سے چھٹکارا حاصل کر چکا ہے اور دنیا میں سب سے زیادہ تیل خریدنے والے ملک کو تیل کی اُس مطلوبہ مقدار میں ضرورت نہیں ہے۔ اس لئے اس کی قیمتیں گرا کر ایک تو عرب ممالک پر اقتصادی وار کیا گیا، دوسرے روس اور ایران کو بھی معاشی پھنکی دی گئی۔

عرب ممالک تو اپنی کم آبادی اور زیادہ وسائل کی وجہ سے یہ چھٹکارا برداشت کر گئے۔ ویسے بھی یہ امریکہ کے حلیف تصور ہوتے ہیں لیکن امریکہ کے حریف روس اور ایران یہ جھٹکا برداشت نہ کر سکے۔ روس کو تیل کی قیمتوں میں کمی سے 150 ارب ڈالر کا خطیر نقصان برداشت کرنا پڑ رہا ہے کیونکہ اس کی معیشت کا 45 فیصد

نحصار تیل پر ہے۔ یوکرائن جنگ کی وجہ سے نیٹو ممالک یعنی امریکہ یورپ نے روس کو یورپی یونین کی جانب سے معاشی پابندیاں عائد کر کے دوسرا زبردست جھٹکا دیا جس سے روس کو 100 ارب ڈالر سالانہ کا نقصان برداشت کرنا پڑ رہا ہے۔ آج کے دور میں کسی بھی ملک کی معیشت کو معاشی جھٹکوں کے ذریعے گولہ بارود استعمال کئے بغیر تباہ و برباد کر کے اسے نیچا دکھانے پر مجبور کیا جا سکتا ہے اور امریکہ نے ایسا کر کے بھی دکھا دیا۔ وینزویلا جیسا تیل پیدا کرنے والا ملک دیوالیہ ہو کر رہ گیا ہے لیکن غریب ممالک پاکستان، بنگلہ دیش، ہندوستان، تھائی لینڈ، وغیرہ کے عوام کو تیل کی قیمتیں کم ہونے سے فائدہ ہوا ہے۔

جاپان کو چین کے سامنے کھڑا کرنے کا منصوبہ

جاپان وہ ملک ہے جو دوسری جنگ عظیم میں جرمنی کا حلیف تھا۔ یورپ امریکہ نے لڑائی کے میدان میں شکست دینے میں ناکامی کے بعد دو ایٹم بم برسا کر اسے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کیا تھا۔ اس کے بعد امریکہ نے اس کو اپنے زیر اثر رکھا۔ صنعت و حرفت میں تو جاپان کو آگے کی طرف جانے دیا گیا لیکن اسلحہ کے میدان کی طرف نہیں آنے دیا گیا۔ چین اور جاپان ایسے ممالک ہیں جن کے درمیان کئی صدیوں سے مختلف تنازعات پر جنگیں ہوتی رہی ہیں۔ مشرقی چینی سمندر کے جزائر 1895ء سے پہلے چین کی ملکیت تھے لیکن اس کے بعد یہ جاپان کے قبضہ میں آ گئے۔ جنگ عظیم کے بعد ان جزائر کا انتظام امریکی حکومت کے زیر تحت آ گیا لیکن 1972ء میں امریکہ نے ایک معاہدے کے تحت دوبارہ اسے جاپان کے حوالے کر دیا۔ ان جزائر میں 1968ء کے دوران پتہ چلا کہ تیل کے وسیع ذخائر موجود ہیں ساتھ ہی تائیوان اور چین نے بھی ان جزائر کی ملکیت کا دعویٰ کر دیا۔

جاپان آج کل دوبارہ فوجی طاقت بننے کی طرف اپنا سفر شروع کر چکا ہے۔ فوجی طاقت بننے کے پس پردہ اسے امریکی حمایت حاصل ہے۔ ساتھ ہی جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک ویتنام، فلپائن، سنگاپور، ملائیشیا سے بھی اتحاد کی پیش رفت جاری ہے۔ دوسری طرف جاپان سٹریٹیجک پارٹنر کے طور پر آسٹریلیا اور بھارت کو ترجیح دے رہا ہے۔ ساتھ ہی تائیوان سے حالات بہتر بنا رہا ہے۔ جاپان کے بھارت کے ساتھ سپیشل سٹریٹیجک گلوبل پارٹنرشپ کا سلسلہ جاری ہے۔ جاپان کا سکیورٹی پیکٹ بھی صرف امریکا، بھارت اور آسٹریلیا کے ساتھ ہے۔ مستقبل میں جاپان کو بھی امریکہ چین کے سامنے لا کھڑا کرنے کے لئے استعمال کرے گا۔

افغانستان میں بڑی طاقتوں کی کشمکش

2001ء میں امریکہ ورلڈ ٹریڈ سینٹر نیو یارک کی تباہی کے بعد دہشت گردوں کا پیچھا کرنے کے بہانے افغانستان میں داخل ہوا۔ یہاں داخل ہوئے اسے چودہ سال کا طویل عرصہ گزر چکا ہے۔ اب اس کی 90 ہزار افواج کے انخلاء کا وقت ہے اور اس کی صرف 10 ہزار فوج خطہ میں مستقل طور پر موجود رہیں گی۔ اس کا مطلب ہے کہ خطے کی سٹریٹیجک اہمیت کی وجہ سے امریکہ اپنی غیر موجودگی میں دوسری طاقتوں کے یہاں اثر و رسوخ بڑھنے کی وجہ سے میدان خالی نہیں چھوڑنا چاہتا۔ چین کے علاوہ روس بھی طالبان سے رابطے میں ہے کیونکہ یہ ملک ان دونوں طاقتوں کی ہمسائیگی میں واقع ہے۔ امریکہ کے زیر تسلط شمالی اتحاد کے حامیوں پر مشتمل افغانی علاقہ میں امریکی رسل و رسائل کا جال بچھا چکے ہیں اور افغانستان کی تین لاکھ سے زائد فوج اور پولیس تیار کر چکے ہیں جو امریکی فوج کے جانے کے بعد اس علاقے کا کنٹرول سنبھالے گی۔ ایک طرف تو افغانستان میں

معتدل مزاج سربراہ عبداللہ کو بٹھایا گیا ہے دوسری طرف امریکہ کے علاوہ افغان حکمران بھی طالبان سے مسلسل رابطوں میں ہیں۔ نئی پیشرفت کے طور پر افغان طالبان چین کا بھی دورہ کر چکے ہیں۔ یہ دورہ پاکستان کو اعتماد میں لے کر کیا گیا تھا۔

دورہ چین کے دوران چینی حکام نے طالبان سے اپنے علاقوں میں کسی قسم کی سرگرمیاں نہ کرنے کی یقین دہانی حاصل کی۔ دوسری طرف چینی حکام نے بھی طالبان کو ہر ممکن امداد فراہم کرنے کی یقین دہانی کرائی۔ چین وہ ملک ہے جس نے افغانستان میں سب سے زیادہ سرمایہ کاری کی ہوئی ہے۔ امریکی فوج کے جانے کے بعد القاعدہ کے خطرے کے دوبارہ سر اٹھانے یا طالبان اور شمالی اتحاد کے اپنی بالادستی کے قیام کے لئے ہونے والی محاذ آرائی افغانستان کو دوبارہ خانہ جنگی کی طرف دھکیل سکتی ہے جس کے تدارک کے لئے بڑی طاقتیں اپنا اپنا اثر ورسوخ استعمال کر رہی ہیں تاکہ افغانستان میں خانہ جنگی ہونے سے بچایا سکے اور پورے خطہ کو بھی جس میں چار بڑی ایٹمی طاقتیں چین، روس، بھارت اور پاکستان شامل ہیں۔ ایک دوسرے سے الجھنے سے بچایا جا سکے۔ آنے والے وقت میں افغانستان میں کون سی طاقت اپنا اثر و رسوخ قائم رکھنے میں کامیاب ہوتی ہے اور افغانستان سے نکل کر مشرق وسطیٰ میں تو داخل ہو چکی ہے۔ جہاں مصر، شام، لبنان، لیبیا اور یمن میں مسلمان قوتیں ایک دوسرے سے برسرپیکار ہیں اور یہاں بھی امریکہ، روس اور چین کسی نہ کسی صورت مختلف گروپوں کی پیٹھ ٹھونکتے نظر آ رہے ہیں۔

انتہا پسند مسلم مذہبی عناصر اور اقتدار سے چمٹے حریص مسلمان حکمران بھی ناحق مسلمانوں کا خون بہانے سے بچنے کے لئے اپنے اپنے رویوں میں لچک پیدا کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ایران بھی کئی ممالک میں شیعہ کمیونٹی کی حمایت کرتا نظر آ رہا ہے۔ شیعہ سنی کشمکش مسلم امہ کو تباہی کی طرف لے کر جاتی نظر آ رہی ہے لیکن کوئی بھی مسلمان ملک اس تباہی کو روکنے کے لئے اپنا کردار ادا کرتا نظر نہیں آ رہا۔ بڑی طاقتوں کے مفادات اور پالیسیاں ایک طرف، مسلمان اپنے مفادات کے لئے غیروں کے ہاتھوں میں کھیل کر خود ہی ایک دوسرے کے گلے کاٹنے میں مصروف ہیں اور یہ سلسلہ رکنے کا نام نہیں لے رہا۔

میرا اپنا وژن یہ ہے کہ رہا ہے کہ پانچ چھ سال بعد نئی صدی کی دوسری دہائی کے اختتام پذیر ہونے سے پہلے ہی ایسے مراحل آئیں گے جب امریکہ کو طاقت کے ذریعے روکنے کی کوششیں زور پکڑ جائیں گی کیونکہ دنیا کے تیزی سے بدلتے ہوئے حالات، فوجی اور معاشی لحاظ سے اپنے آپ کو مزید مضبوط بنانے والے ممالک کے عزائم آج کے حالات سے مختلف ہوں گے اور ان عزائم کے حصول کی تکمیل کے لئے یہ ممالک بڑی سے بڑی طاقت سے ٹکرانے سے گریز نہیں کریں گے اور دنیا میں کسی ایک سپر پاور کے دندنانے کا سلسلہ زوال پذیری کی طرف مائل ہو سکتا ہے۔ جوں جوں دنیا میں ایٹمی طاقت کے حامل ممالک کا سلسلہ پھیلتا جا رہا ہے دنیا خطرات کے قریب تر ہوتی چلی جا رہی ہے۔ شمالی جنوبی کوریا کی محاذ آرائی، بھارت پاکستان کے تنازعات، عرب اسرائیل کی ازلی دشمنی اور سب سے بڑھ کر دنیا میں بالادستی کے لئے بڑی طاقتوں امریکہ، چین، روس کی دوڑ دھوپ آئندہ کیا کیا گل کھلائے گی اور چھوٹے ممالک کس طرح سے ان ممالک کی محاذ آرائی اور مفادات تلے کچلے جاتے رہیں گے۔ آئندہ آنے والی نسلیں یہ تماشا جلد ہی دیکھ لیں گی لیکن عالمی بالادستی کے لئے محاذ آرائی یا جنگ جس لاوے میں تبدیل ہونے والی ہے وہ لاوا پھٹنے ہی والا ہے۔

❋O❋

دہشت گردی اور اس کا سدِباب

برصغیر کے حکمرانوں نے فرنگیوں کی غلامی میں رہ کران کی چالیں اپنالیں اور حکومت کو خدمت کی بجائے عیش وعشرت کا ذریعہ بنالیا۔

☆ سید ریاض الحسن سکوارڈن لیڈر (ر)

دہشت گردی نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے۔ ہر کوئی دوسروں کو اس کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے اور خود کو بری الذمہ قرار دیتا ہے۔ دہشت گردی کی بنیاد خوش انتظامی کی کمی بلکہ فقدان ہے۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے مختلف صلاحیتیں عطا کی ہیں۔ ہر شخص کو اپنی استطاعت کے مطابق اپنی ذمہ داریوں کو کماحقہ ادا کرنا چاہئے اور اپنی حدود سے تجاوز سے گریز کرنا لازمی ہے۔ جہاں بھی کوئی شخص کوتاہی کرتا ہے وہاں ہی گڑبڑ شروع ہو جاتی ہے۔

مگر کوتاہئ ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری
جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے
(علامہ اقبالؒ)

برصغیر میں مسلمانوں نے صدیوں تک حکومت کی۔ اچھے اور کمزور ہر قسم کے حکمران آئے لیکن کامیاب وہی رہا جو باصلاحیت تھا۔ رعایا کے حقوق وفرائض کا تعین کرنا اور اس میں کسی قسم کی کوتاہی برداشت نہ کرنا ایک اچھے حکمران کا فرض ہے۔ رعایا کا کام قانون و اصول کے مطابق اطاعت وفرمانبرداری ہے۔ حکمرانی ایک بہت کٹھن اور محنت طلب کام ہے۔ ان حکمرانوں نے عزت حاصل کی جنہوں نے رعایا کی فلاح وبہبود کے لئے اپنے آرام کو حرام قرار دیا۔ اپنا دن کا چین اور رات کا سکون قربان کر کے ملک میں امن وامان قائم کیا۔ جونہی حکمران عیش وعشرت میں پڑ گئے اور انہوں نے اپنا بلند مقام کھو دیا۔ حکمران لاپرواہ ہوئے تو ملک میں طرح طرح کے فتنے برپا ہو گئے۔ اس طرح رعایا کا امن وامان غارت ہو گیا۔

دنیا میں فرنگیوں نے اندازِ حکمرانی بدل دیا۔ انہوں نے صلاحیت اور خدمت کی بجائے سازشوں کے ذریعے حکمرانی کا ڈول ڈالا۔ اب دنیا کے اکثر حصوں میں کامیاب حکمرانی کا راز جھوٹ، فریب، مکاری، دغابازی اور غداری میں مضمر ہے۔ انگلینڈ نے ایک معمولی حیثیت سے محض شاطرانہ چالوں کی بناء پر برطانیہ عظمیٰ کا مقام حاصل کیا اور پوری دنیا میں اپنی برتری کا ڈنکا بجایا۔ یہ عظیم الشان مقام اسے قلیل مدت تک ہی حاصل رہا اور باقی دنیا نے انہی کے شاطرانہ ہتھیاروں سے انہیں بے بس کر کے رکھ دیا۔

برصغیر کے حکمرانوں نے فرنگیوں کی غلامی میں رہ کر ان کی چالیں اپنالیں اور حکومت کو خدمت کی بجائے عیش

وعشرت کا ذریعہ بنا لیا۔ پاکستان کے حکمرانوں نے جمہوریت اور پارٹی بازی کا سبق برطانیہ سے حاصل کیا اور ملک وملت کی خدمت کی بجائے ذاتی اقتدار اور دولت کو مطمع نظر بنالیا۔ اگرچہ پاکستان اسلامی نظام کے نام پر حاصل کیا گیا لیکن یہاں کے حکمرانوں کو اسلامی تعلیمات کا علم ہی نہیں لہٰذا اسلام کا نام لے کر من مانی کرنا ان کا شیوہ رہا۔ اسلام کا علم رکھنے والے لوگوں نے جب دیکھا کہ غیر اسلامی نظریات کے حامل افراد ملک کے ساتھ کھلواڑ کر رہے ہیں تو اُن میں کچھ تشدد پسندوں نے زبردستی اسلامی قوانین نافذ کرنے کی کوشش شروع کر دی لیکن ان کی تعداد بالکل معمولی تھی اور چند خاص علاقوں تک محدود تھی۔

پورے پاکستان میں دہشت گردی کی فضا سیاستدانوں نے قائم کی۔ ہر وہ شخص جس کے پاس وافر دولت تھی اور اسے چند پیروکار میسر آ گئے اُس نے اپنی سیاسی پارٹی بنا لی۔ اس طرح اقتدار حاصل کرنے اور دولت بڑھانے کی راہ اپنا لی۔ اسے نعرہ بازی، جلسہ جلوس، جلاؤ گھیراؤ، تالابندی اور لانگ مارچ وغیرہ کے لئے بے روزگار اور مستقبل سے مایوس طلبہ میسر آ گئے۔ سول انتظامیہ اور فوج نے حالات کو کنٹرول کرنے کی کوشش کی اور کافی حد تک کامیابی بھی حاصل کی لیکن سیاستدانوں نے اُن کے ساتھ مل کر خود لوٹ مار کی اور انتظامیہ کو بھی بدنام کیا۔

ہر سیاستدان نے مختلف شعبوں میں اپنے غنڈے رکھے ہوئے ہیں اور ان کی مدد سے غنڈہ گردی اور دہشت زندگی میں ملوث رہتے ہیں۔ یہ عناصر ایک دوسرے کی نشاندہی بھی کرتے رہتے ہیں اور خود بھی غیر قانونی حرکات میں ملوث رہتے ہیں۔ اس سلسلے میں طالبان یا مذہبی انتہا پسندوں کا نام لے لیتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ طالبان وغیرہ بھی غیر قانونی کارروائیوں میں ملوث ہیں لیکن ان کا کام بڑا محدود ہے اور ان پہ آسانی سے قابو پایا جا سکتا ہے لیکن سیاستدانوں کی غنڈہ افواج پہ قابو پانا مشکل ہے۔

صدر ضیاء الحق کے دور میں جن عناصر نے پاکستانی جہاز اغوا کر کے کئی جیالوں کو بیرونِ ملک بھجوایا اُن کو طالبان یا مذہبی عناصر کی آشیرباد تو حاصل نہیں تھی۔ اسی طرح فوجی تنصیبات پر خودکش حملہ آور مذہبی ذہن کے حامل نہیں تھے کیونکہ ہماری افواج تو ہمیشہ مذہبی رجحان کی حامل رہی ہیں۔ افواج پاکستان میں تو کبھی بھی سیکولر خیالات کی حوصلہ افزائی نہیں کی گئی۔ البتہ فوج کی وجہ سے اکثر سیاستدان پریشانی اور محکومی کا شکار رہے ہیں۔ فوج کے بعض جرنیلوں نے چند سیاسی راہنماؤں کی حوصلہ افزائی کی۔ اگر کچھ سیکولر ذہن کے سیاستدانوں کا ابتدا ہی سے سر کچل دیا جاتا تو آج گھر گھر طوفانِ بدتمیزی برپا نہ ہوتا۔ عوامی حقوق، شخصی آزادی، حریتِ فکر اور انسانی مساوات کے نام پر جو کچھ پاکستان میں ہو رہا ہے یہ ملک وملت کو تباہی کی طرف لے جا رہا ہے۔ جس قوم کے اندر نظم وضبط ختم ہو جائے وہ ترقی کی منازل طے نہیں کر سکتی۔

حکومت نے دہشت گردی پہ قابو پانے کے لئے نیم دلی سے قومی ایکشن پلان بنایا ہے اور جلدی انصاف کے لئے فوجی عدالتیں قائم کی ہیں تو وکلاء نے ان کے خلاف محاذ آرائی شروع کر دی ہے۔ ایسی عدالتوں کو ختم کرنے کے لئے سول عدالتوں میں رٹ بازی کی ابتدا کر دی ہے۔ فوجی عدالتوں میں تو وکلاء کو من پسند فیصلے حاصل کرنے اور منصفوں پر حملے کرنے کے مواقع نہیں ملیں گے۔ جو وکیل ہمیش خاں جیسے بدعنوان افسروں سے کروڑوں روپے حاصل کرنے کے عادی ہوں ان کو ملٹری کورٹس تو وارے نہیں آتے۔ لہٰذا ان کا تڑپنا پھڑکنا بجا ہے لیکن کچھ تو ملک وملت کی عزت اور امن وامان کا بھی خیال کرنا چاہئے۔ اب جو لوگ ملٹری کورٹس پر اعتراضات

رہے ہیں ان پر بھی توہینِ عدالت لگا کر سرکاری مہمان خانوں میں بھیجنا چاہئے۔

بعض سیاسی جماعتوں نے بھی ان آئینی ترامیم پر تحفظات کا اظہار کیا ہے لیکن سیاسی پارٹیوں کا تو مشن ہی یہ ہے کہ ہر اچھی بات پر اعتراض کیا جائے تاکہ مخالف کو اس کا فائدہ نہ پہنچے۔ ہر غلط کام کی بنیاد سیاسی جماعتیں ہیں۔ صدر پروفیسر مشرف کے دور میں بعض سیاستدانوں کو برملا کہا گیا تھا کہ وہ بیرون ملک ہی قیام رکھیں کیونکہ اندرون ملک اُن کی جانوں کو خطرات لاحق تھے لیکن سیاستدان باہمی عداوتوں کے باوجود ایک میثاقِ جمہوریت پر اکٹھے ہو کر ملک پہ حملہ آور ہو گئے اور اقتدار کے لئے اپنی باریاں مقرر کر لیں اور ساتھ ہی ایک دوسرے کے خلاف ایسی بازاری زبان استعمال کرنا شروع کر دی کہ زنانِ بازاری بھی منہ چھپانے لگیں۔ اب جب ان کے اقتدار کو خطرہ لاحق ہوا تو پھر مل کر ایک دوسرے کی حمایت پہ اتر آئے۔

جب بھی سیاسی راہنماؤں کو ذرا امن نصیب ہوتا ہے تو ملکی وسائل کی لوٹ مار اور باہمی دشنام طرازی میں تیز گام ہو جاتے ہیں۔ کراچی میں بدامنی کے سلسلہ میں جب وفاقی حکومت نے صوبائی حکومت کو موردِ الزام ٹھہرایا تو لاہور میں بدمعاشی شروع ہو گئی۔ اسی طرح قبل ازیں جب ایک مذہبی رہنما نے حکومت کے لتے لئے تو سانحہ ماڈل ٹاؤن پیش آ گیا۔ اب ہر جگہ طالبان ہی تو بدمعاشوں کو نہیں اکسا رہے۔ سیاستدانوں کی بھی گوشمالی ضروری ہے۔ پنجاب میں خوشحالی کا تاثر ابھرا ہے تو یہاں افراتفری شروع ہو گئی ہے۔ جس پارٹی کا یہاں صفایا ہوا ہے اس کی خبر لینی ضروری ہے۔ صوبہ خیبر میں بھی ہارنے والوں پر نظر رکھنی چاہئے۔ دراصل سیاستدانوں کو کام تو کوئی ہوتا نہیں۔ مال و دولت سے تجوریاں بھر لیتے ہیں، ملک میں بے روزگاری کا کوئی حل نہیں کیا جاتا اور

بامقصد تعلیم کا بندوبست نہیں کیا جاتا اس لئے ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لئے وافر مادی اور افرادی وسائل کو دہشت گردی میں جھونک دیا جاتا ہے۔

دہشت گردی پر قابو پانے کے لئے کچھ عرصہ تک سیاستدانوں پر مکمل پابندی لگانا ضروری ہے۔ مرحوم پیر پگاڑا کے ارشاد کے مطابق یہ عرصہ کم از کم پچاس سال پر محیط ہونا چاہئے۔ ہمارے سیاستدان فرنگی نظام کا تسلسل ہیں۔ ہمارے آئین کے مطابق تمام قوانین کتاب وسنت کے مطابق ہونے ضروری ہیں۔ جبکہ حکمران قرآن وسنت سے مکمل آگاہی نہیں رکھتے۔ اسلامی قوانین کی ترویج کے لئے متعلق افراد کی اسلامی تعلیم و تربیت کا مناسب بندوبست ہونا چاہئے۔ اس مقصد کے لئے جامعہ ازہر اور مدینہ یونیورسٹی سے کورسز کرنا لازمی ہے کیونکہ ہمارے ہاں کے اسلامی مدارس فرقہ وارانہ بنیادوں پر استوار ہیں۔

پیشہ وارانہ سیاستدانوں کی حوصلہ شکنی کرنی چاہئے اور جو اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد مختلف شعبوں میں خدمات سرانجام دے رہے ہیں انہیں ہی اعلیٰ انتظامی عہدوں پر فائز کرنا چاہئے۔ ہر شخص کو مناسب روزگار اور انصاف ملنا ضروری ہے تاکہ بے روزگاری اور ظلم کے ستائے ہوئے لوگ غلط راہیں اختیار نہ کر سکیں۔ فی الحال فوجی عدالتوں کو وسیع اختیارات کے ساتھ پورے ملک میں نافذ کرنا چاہئے۔ بدعنوان سیاستدانوں کے مقدمات بھی ان عدالتوں میں ارسال کر کے ان کو عبرت کا نشان بنانا چاہئے۔ ان کے جیالوں متوالوں کے لئے مناسب روزگار کا بندوبست لازمی ہے تاکہ وہ عزت کی زندگی بسر کرنے کے عادی بن جائیں اور محنت کر کے رزق حاصل کرنے کو قابل فخر سمجھیں۔ اس طرح وہ غیر قانونی حرکات سے اجتناب کریں گے اور ملک امن و امان کا گہوارہ بن جائے گا۔

☐☐☐

انقلاب کی کامیابی کی ضمانت وہ سچے انقلابی ہوا کرتے ہیں
جن کا مقصد حصولِ اقتدار نہیں، حصولِ رضائے الٰہی ہو۔

فلسفۂ انقلاب

دوسرا حصہ ☆----------------------0300-9242724---------------- ڈاکٹر پروفیسر سلیم احمد شاہ

انقلابِ حقیقی

اصل انقلاب آزادی ہے، آزادی برائے فلاحِ عوام۔ وہ انقلاب جو عوام کو آزادی دلائے اور پھر عوام اپنی آزادی قائم رکھ سکیں۔ ایسا انقلاب اصل انقلاب آزادی کہلائے گا لیکن اگر صرف حکومت تبدیل ہو جائے تو ایسا انقلاب اصل انقلاب آزادی نہیں سمجھا جائے گا۔ ایسے انقلاب کو تبدیلی حکومت تو کہا جا سکتا ہے لیکن اصل انقلاب آزادی کا نام اس کو نہیں دیا جا سکتا۔ ہاں، اگر خرابی کی وجوہات دور ہو جائیں اور خراب نظام کو تبدیل کر کے فلاحی نظام قائم ہو جائے تو اصل انقلاب آزادی کہلائے گا۔ عوام مطمئن ہوں گے۔

فلاحی انقلاب

فلاحی انقلاب کے لئے ضروری ہے:

(1) عوام کو زندگی کی بنیادی ضروریات آسانی سے دستیاب ہوں۔

(2) عوام کو انصاف مہیا ہو۔

(3) عوام کو تحفظ حاصل ہو۔

(4) عوام کو بنیادی انسانی حقوق حاصل ہوں۔ بس اگر ان بنیادی انسانی حقوق کو مخصوص مذہبی بنیادوں پر عوام کے لئے مشروط کر دیا جائے گا تو ان بنیادی انسانی حقوق کی اصل روح ختم ہو جائے گی۔

بنیادی انسانی حقوق عوام کو ملنے کا امکان اس لئے نہیں کہ عوام انسانی حقوق کو اپنے مخصوص مذہبی نظریات سے جوڑ کر سوچنے کے عادی ہیں۔ مذہب کو انسانیت کے لئے نہیں بلکہ انسانیت کو مذہب کے لئے سمجھنے کے عادی ہیں۔ ایسی سوچ رکھنے والے عوام کبھی بھی انقلابِ حقیقی یا انقلاب آزادی کی منزل تک نہیں پہنچ سکتے۔

ابتدائی مراحل انقلاب

پہلے مرحلے میں انقلابی سوچ انقلابی جذبے میں تبدیل ہوتی ہے۔ دوسرے مرحلے میں انقلابی جذبہ ان چند لوگوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرتا ہے جو انقلابی

جذبے سے سرشار ہوتے ہیں۔ تیسرے مرحلے میں انقلابی جذبہ رکھنے والے چند افراد اپنے پلیٹ فارم پر اپنی آواز اس نظام کے خلاف اٹھاتے ہیں جس نظام اور سٹیٹس کے خلاف وہ جذبے والے انقلابی اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اسی مرحلے میں وہ احتجاج کرتے ہیں۔ حکمران اور ان کے وہ ساتھی جو سٹیٹس سے فائدہ مند ہو رہے ہیں آوازِ احتجاج کو دبانے کی کوشش کرتے ہیں۔ چوتھے مرحلے میں احتجاج تیز ہوتا ہے اور احتجاج کرنے والوں کے ساتھ مزید لوگ شامل ہو جاتے ہیں اور پھر انقلاب کا پہیہ اور تیزی سے گھومتا ہے۔

اس وقت دنیا میں کم وبیش 200 ممالک یو این او کے ممبر ہیں ہر ملک کی اپنی تاریخ ہے جو کہ منفرد ہے۔ گویا یہ کہ ہر ملک وقوم کے اپنے حالات ہوا کرتے ہیں۔ ہر ملک کی تاریخ میں مختلف ادوار میں انقلابات کے شواہد ملتے ہیں۔ ہر انقلاب ایک جیسا نہیں ہوا کرتا لیکن کچھ عوامل مشترک ہوتے ہیں۔ مثلاً حکمرانوں کی بے انصافی، نااہلی، بے حسی اور بدانتظامی ایسے اسباب ہیں جو ہر انقلاب کی بنیاد ہوا کرتے ہیں۔ کیونکہ ان اسباب کی وجہ سے عوام کی بے چینی کا پارہ دن بدن چڑھتا ہے۔ عوام کی بے چینی کی حرارت اس حد تک جا پہنچتی ہے کہ اس میں ابال آ جاتا ہے۔ لوگ بے چین ہو کر حکمرانوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ انتشار پھیلتا ہے۔ اگر تو انتشار کنٹرول ہو جائے تو ملک بہتری کی طرف جا سکتا ہے لیکن اگر انتشار ختم نہ ہو تو ملک پہلے سے بھی زیادہ برباد ہو جاتا ہے۔

ملک کو بربادی سے بچانے کے لئے باشعور لیڈرشپ لازم ہے۔ جیسے کہ چین کو ماؤزے تنگ اور چو این لائی جیسے لیڈر مل گئے۔ ماضی میں کیوبا کو چی گویرا اور فیڈل کاسترو نے آزاد دلائی۔ ویت نام کو ہوچی منہ نے آزادی کروایا، جاپان کو امریکہ کے شکنجے سے آزاد کروانے والا یوکیو مشیما تھا جس نے جاپانیوں کو قومی غیرت کا درس دیا۔ وہ ایک باغیرت سامورائے تھا اور غیرت اس کی طاقت تھی جس کے ذریعے اس نے جاپانیوں کو غیرت دلائی۔ فلپائن کو کوئی ایسا لیڈر نہ ملا اسی لئے فلپائن کی قومی غیرت نہیں جاگ سکی۔ تھائی لینڈ کو کوئی باغیرت نہیں ملا اس لئے اس قوم کی غیرت نہیں جاگی اور وہاں ایسے حالات ہیں کہ قوم کے اکثر افراد ایسے پیشے حصول روزگار کے لئے اختیار کرتے ہیں کہ جن پیشوں میں عزت وغیرت قائم نہیں رہتی۔ برما کے لوگ بھی اچھا لیڈر پیدا نہ کر سکے۔ اسی طرح دنیا میں جہاں جہاں بدحالی ہے وہاں بدحالی اور بے چینی کے اسباب کو دور کرنے کے لئے انقلاب لانے والے لیڈر نہیں پیدا ہوتے۔

غیرتِ ملّی

غیرتِ ملّی کامیاب انقلاب کی روح ہوا کرتی ہے۔ ملی غیرت رکھنے والی لیڈرشپ قوم کی غیرت کو بیدار کرتی ہے لیکن یہ تب ممکن ہے کہ قوم کے اندر ملی غیرت کا مادہ ہو۔ اگر کسی قوم کی کیمسٹری میں ملی غیرت اور عزت نفس قومی طور پر نہ موجود ہو تو وہاں کامیاب انقلاب نہیں آ سکتا۔ عارضی طور پر دیگچی میں دودھ کے ابال کی طرح انقلابی نعرے تو لگتے رہتے ہیں لیکن اصل اسباب عوام کی بے چینی کے دور نہیں ہوتے۔ لہٰذا انقلاب کی کامیابی کا راز صرف یہ نہیں کہ پرانا نظام اور سٹیٹس کو ختم ہو جائے بلکہ یہ لازم ہے کہ نیا متبادل مثبت ترقی دینے والا نظام آ جائے۔

تعمیری انقلاب

تعمیری سوچ اور تعمیری تدبیر، تعمیری حکمت عملی پلاننگ اور اسٹریٹجی کے ذریعے مرحلہ وار حالات کو بہتر بنایا

جائے۔ خراب نظام کی جگہ درست نظام لایا جائے، کرپشن کو پلاننگ اور سٹریٹجی کے ذریعہ دور کر دیا جائے تو انقلاب کامیاب ہوتا ہے۔ صرف حکومت بدلنے سے انقلاب نہیں آیا کرتا۔ حکومت بدلنا ضروری ہوتا ہے لیکن اس سے زیادہ ضروری بات یہ ہوا کرتی ہے کہ نئی حکومت مثبت تعمیری سوچ اور تدبیر کے ذریعے عوام کی حالت کو سنوارے۔ اس کے لئے عوام کے اندر ایک معاشرتی انقلاب بھی ضروری ہوتا ہے۔

حکومت بدلنا سیاسی انقلاب ہے لیکن سیاسی انقلاب نامکمل رہتا ہے اگر معاشرتی انقلاب نہ لایا جائے۔ چین میں ماؤزے تنگ اور چو این لائی نے معاشرتی انقلاب پر بہت زیادہ توجہ دی اسی لئے چین کا انقلاب کامیاب ہوا۔

بے چین عوام اور بدحال عوام تبدیلی کی خواہش کرتے ہیں لیکن یہ خواہش کامیاب انقلاب یا آزادی کا موجب تب ہوتی ہے اگر عوام کی بے چینی اور بدحالی کو دور کرنے کے لئے بہتر نظام لایا جائے۔ اگر کوئی قوم صرف تبدیلی اور انقلاب کی خواہش تو کرے لیکن مثبت اور بہتر متبادل نظام کو قبول کرنے کو تیار نہ ہو تو انقلاب فیل ہو کر انتشار میں بدل جاتا ہے۔

انتشار-بغاوت

تب یہ کہا جاتا ہے کہ انقلاب انتشار میں تبدیل ہو گیا ہے 1857ء میں مغلیہ حکومت کی ناکامی اور نااہلی نے جو حالات پیدا کئے وہ انتشار کے حالات تھے جس سے بغاوت ہوئی۔ اس انتشار اور بغاوت سے ایسٹ انڈیا کمپنی نے پورے برصغیر کو غلام بنا کر انگریز بادشاہت کے حوالے کر دیا۔ انگریز بادشاہت نے مغلیہ سلطنت کی چھوڑی ہوئی بدنظمی کو دور کر کے مینجمنٹ کے اصولوں پر حکمرانی کی اور عوام برصغیر کی انگریز حکومت سے مطمئن ہو گئے۔ اس لئے کہ انگریز نے مغلوں کی چھوڑی ہوئی بدنظمی کی جگہ متبادل نظام دیا اور عوام کی بے چینی دور ہو گئی لیکن جب انگریز کے نظام میں ظلم شامل ہو گیا تو پھر عوام بے چین ہو گئے۔ مثلاً 1919ء میں جلیاں والا باغ میں جنرل ڈائر کی فائرنگ سے مشرقی پنجاب میں سکھوں کا قتل و غارت ہوا تو بھگت سنگھ جیسے نوجوان انقلابی بن گئے۔ گاندھی کی لیڈرشپ نے اس انقلاب کے پہیے کو گھمانا شروع کیا۔ اس کی رفتار تیز تر کرنے کے لئے قائداعظم محمد علی جناح بھی میدان میں آ گئے۔ بہت سارے صاحب احساس لوگ اس انقلاب کی کامیابی کا موجب بنے۔ یہاں تک کہ 1947ء میں برصغیر آزاد ہو گیا اور دو ملک وجود میں آ گئے۔

اب بات کرتے ہیں انقلاب کے بعد کے حالات کی۔ اگر تو انقلاب کے بعد کوئی قوم خود کو منظم کر لے، آزادی کی نعمت کو سنبھالنے کی اہل ثابت کرے تو آزادی کی نعمت سے لطف اندوز ہو گی۔ ورنہ دوبارہ بے چینی اور بدنظمی قوم کے اندر آ جائے گی جیسا کہ شمال مغربی برصغیر اور شمال مشرقی برصغیر کے علاقوں میں بسنے والے لوگوں کے ساتھ ہوا۔ 1971ء میں شمال مشرقی برصغیر کے لوگوں نے اپنے لئے بنگلہ دیش بنا لیا اور ان کی بے چینی دور ہو گئی لیکن 1971ء کے بعد شمال مغربی برصغیر کے لوگ آج تک بے چینی سے نجات حاصل نہیں کر سکے اور آزادی کی نعمت سے لطف اندوز نہیں ہو سکے۔ اس علاقے کے لوگوں کی کیمسٹری ایسی ہے کہ اسے سمجھنا آسان نہیں۔ اگر کوئی لیڈر آج کے حالات کے مطابق اس خطے کے بے چین لوگوں کی کیمسٹری کو سمجھ لے تو انقلاب حقیقی سے یہاں کے لوگوں کو فیضیاب کروا سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ لیڈرشپ ایسی ہو کہ یہاں کے لوگوں کو انقلاب حقیقی سے روشناس کروا دے اور لوگ اس لیڈر کی قیادت میں متحد ہو جائیں۔ اس اتحاد کی بنیاد انسانی حقوق پر رکھنے

ں کوشش کرنے والے لیڈر کو اکثریت قبول نہیں کرے گی اس لئے کہ عوام کا مذہبی جوش و جذبہ یہ چاہے گا کہ انسانی حقوق کی بات نہ کی جائے بلکہ مذہبی حقوق کی بات کی جائے۔

برصغیر کے شمال مغربی خطے کے لوگوں کا مزاج ایسا ہے کہ وہ اپنی مرضی کے خلاف کوئی بات نہ تو سننا گوارا کرتے ہیں اور نہ ہی کسی کو اس قابل سمجھتے ہیں کہ ان کی قیادت کر سکے۔ تو ان حالات میں اس خطے کے لوگوں کو موجودہ حالات سے نکالنے والا لیڈر کہاں سے آئے گا؟ جب کسی قوم کے افراد ایسے ہوں کہ ہر کوئی یہ سمجھے کہ میں بڑا ہوں، میں بڑا ہوں تو اب کون ہوگا جو ان لوگوں کو متحد کرنے کی کوشش میں کامیاب ہوگا؟ خود کو سب سے بہتر سمجھنے والا انسان کوئی قیادت دل سے قبول نہیں کرتا۔ اس خطے میں کروڑوں لوگ اسی مزاج کے حامل ہیں۔+ ہر کوئی خود کو دوسرے سے بہتر سمجھتا ہے۔ ان کروڑوں لوگوں کو کون متحد کرے گا؟

جس قوم کے افراد خود تنظیمی، ضبط نفس، صبر و تحمل سے محروم ہوں، ایسی قوم انقلاب کی اصل منزل یعنی حقیقی انقلابِ آزادی سے محروم رہ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ 1947ء میں ملنے والی آزادی کی وجہ سے آبادی کی تقسیم ہوئی تو فسادات پھیلے اور آزادی کے دنوں کو فسادات کا نام ملا۔ یعنی وہ دن جب آبادی مشرقی پنجاب اور مغربی پنجاب کے علاقوں سے ہجرت کرنے لگی۔ ان آزادی کے دنوں کو ہجرت کا نام بھی دیا گیا اور ہجرت کرنے والوں کو مہاجر کہا جانے لگا نہ کہ آزادی کی نعمت حاصل کرنے والے لوگ۔ مہاجر خود کو آزاد نہ سمجھ سکے بلکہ مہاجر خود کو آج بھی مہاجر سمجھتے رہیں۔ اسی طرح سے ان کی بے چینی آزادی ملنے کے بعد کم نہ ہوئی۔ جو کہ آج تک قائم ہے۔ ان حالات میں جب کوئی قوم آزاد ہوتی ہے تو آزادی کی اصل نعمتوں سے محروم رہتی ہے۔ آزادی کی اصل نعمت تو اطمینان اور خوشی کا ماحول ہے۔ یہ ماحول متاثرہ علاقوں میں نسل در نسل قائم رہتا ہے۔ پھر معاشرے میں طبقاتی نفرت اور دوریاں بڑھنے لگتی ہیں ایک طبقہ دوسرے طبقے کا استحصال کرتا ہے پھر معاشرے کی خصوصیت یہ ہو جاتی ہے کہ چھینا جھپٹی اور استحصال پھیلتا ہے انارکی پھیلتی ہے۔ باہمی اخوت اور تعاون کا ماحول پیدا نہیں ہوتا۔ اس علاقے میں جس کا ذکر ہو رہا ہے بظاہر ایک قوم رہتی ہے۔ لیکن اس قوم کے مختلف ٹکڑے ہیں۔ مختلف ٹکڑوں میں بٹی ہوئی قوم کے لئے ایک ایسی قیادت کی ضرورت ہے جو ان ٹکڑوں کو باہمی متحد اور منظم کر دے۔ اگر ایسا ہو گیا تو انقلاب حقیقی آ جائے گا۔ اگر ایسا نہ ہوا تو عرب سپرنگ والے حالات کو لوگ انقلاب کا نام دیں گے لیکن اصلی تبدیلی جو کہ مثبت نتائج ظاہر کرے اس سے محروم رہ جائیں گے۔

فلسفہ انقلاب کی افادیت

فلسفہ انقلاب کو سمجھنے کے بعد اس سے فائدہ اٹھانا قوم کے نصیب کی بات ہے۔ فلسفہ انقلاب کو سمجھ کر اس کے تمام مراحل سے گزرنے کے بعد تعمیری سوچ پیدا کرنی ضروری ہے۔ قوم کے اندر خود اپنی حالت سنوارنے کے لئے مسلسل کوشش اور جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے۔ غیر ممالک سے قرض لے کر انقلاب حقیقی کی منزل تک قوم نہیں پہنچ سکتی۔ خود انحصاری اور جذبہ تعمیر کو قوتِ عمل میں ڈھالنا ہوگا تاکہ قوم کا مقدر بدل جائے۔

کسی علاقے میں آباد اقوام کے حال کو سمجھنے کے لئے اُن اقوام کے ماضی کے حالات آثار قدیمہ کی روشنی میں سمجھنے ضروری ہیں۔ ہمارے علاقے میں قدیم زمانوں میں جو تہذیبیں آباد رہیں...... ہڑپہ، موہنجوداڑو، بلوچستان، ٹیکسلا اور گندھارا کی تہذیبیں تھیں ...... یہ ساری تہذیبیں مٹ گئیں۔

قرآن کے مطابق قدیم تہذیبوں کے مٹنے کی وجہ ان تہذیبوں کے بسنے والے لوگوں کی اخلاقی برائیاں تھیں مثلاً بے انصافی، کم تولنا اور دیگر غیر فطری افعال وغیرہ۔ گویا کہ یہ قانونِ قدرت ہے کہ جس قوم کی اخلاقی حالت بگڑ جاتی ہے وہ کسی نہ کسی طرح سے برباد ہو جاتی ہے۔ قانونِ قدرتِ الٰہی یہی ہے۔ اس کے برعکس جو قومیں اخلاقی طور پر آج کے لحاظ سے اچھی ہوتی ہیں وہ زمین پر قائم رہتی ہیں۔ جو قومیں نفع رساں ہوتی ہیں وہ زمین پر مستحکم کر دی جاتی ہیں۔ قانونِ قدرت کے مطابق شکرگزار اقوام کو نعمتیں زیادہ ملتی ہیں اور ناشکری کرنے پر عذاب شدید ملتا ہے۔ اس قانون میں یہ نہیں کہ قوم کا مذہب کیا ہے۔ ہماری قوم نے آزادی کی نعمت کی شکرگزاری نہیں کی۔ ہمارے خطے کے لوگوں کی نفسیات میں مذہب سے محبت تو بہت زیادہ موجود ہے۔ یہ اچھی بات ہے۔ مذہبی تعلیمات کا بیان بھی بہت عقیدت سے کرتے ہیں۔ یہ بھی اچھی بات ہے۔ مذہبی شخصیات سے عشق اور جنون کی حد تک اظہارِ عقیدت کرتے ہیں اور مذہبی اختلاف کی صورت میں مرنے مارنے پر تیار رہتے ہیں لیکن مذہبی رواداری جو کسی قوم کو متحد کر سکتی ہے اس کا تصور مفقود ہے۔ مذہب کی تعلیمات رواداری، صلح جوئی پر غور کرنا پسند نہیں کرتے۔

کاش جس قدر ہمارے خطے کے لوگ مذہب سے محبت رکھتے ہیں اسی قدر شوق سے ان تعلیمات پر عمل بھی کریں سارا زور اظہارِ عقیدت پر رکھتے ہیں لیکن مذہبی تعلیمات پر عمل کر کے زمین پر مستحکم نہیں ہوتے۔ جھوٹ اور کرپشن اور برائیاں اختیار کرتے ہیں جو کہ مذہب کے خلاف ہے۔ ہمارا مذہب یہ کہتا ہے کہ دولت اکٹھی نہ کرو اور سرمایہ کو روک نہ رکھو بلکہ استعمال میں لاؤ لیکن ہو کیا رہا ہے؟ جو ہو رہا ہے وہ مذہبی تعلیمات کے خلاف ہو رہا ہے۔ دولت مند طبقہ اپنی دولت کو بڑھاتا ہے اور غیر
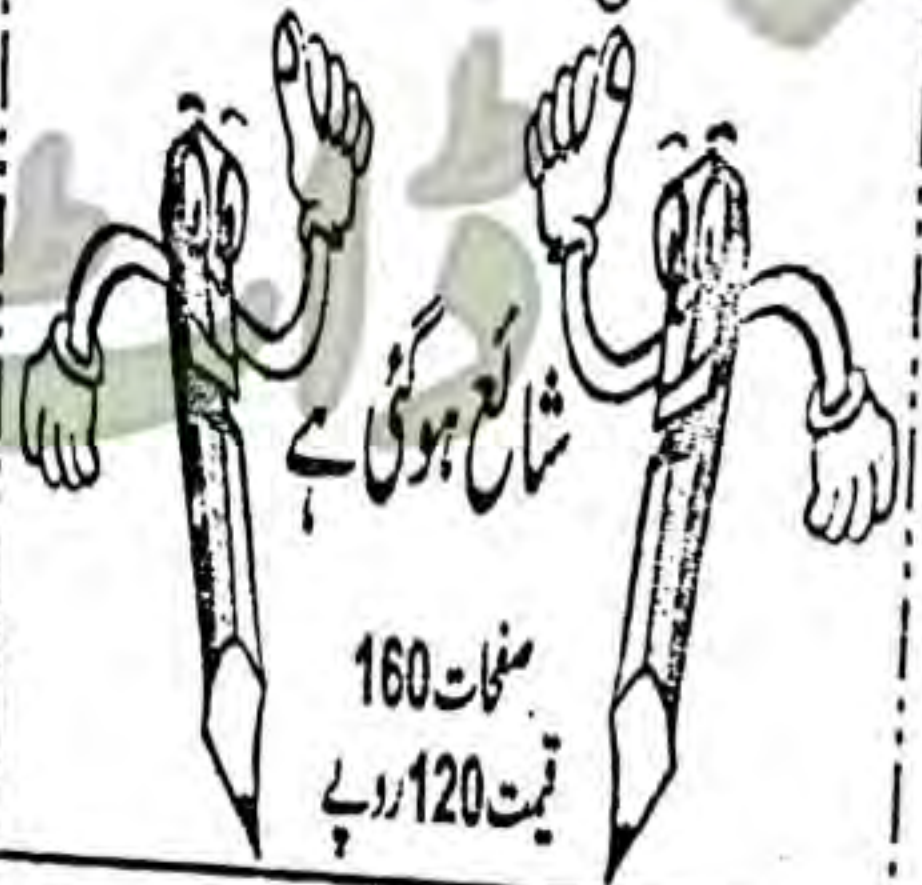
ممالک میں جمع کرواتا ہے۔

ہمارے لوگ خود کو مذہب کا عاشق کہلاتے ہیں لیکن مذہب کی تعلیمات کی اصل روح سے دور ہیں۔ سادگی اختیار نہیں کرتے بلکہ عیش و عشرت کے دلدادہ ہیں۔ ان لوگوں کا آپس میں مقابلہ اس بات پر ہے کہ کس کے پاس زیادہ بینک بیلنس غیر ممالک میں ہے۔ بلند ترین عمارات کی تعمیرات کا شوق رکھتے ہیں اور سارے فخر ان لوگوں کے دولت سے متعلق ہیں۔ اب کوئی اس خطے کے لوگوں سے کیا امید رکھے کہ یہ اپنے آپ کو تبدیل کر لیں گے۔ ہاں کچھ لوگ انقلاب کے اور تبدیلی کے خواہش مند ہیں انہوں نے تبدیلی اور انقلاب کی خواہش کا اظہار کیا ہے اور کر رہے ہیں۔ انقلابی نعرے لگ رہے ہیں۔ انقلاب کی گاڑی کے پہیے گھوم رہے ہیں۔ گاڑی آگے بڑھنے کے امکانات پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

انقلابی نعرے

انقلابی نعروں سے عوام کی خواہش انقلاب کا اظہار ہوتا ہے۔ انقلاب کے لئے انقلابی نعروں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن انقلاب تب آتا ہے جب ان نعروں کے پیچھے چھپے ہوئے جذبات و احساسات، انقلاب کے لئے عملی اقدامات پر عوام کو نہیں اکساتے، اگر صرف بات نعروں کے شور تک ہی رہے تو عارضی طور پر تو لوگ خوش ہو جاتے ہیں کہ انقلاب آ رہا ہے یا آنے والا ہے لیکن خواب اس وقت تک خواب ہی رہتے ہیں جب تک خواب کو عملی شکل نہ دی جائے۔ عملی قدامات باقاعدہ پلاننگ اور سٹریٹجی کے ذریعے اختیار کئے جائیں تو انقلاب اپنی منزل تک پہنچتا ہے۔ اگر گاڑی کے پہیے ریت میں گھومتے رہیں تو گاڑی آگے نہیں بڑھتی، ایک ہی جگہ اس کے پہیے گھومتے رہتے ہیں۔

آزادی حاصل کرنے کے بعد ہماری قوم نے اپنی تعمیری ترقی نہیں کی جس طرح چینی قوم نے کی۔ ہمارے ملک کی پارلیمنٹ کی بلڈنگ بہت عمدہ اور شاندار ہے۔ ممکن ہے کہ تمام دنیا کے ممالک کی پارلیمنٹس کی عمارات کا مقابلہ کریں تو ہمارے ملک کی پارلیمنٹ کی عمارت کو شان و شوکت کے لحاظ سے اوّل قرار دیا جائے۔ اس کی سجاوٹ اندرونی قابل دید ہے لیکن اس شاندار عمارات کے اندر جو قوانین بنے اور جو ترامیم کی گئیں۔ ان قوانین اور ترامیم کے مقاصد پر غور کریں اور سوچیں کہ قوم ملک اور سلطنت کی بھلائی کس قدر ہوئی؟ یہ بات سوچنے کی اور سمجھنے کی ہے۔ قوم اس طرف آنے کو تیار نہیں اور اگر قوم کو اس طرف توجہ دلانے کے لئے اشارہ بھی کیا جائے تو قوم بُرا مان جائے گی۔ سارے کام چھوڑ کر اس شخص کی دشمن ہو جائے گی جو تنقید کرے اور توجہ دلائے گا۔ اسی وجہ سے کہ جس انقلاب کی خواہش کا اظہار نعروں کے ذریعے ہو رہا ہے۔ اس خواہش کو عملی شکل دینے کے لئے جس قوتِ عمل کی ضرورت ہے وہ قوت عمل ظاہر نہیں ہوتی نظر آتی۔ نظریاتی طور پر کوئی کام ناممکن نہیں ہوتا لیکن عملی طور پر کسی کام کے ہونے کے امکانات تب نظر آتے ہیں جب عملی طور پر قوم خود کو اس طرح بیدار کرے جیسے چینی قوم نے خود کو بیدار کیا تھا۔

فلسفہ انقلاب کے موضوع پر میری رائے قوم کو پسند آئے یا نہ آئے میں نے اپنے ذاتی نظریات کا اظہار کر دیا ہے۔ مجھے علم ہے میرا فلسفہ قوم کے مزاج کے مطابق نہیں ہے۔ اس کے باوجود میں نے جو لکھنا تھا لکھ دیا۔ فلسفہ انسان کو سوچنے کی عادت ڈالتا ہے۔ ہماری قوم کو ناپسند کرتی ہے۔ اس بات کا اندازہ مجھے اس وقت ہو گیا تھا جب میں نے 1987ء میں فلسفہ انقلاب پر کتاب لکھی تھی اسے ناپسند مزاحمتی ادب کا حصہ قرار دے دیا گیا تھا۔

(اگلے ماہ آخری حصہ پیش کیا جائے گا)

بانجھ

''فضل دین میں اپنے الفاظ کی پکڑ سے ڈرتا ہوں
پتر میں کوئی عالم نہیں ایک سیدھا سادہ بندہ ہوں اور اپنے
عمل اور کردار کو اتنا ہی سادہ رکھنا چاہتا ہوں کہ میری پکڑ نہ ہو''

☆ رحمی شاہد

اللہ اکبر ...... اللہ اکبر اللہ اکبر۔ اشہد ان لا الہ الا اللہ ...... اشہد ان لا الہ الا اللہ۔ موذن کی آواز بھولے بھٹکوں اور دنیا کی خوشیوں اور غموں میں مگن مخلوق کو خدا کی جانب بلانے میں مصروف تھی۔ یہ تو فقط شانِ الٰہی کا وطیرہ ہے کہ وہ اپنی جانب اور فلاح کی جانب بلائے چلی جاتی ہے اور مخلوق اپنی فلاح کے راستے کو کسی دوسری راہ میں تلاشتے ہی رہ جاتی ہے۔

حسبِ سابق آج بھی مولوی فضل دین کے گھر کے واحد صحن میں علم و ادب کی محفل جمی تھی اور اب تو یہ معمول کی بات بن چکی تھی۔ مولوی فضل دین محلے کی سب سے زیادہ علمی شخصیت بن چکے تھے اور ادبی ہی نہیں بلکہ اب تو لوگ ان سے اپنے مسائل کا حل بھی دریافت کرنے لگے تھے۔

فضل دین اپنے علم اور اپنی اہمیت کی حدود سے بخوبی واقف ہو چکے تھے اور یہی واقفیت نہ صرف ان کے محلے بلکہ دوسری جگہوں تک بھی ہنر بن کر پھیل رہی تھی۔ یوں جیسے باہر سے آنے والی پاؤں کی مٹی پورے گھر میں نشان بناتی چلی جائے اور انسان کو پتہ بھی نہ چلے کہ یہ کتنی

اور کہاں کی ہے؟ ان کے گھر کے اس چھوٹے سے دلان میں ہر روز ایک بڑی علمی اور ادبی مجلس منعقد ہوا کرتی تھی۔ فضل دین بولتے اور سننے والے سر دھنتے نہ تھکتے۔

فضل دین کی بیوی اور بیٹیاں ساتھ والے واحد کمرے میں اپنے 'سربراہ اعلیٰ' کے زریں خیالات سے استفادہ کرتیں اور ان کے ادبی حلقے کو وسیع سے وسیع تر ہوتا دیکھتیں۔ بیوی تو انتہائی سادہ تھی جیسا فضل دین کہتے وہ ویسا ہی کرتی۔ اتنا کہنا رب کا مان لیتی تو آج وہ بھی کسی 'مسند خاص' پر براجمان ہوتی۔ خیر ایک مسند خاص پر تھی تو وہ آج بھی ایک فرمانبردار بیوی کی مسند خاص پر۔ دونوں بیٹیاں اپنی ماں سے تھوڑی مختلف تھیں۔ زمانے کا اثر ان کے ذہن پر اثر انداز ہوا تو سوچ کی وسعتوں نے علم کی آگاہی کا شعور لے کر ایک نئی اڑان بھری۔ اپنے باپ کی باتوں میں انہیں وہ چاشنی نہ لگتی جو ان کے چاہنے اور سننے والوں کو محسوس ہوتی تھی۔ ایسا کیوں تھا؟ اس کا جواب تو انہی کے پاس تھا یا پھر اُن کے پاس جن کو احساس کی انتہائی حد چھو کر گزرتی ہے اور بہت کچھ سمجھا جاتی ہے۔

آج صحن میں ایک نئی بحث جاری تھی۔ علم اور عمل کی بحث...... ایسی بحث جس پہ اُس دنیا اور اُس دنیا میں ربط کا تسلسل تھا۔ مولوی صاحب کی آواز گونجی۔

''ہاں تو صاحبو! علم عالم کی معراج ہے جاہلوں اور کم عقلوں کی دہلیز سے کوسوں دور۔ اب اگر علم کو سمجھنا ہے تو پہلے عالم کو سمجھو اس کی پیروی کرو اور عالم کو سمجھ کر علم کی معراج کو جانو''۔ بات ختم کرتے ہوئے انہوں نے مجمعے کی طرف توصیفی نگاہوں سے دیکھا۔

''واہ، واہ! مولوی صاحب کیا کہنے''۔ سننے والوں نے یک زبان کہا۔ وہ پھر گویا ہوئے۔

''جاہلوں کے در کا کھانا نری مٹی اور عالموں کے گھر کی مٹی نری شفا ہی شفا''۔ سب سننے والے بے شک بے شک کہنے لگے۔

اشہدان محمد رسول اللہ...... اشہدان محمد رسول اللہ

مؤذن کا خدا کی طرف بلاوے کا سلسلہ جاری تھا۔

آج صبح سے دوپہر ہونے کو آئی چھٹی والے دن کی یہ افادیت رہا کرتی کہ وقت کو ضرورت کی زنجیر نہ باندھنی پڑتی تھی۔

فضل دین کے علم کی وسعت کے موتی پرونے کا سب سے اچھا دن یہی ہوا کرتا تھا۔

''میرے بھائیو! علم کے معراج کی حقیقت کو سمجھنا اور جاننا عالم کے وسعتِ علم کی دلیل کو سمجھنا ہے۔ یہ دلیل وہ اپنی وسعتِ نظر اور وسعتِ عمل سے بتلاتا اور ظاہر کرتا ہے۔ اب اگر اس بات کو میں یوں کہوں کہ پانی کا گھڑا ٹھنڈے پانی سے بھرا ہو اور گرمی کی شدت سے نڈھال کسی پیاسے کی پیاس بجھانے کے کام نہ آئے تو اس بھرے ہوئے گھڑے کی اوقات اور افادیت کچھ باقی نہیں رہ جاتی''۔

سب دم بخود مولوی صاحب کی اس دلیل کو تاثیر کی بلندیوں پر محسوس کر رہے تھے۔ مجلس میں صرف سانسوں کی آواز تھی اور یہ آواز فضل دین کے لفظوں کے زیر و بم سے ٹکرا کر عجیب سا سحر پھیلائے ہوئے تھی۔ اندر مولوی صاحب کی بیٹیاں اپنی ٹیوشن کلاس میں جانے کو بے تاب تھیں اور ان کی بیوی اسی وقت کو غنیمت جانتے ہوئے خواب خرگوش کی لذت سے آگاہی میں مشغول تھی۔ تہمینہ اور فاطمہ اپنے ''عالم و فاضل'' ابا جی کے علم کی حدود کے اختتام کی منتظر تھیں اور نماز کا وقت بھی تو تھا اور وضو کے لئے باہر ہی جانا تھا۔

حیّ علی الصلوٰۃ...... حیّ علی الصلوٰۃ

حیّ علی الفلاح...... حیّ علی الفلاح

اللہ اکبر...... اللہ اکبر...... لا الہ الا اللہ!

تیری نماز کے بلاوے کا عمل مکمل ہوا۔ فلاح کے راستے کی طرف دن میں پانچ پانچ بار بلائے جاتے رہ بھی

جب چند لوگ ہی توفیق ہدایت سے استفادہ کریں تو اس میں اس راستے کا کوئی قصور نہیں ہوا کرتا۔ منزل بے مراد نہیں ہوا کرتی بلکہ مسافر ہی بے مراد ہوتے ہیں جو اپنی مرادوں کی جھولی کسی انجان بے سمت راستے کی گرد سے بھرتے رہتے ہیں اور گمان کامل کرتے ہیں کہ وہ اپنی جھولی اور اس کے دامن کو انمول خزانے سے بھر رہے ہیں لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ وہ راستہ بے مہر، بے وقعت ہوتا ہے وہ اس راستے کی طرف حرص و ہوس اور دنیاوی طلب کی پٹی باندھے ایک دائرے کی صورت چکر لگاتے چلے جاتے ہیں اور بالآخر بے عمل اور خالی ہاتھ رہ جاتے ہیں۔ آواز پھر بلند ہوئی۔

"ہاں تو میرے دوستو، ساتھیو اور بزرگو! اگر علم کی اصل حقیقت کو جاننا ہے تو عمل کی حقیقت کو سمجھنا ہوگا ورنہ اس دنیا میں آنے کا مقصد اور اس دنیا سے جانے کا مقصد کبھی ایک نہیں ہو سکیں گے کوشش کریں کہ عمل کی حقیقت کو سمجھیں اور اپنا وقت کسی صاحب عمل عالم کی صحبت میں گزاریں نہ کہ دنیاوی فضول محفلوں میں اسے برباد کریں"۔

سب نے فضل کی ہر بات کو سراہا اور عمل کا وعدہ لے کر اور مولوی صاحب کی پُرتاثیر باتوں کا سحر لے کر اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے مغرب کی اذان ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی۔

سب اپنے تئیں ایک خزانے کا راز لئے خوشی خوشی اپنے گھروں کو لوٹ گئے تھے اور اب اپنے گھر والوں کو مولوی صاحب کی باتوں کی سحر انگیزی بتانے میں مگن تھے۔

ایک نئی صبح لئے اگلا دن نمودار ہوا۔ یہ صبح بھی امید کامل تھی کہ اپنے دامن میں ان کے لئے عقل و بصیرت کے نئے موتی لئے ہوئے ہوگی۔

محلے میں موجود ہر شخص کی زبان اسی ایک انسان کا قصیدہ پڑھتے دکھائی دیتی۔ ہر روز مختلف فکر انگیز موضوعات پر بحث ہوتی اور ہر روز نئے خزانے ہاتھ لگتے۔ خزانہ کا نقشہ ہاتھ میں لئے ہوئے ہی اگر اصل خوشی ملتی تو اس کی تلاش اور رسائی کا کیا فائدہ۔ آخر ایک دن ایک عجیب بات ہوئی مجلس میں موجود ایک چودہ، پندرہ سال کے نوجوان نے مولانا سے سوال کیا جس کا جواب دیئے بغیر ہی وہ اٹھ گئے اور یہ ان کی پچاس سالہ زندگی میں پہلی بار ہوا تھا۔ اس نے پوچھا تھا۔

"مولانا صاحب! ایسا کیوں ہے کہ ہم حلال رزق کماتے ہیں اور اپنے بچوں کو کھلاتے ہیں۔ ہمارے ماں باپ نے بھی ہمیں حلال کھلایا۔ نماز پڑھتے ہیں، زکوٰۃ بھی دیتے ہیں، دین اور دنیا کو ساتھ لئے چل رہے ہیں مگر ہمارے دلوں کو سکون نہیں، مشکلات اور آزمائشیں ہیں کہ ختم ہونے میں نہیں آتیں اور وہ لوگ جو گمراہ ہیں عیش کی زندگی جی رہے ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ کہ ہماری دعائیں قبول نہیں ہوتیں"۔ سوال کرتے کرتے اس کی آنکھیں نمی سے بھر گئیں اور نمی کی حسیات ساری محفل تک پھیل گئیں جیسے یہ ان سب کا سوال ہو۔

مولوی صاحب ناسازیٔ طبیعت کا بہانہ بنا کر اندر کمرے میں چلے گئے اور سوچنے لگے کہ ان سب باتوں کا جواب تو تھا ان کے پاس پھر الفاظ اور زبان کی حرکت نے ساتھ کیوں چھوڑ دیا۔ سب لوگ انہیں صحت یابی کی دعا دیتے لوٹ گئے تھے اور وہ لفظوں کی بازگشت کے احتساب میں تھے۔

حد سے بڑھی قربت

آئینہ کوئی بھی ہو، عکس کی خوبصورتی اس کے اور دیکھنے والے کے درمیان فاصلے سے مشروط ہے۔ حد سے بڑی قربت نہ صرف منظر دھندلا دیتی ہے بلکہ سوچ کے کینوس کو بھی محدود کر دیتی ہے۔ (نبیلہ نازش)

یہ احتساب کا دن بھی مقدر والوں کو ملا کرتا ہے ورنہ خدا جس کی رسی دراز کر دے اس شخص سا بدبخت کوئی نہیں ہوتا۔

مولوی صاحب کی خوش نصیبی کی انتہا تھی کہ اپنے رب سے ملاقات سے پہلے انہیں احتساب کا دن ملا۔ یہ احتساب انہیں اپنے ضمیر کی عدالت میں لے آیا جہاں وہ خود ہی وکیل تھے اور خود ہی منصف بھی اور یہاں لانے کا فریضہ اس سوال کے ساتھ ساتھ ان کی بیٹی فاطمہ کی یہ بات بھی تھی جو اس نے آج صبح انہیں کہی تھی۔

''ابا جی! آپ مجھے معاف کیجئے گا مگر آپ دوسروں کو اتنا ہی درس دیا کریں جتنا آپ کا عمل ہو۔ بے عمل عالم جہنم کی آگ کا سب سے زیادہ مستحق ہوتا ہے۔ اس لئے کہ وہ جانتے ہوئے بھی دوسروں اور خود کو ایک اندھی کھائی میں دھکیل رہا ہوتا ہے جہاں ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہوتا ہے''۔

اس وقت تو انہیں دکھ اور غصہ محسوس ہوا مگر اب انہیں یوں لگ رہا تھا کہ ان کا اب تک کا سفر رائیگاں ہی گیا ہے اور اصل حقیقت کا انکشاف تو ان پر آج ہی وارد ہوا ہے ہوش سنبھالتے ہی انہوں نے ہمیشہ اپنے باپ کو ایک باعمل انسان کے روپ میں دیکھا تھا۔ انہوں نے اپنے باپ کو بہت کم بولتے سنا اور وہی کہتے سنا جو وہ کرتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے۔

''فضل دین میں اپنے الفاظ کی پکڑ سے ڈرتا ہوں پتر میں کوئی عالم نہیں ایک سیدھا سادہ بندہ ہوں اور اپنے عمل اور کردار کو اتنا ہی سادہ رکھنا چاہتا ہوں کہ میری پکڑ نہ ہو''۔

اس وقت اپنے باپ کی کہی بات آج کے بچوں نے انہیں سمجھا دی، وہ بڑے بڑے عالموں کی صحبت میں ہے مگر علم کی پٹاری تو بھر گئی اور عمل کا گھڑا سوکھے کا سوکھا رہ گیا۔ احتساب کا عمل مکمل ہوا اور اگلی صبح درحقیقت ایک نئی صبح تھی۔ اس نوجوان کو اس کے سوال کے جواب میں انہوں نے اتنا ہی کہا۔

''بیٹا! علم کی گود عمل کی سچائی سے خالی ہو تو لفظ بانجھ رہ جاتے ہیں۔ بیٹا! ہم کمینوں پہ ہمارے اعمال کا عذاب ہے ورنہ ہم لوگ کہاں کسی آزمائش کے قابل ہیں۔ ہم ساری زندگی دوسروں کی غلطیوں کے وکیل بنے گزار دیتے ہیں اور اپنی غلطیوں اور گناہوں کو خود ہی جج بن کر خود کو بری الذمہ قرار دے دیتے ہیں۔ کبھی سوچو، ہم نے اپنے رب کے لئے کیا کیا اور اس ذات کی کریمی دیکھو کہ نوازتی ہی جا رہی ہے۔

پھر انہوں نے دل میں سوچا اس ذات کا کرم دیکھو مجھ گناہ گار بے عمل عالم کو احساس کی ڈور سے جگایا۔ ورنہ میں بے عمل مر جاتا اور میرے ساتھ اور کئی زندگیاں بھی بے عمل اور بے مراد رہ جاتیں اور اس خدا کی شان کے صدقے جس نے مجھے علم کے بانجھ پن سے بچالیا۔ اُن کی آنکھوں کی نمی محفل میں کوئی نہ جان سکا۔ ہاں، اندر بیٹھی فاطمہ ان کی بات سن کر اطمینان سے مسکرا دی۔

نرالی شان لئے صبح امید جاگی فاطمہ نے دیکھا اب اس کے ابا جان وہی کرتے ہیں جو کہتے ہیں وہ عالم بے عمل نہیں رہے اور اس کے دل میں اپنے باپ کی محبت اور عزت تشنگی لئے ہوئے نہ رہی۔

اللہ اکبر...... اللہ اکبر۔

اسے اپنے باپ کی آواز سنائی دی۔

''آؤ ساتھیو! پہلے نماز کا اہتمام کئے لیتے ہیں باقی باتیں تو ہوتی رہیں گی''۔

''چھوٹی چھوٹی باتیں مگر بڑے عمل کے ساتھ نہ کہ بڑی بڑی باتیں بے عملی کے ساتھ''۔ انہوں نے دل میں سوچا۔

◆□◆

اناڑی

سکینہ کو نہ پا کر اُسے گلی سونی سونی لگنے لگی۔ وہ ہمیں لینے گلی تک کیوں نہیں آئی۔ اُس نے سوچا وہ مایوں بیٹھی ہوگی۔

☆ نسیم سکینہ صدف

اکبر آج کافی عرصے بعد گاؤں جا رہا تھا جہاں اُس کی خالہ رہتی تھی۔ وہ ریل گاڑی میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ میں نے خالہ کو اطلاع تو کر دی تھی کہ میں آ رہا ہوں اور وہ کسی کو سٹیشن بھیج دیں۔ خالہ مجھے دیکھ کر کتنی خوش ہوگی اور خالو تو بہت ہی پیار کریں گے اور وہ جو شیطان کی خالہ ہے...... سکینہ پتہ نہیں کتنی بڑی ہوگئی ہوگی۔ وہ انہی سوچوں میں گم تھا کہ گاڑی آہستہ ہونے لگی اور پھر رُک گئی۔ اُس کا سٹیشن آ گیا تھا۔ وہ اپنا اٹیچی لے کر اترا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا کہ کوئی لینے آیا ہے کہ نہیں۔ گاڑی بہت زیادہ لیٹ ہوگئی تھی۔

کچھ دور ایک لڑکی متلاشی نگاہوں سے، اترنے والے مسافروں کو دیکھ رہی تھی۔ اُس کا دوپٹہ کندھے سے جھول رہا تھا اور بال بکھرے ہوئے تھے اور نگاہوں میں غصے کے تاثرات تھے۔ جونہی دونوں کی نظریں ملیں وہ تیر کی طرح اُس کی طرف آئی جیسے چیل چوزے پر جھپٹتی ہے۔

''آپ نے تو صبح آنے کا لکھا تھا''۔ وہ اس کے ہاتھوں سے اٹیچی کیس چھین کر بولی۔ ''ہم صبح سے پریشان ہیں۔ ابا کتنے چکر لگا چکے ہیں سٹیشن کے''۔

''وہ گاڑی لیٹ ہوگئی تھی''۔ اکبر بوکھلا کر بولا۔ ''ورنہ ٹھیک وقت پر آ جاتا''۔ وہ حیران نظروں سے اُسے دیکھ رہا تھا کہ یہ کتنی بڑی ہوگئی۔ ''مجھے افسوس ہے''۔ وہ بولا۔ ''مگر خالو جان کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ گاڑی لیٹ ہے''۔

''اس وقت کوئی سواری نہیں ہے''۔ وہ بولی۔ ''ویسے بھی صرف ایک کوس تو جانا ہے، پیدل ہی چلتے ہیں''۔

پسینے کے مارے اکبر کا بُرا حال ہو رہا تھا مگر وہ بڑے مزے سے لمبے لمبے ڈگ بھرتی اس کا اٹیچی اٹھائے آگے آگے چلی جا رہی تھی اور اکبر کو مجبوراً اس کے پیچھے لپکنا پڑ رہا تھا۔

''آپ یہ اٹیچی مجھے پکڑا دیجئے''۔ وہ بولا۔ ''اچھا نہیں لگتا''۔

''کیا؟'' وہ کاٹ کھانے کے انداز میں بولی۔ ''کیا اچھا نہیں لگتا؟''

''یہی کہ آپ اٹیچی کیس اٹھائیں''۔

''یہ شہر نہیں ہے''۔

''مگر پھر بھی میرے لئے شرم کی بات ہے''۔

وہ کچھ مزید بولے بغیر آگے بڑھتی گئی۔ گھر پہنچ کر دروازے سے ہی چلانے لگی۔

"اماں! اماں!" وہ چلائی۔ "یہ آگئے ہیں۔ میں انہیں لے کر ہی آئی ہوں"۔ وہ ایسے کہہ رہی تھی جیسے اس کارنامے پر انعام کی طلبگار ہو۔

خالہ دوڑ کر آئیں اور اُسے سینے سے چمٹا کر بولیں۔ "بیٹا! ہم تو صبح سے تمہاری راہ دیکھ رہے ہیں۔ یہ سکینہ تو بار بار گلی میں جاتی اور تیری راہ دیکھتی۔ خدا کا شکر ہے کہ تم خیریت سے آگئے ہو"۔

اُس کا تو مارے گرمی کے بُرا حال تھا۔ پسینہ آرہا تھا اور تھکن کے مارے ٹانگیں درد کر رہی تھیں اور چہرہ پیلا پڑ رہا تھا۔

"لگتا ہے شہر سے ہی پیدل آئے ہیں"۔ وہ اُس کی یہ حالت دیکھ کر شرارت سے بولی۔ "مَیں چارپائی بچھا دیتی ہوں، لیٹ جائیں۔ مَیں لسی لے کر آتی ہوں"۔

"دیکھا بیٹا!" خالہ مسکرا کر بولیں۔ "کتنا خیال ہے تمہارا سکینہ کو"۔

"ہاں ہاں!" وہ بولا۔ "کیوں نہیں"۔ اس نے ایک نظر سکینہ پر ڈالی جس کی بھنوئیں ابھی تک تنی ہوئی تھیں اور چہرے پر وحشت برس رہی تھی، وہ سہم کر چپ ہو گیا۔

"بیٹا!" خالہ نے کہا۔ "جوتا اتار کر آرام سے بیٹھو"۔

"اوہ"۔ وہ جھک کر جوتا اتارنے لگا۔ اس سے پہلے کہ وہ جوتے کے تسمے کھولتا سکینہ جھپٹ کر جوتے پر پل پڑی اور لگی کھینچنے۔

"تم رہنے دو"۔ وہ تکلیف سے کسمساتا ہوا بولا۔ "میں خود اتار لیتا ہوں، تم تکلیف نہ کرو"۔

"یہ کمبخت تو چپک ہی گیا ہے"۔ وہ بگڑ کر بولی۔

"یہ دراصل تسمہ کھولنے سے اترے گا"۔

"ارے"۔ وہ جھینپ کر بولی۔ "یہ تو مَیں نے دیکھا ہی نہ تھا"۔ اُس نے جلدی سے گرہ پر ہاتھ ڈالا تو وہ مزید الجھ گئی۔ آخر خدا خدا کر کے اُس نے جوتے اتار ہی لئے اور اکبر نے سکون کا سانس لیا اور وہیں لیٹ کر سو گیا۔ کمرے میں اُس کے خراٹے گونجنے لگے۔

وہ سوتے میں چونک گیا۔ کوئی چیز کان پر رینگ رہی تھی۔ وہ کان پر ہاتھ پھیر کر پھر سو گیا مگر پھر کوئی چیز کان پر رینگنے لگی۔

"کیا مصیبت ہے"۔ وہ جھنجلا کر بولا اور کان مسلنے لگا۔

اُسے اپنے پیچھے ہنسی کی آواز سنائی دی۔ سکینہ اُس کے سرہانے کی طرف کھڑی ہنسی ضبط کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

"تو آپ ہیں"۔ وہ غصے سے پلٹ کر بولا۔

"کیا ہوا؟" وہ تنکا چھپا کر بولی۔

"کچھ نہیں"۔ وہ بیزاری سے بولا۔

اُس کی خالہ نے آ کر کہا کہ بیٹا اٹھ کر نہا لو۔ کھانا تیار ہے، تمہیں بھوک لگی ہو گی۔

"خوب پیٹ بھر کر کھانا"۔ نہا کر جب وہ کھانے کھانے بیٹا تو خالہ کہہ رہی تھیں۔ "سنا ہے تم بہت کم کھاتے ہو، اسی لئے دبلے پتے ہو"۔

اُس نے پہلا لقمہ ہی لیا تھا کہ منہ تھام کر رہ گیا۔ آنکھوں سے پانی نکلنے لگا۔

"کیا ہوا؟" سکینہ شرارت سے بولی۔

"کچھ نہیں"۔ وہ بڑی مشکل سے بولا۔

"مرچیں!......" سکینہ ہنس پڑی۔

"مرچیں تو میں نے اپنے ہاتھ سے ڈالی ہیں"۔ خالہ نے کہا۔ "تم دودھ سے کھا لو"۔ سکینہ سے بولیں کہ دودھ کا کٹورہ بھر لاؤ۔

"ابھی لائی اماں!" وہ بڑی پھرتی سے دوڑی گئی اور کٹورہ لئے واپس آئی۔

ایک گھونٹ ہی لیا تھا کہ تڑپ کر کٹورہ نیچے رکھ دیا۔ تیز نمک حلق میں جلن کر گیا۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں اور پلکیں جھپکا جھپکا کر اس طرح سکینہ کو دیکھنے لگا جیسے کہہ رہا ہو۔ میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟ کبھی مرچیں تو کبھی نمک اور سکینہ منہ میں دوپٹہ ٹھونس کر ہنس رہی تھی۔ بھرا بھرا چہرہ بڑی بڑی روشن آنکھیں سیاہ گھٹاؤں جیسے بالوں میں جیسے چاند مسکرا رہا ہو۔ اُسے منہ کی جلن کم ہوتی محسوس ہونے لگی اور اُس کے ہاتھ آپ ہی آپ کھانے کی طرف بڑھ گئے۔

"سکینہ کتنی شریر ہوگئی ہے"۔ اس نے سوچا۔ "اور حسین بھی"۔

اگلے دن اکبر نے واپس شہر آنا تھا۔ اُس نے رات کو ہی کپڑے وغیرہ اپنے اٹیچی کیس میں رکھ لئے تھے۔ وہ جتنے دن گاؤں میں رہا تھا سکینہ نے اُس کا ناک میں دم کئے رکھا۔ صبح نہا دھو کر اُس نے ناشتہ کیا۔ اُس نے دیکھا کہ خلاف توقع سکینہ اُداس اور بجھی بجھی ہے۔ نہ کوئی شرارت نہ شوخی۔ شاید اُس کی روانگی کے احساس سے۔ مگر کیا یہ لڑکی اپنے پہلو میں محبت بھرا دل رکھتی ہے؟ اس سوال کا جواب بڑا مشکل تھا۔ اُس کی شرارتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اکبر کے لئے کوئی رائے قائم رکھنا بہت مشکل تھا۔

"کچھ اور کہنا ہے تو کہہ لو"۔ اکبر نے سکینہ کو پاس بلا کر کہا۔ "ابھی تھوڑا وقت یہاں ہوں میں"۔

"مجھے معاف کر دو"۔ وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ "مجھے معلوم نہ تھا کہ تم اس قدر جلدی چلے جاؤ گے"۔

"اگر معلوم ہوتا تو اور زیادہ تنگ کرنا تھا"۔ اکبر نے اُسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

"وہ تو میں......" کہتے کہتے رُک گئی اور اُس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

عجیب لڑکی ہے۔ اُس نے سوچا کہاں تو میرا یہاں رہنا محال کر رکھا تھا اور اب محبت جتا رہی ہے۔ وہ اُس کی بھیگی آنکھوں اور اداس چہرے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اُس کے جی میں آئی کہ گھر جاتے ہی اماں سے کہہ دے۔

یوں ہی دن گزرتے گئے وہ اماں سے کچھ نہ کہہ سکا۔ ایک انجانی سی قوت اُسے روک دیتی تھی۔

......اور پھر اچانک ایک دن گاؤں سے خط آیا کہ سکینہ کی شادی اگلے ماہ ہونی قرار پائی ہے۔ آپ سب ہفتہ پہلے ہی آ جائیں۔ وہ ہکا بکا ہو کر خط پڑھنے لگا۔ وہ مایوسی اور ناکامی کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبنے لگا۔ اُس نے دل کو سہارا دینے کے لئے سوچا۔ شاید یہ اچھا ہی ہوا ہے۔ اُسے مجھ سے محبت تھی ہی کہاں۔ جتنے دن وہاں رہا اُس نے پریشان کئے رکھا۔ کوئی حد ہی نہیں اس کی بدتمیزیوں کی۔ اس کے ساتھ شادی کر کے کون خوش رہے گا۔ چلو اچھا ہوا جان چھوٹی۔ ایسی ہی باتوں سے وہ اپنے دل کو بہلانے کی کوشش کر رہا تھا مگر اُس کے من میں ایک عجیب سی بے قراری تھی۔ وہ بے کل ہوا جا رہا تھا۔ وہ اپنے ان جذبات کو ایک نام دینے سے کترا رہا تھا اور وہ نام تھا...... محبت...... کیا اُسے سکینہ سے محبت ہو گئی تھی؟ نہیں نہیں اُس نے سوچا میں اُس سے محبت نہیں کرتا۔ وہ تو بڑی بدتمیز اور شرارتی ہے جو گھر آئے مہمان کو ستا کر خوش ہوتی ہے۔

وہ چکی کے دو پاٹوں میں پسنے لگا۔

پھر وہ دن بھی آ گیا جب سب گھر والے ٹرین میں بیٹھے گاؤں جا رہے تھے۔ اکبر سوچ رہا تھا کہ دولہا کیسا ہو گا۔ جب سکینہ کی شادی ہو گی تو وہ ٹھیک ہو جائے گی۔ وہ گاؤں میں داخل ہوئے تو اکبر پر عجیب سی کیفیت طاری رہو رہی تھی۔ جب وہ گلی میں داخل ہوئے تو اُس کی متلاشی نظریں سکینہ کو تلاش کرنے لگیں۔ اُسے سکینہ کو نہ پا

کر گلی سونی سونی لگنے لگی۔ سکینہ ہمیں لینے گلی تک کیوں نہیں آئی۔ اُس نے سوچا وہ مایوں بیٹھی ہو گی۔

گھر کے اندر داخل ہوئے تو خالہ خالو نے استقبال کیا۔ سکینہ پھر بھی نظر نہ آئی۔ بے اختیار اُس نے خالہ سے پوچھ ہی لیا کہ سکینہ کہاں ہے؟

''اندر بخار سے پڑی ہے''۔

وہ تقریباً بھاگتا ہوا اندر گیا۔ سکینہ بستر پر پڑی بخار سے جل رہی تھی۔

''سکینہ!'' جواب نہ پا کر اُس نے سکینہ کو جھنجھوڑا اور بولا۔ ''بھول گئی ساری شرارتیں''۔

وہ کچھ نہ بولی۔

''دودھ میں نمک ملا کر لے آؤں، فوراً بخار اتر جائے گا''۔ وہ ہنستے ہوئے بولا۔

اُسے ہنستے دیکھ کر سکینہ نے نظریں اٹھائیں۔ اُس کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں اور اُس کی نظریں اکبر کے چہرے پر کچھ تلاش کر رہی تھیں۔ اتنے میں اماں اور خالہ اندر آ گئیں۔ نبض دیکھ کر کہا کہ بہت تیز بخار ہے میری بچی کو۔ یہاں کوئی حکیم نہیں ہے کیا؟

''دوائی باقاعدہ دے رہے ہیں''۔ خالہ نے کہا۔ ''مگر بخار اتر ہی نہیں رہا۔ ہر طرح جتن کر چکی ہوں۔ آج چوتھا دن ہے''۔

''اب ہم آ گئے ہیں''۔ اکبر نے کہا۔ ''بخار کی ایسی کی تیسی۔ کل تک بخار اتر جائے گا''۔

اور واقعی اگلے دن بخار اتر گیا۔ یہ دعا کا اثر تھا یا دوا کا بہر حال بخار اتر گیا۔ وہ نڈھال سی بیٹھی تھی۔

''دیکھا ہمارے آنے کی دیر تھی''۔ وہ بولا۔ ''بخار صاحب بھاگ گئے اب تو تم اچھی ہو گئی ہو''۔

''تم کیا سمجھتے ہو کہ مَیں اچھی ہو گئی ہوں؟'' سکینہ ناگواری سے بولی۔

''ہٹی کٹی تو ہو''۔ وہ ہنس کر بولا۔ ''مجھے بظاہر تو کوئی تکلیف نظر نہیں آ رہی''۔

سکینہ کے چہرے پر مُردنی سی چھاتی گئی اور آنکھیں بھر آئیں۔ وہ حیران ہو کر اس بدلتی ہوئی کیفیت کو دیکھ رہا تھا۔

''بولو سکینہ!'' اُس نے کہا۔ ''تم چپ کیوں ہو گئی ہو؟ تم کیا کہنا چاہتی ہو؟''

مگر وہ کروٹ بدل کر منہ پھیر کر لیٹ گئی۔

جوں جوں شادی کا دن قریب آ رہا تھا اُس کا شہد ایسا رنگ پھیکا ہی پڑتا جا رہا تھا۔ بیاہ والے دن تو وہ بالکل مُردہ مُردہ سی نظر آ رہی تھی۔ اکبر نے بڑی کوشش کی کہ وہ اُس سے باتیں کرے، اُس کے مذاق کا جواب مذاق سے دے لیکن اُس کی آنکھوں سے آنسو تھمنے کا نام ہی نہیں لیتے تھے۔ وہ جس قدر خوش تھا سکینہ اُسی قدر غمگین اور اداس تھی۔ لڑکیاں دولہا کی تعریف کر رہی تھیں۔ وہ سچ مچ بہت خوبصورت تھا، اونچا لمبا قد اور سرخ وسفید رنگ رنگ۔ پھر یہ سکینہ اداس کیوں لگ رہی ہے۔ وہ چونک سا گیا۔ اُس کے دل میں بجلی سی چمکی اور ماند پڑ گئی۔

وہ دلہن بن کر چلی گئی۔ سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ اُس کی شادی کا واقعہ ایک خواب بن گیا مگر اکبر کے دل میں بیٹھے بیٹھے یہ خیال رینگنے لگتا کہ سکینہ سے میرا بیاہ ہو جاتا تو...... سرد آہ بھر کر سوچتا کہ شاید اسی وجہ سے وہ اُداس تھی مگر اُس نے مجھے کہا کیوں نہ۔ پھر خود ہی جواب دیتا لڑکی صاف صاف تھوڑا ہی کہتی ہے۔ مجھے خود ہی اُس کی باتوں اور حرکتوں سے اندازہ کر لینا چاہئے تھا۔ اُس کی خاموشی سب کچھ سمجھا رہی تھی مجھ کو۔ پھر بخار اُترنے کے بعد اُس کا یہ کہنا کہ ''تم کیا سمجھتے ہو کہ مَیں اچھی ہو گئی ہوں''۔ کون جانتا ہے کہ اُسے مجھ سے محبت تھی۔ سوچتے سوچتے اس کے آنسو نکل آئے اور سرد آہ بھر کر بولا۔ ''مَیں بھی کتنا اناڑی ہوں''۔

▲●▲

پنجاب پر سکھوں کا قبضہ کیسے ہوا؟ مغلیہ سلطنت کیسے برباد ہوئی؟

مُغلانی بیگم

رفیق ڈوگر قسط:7
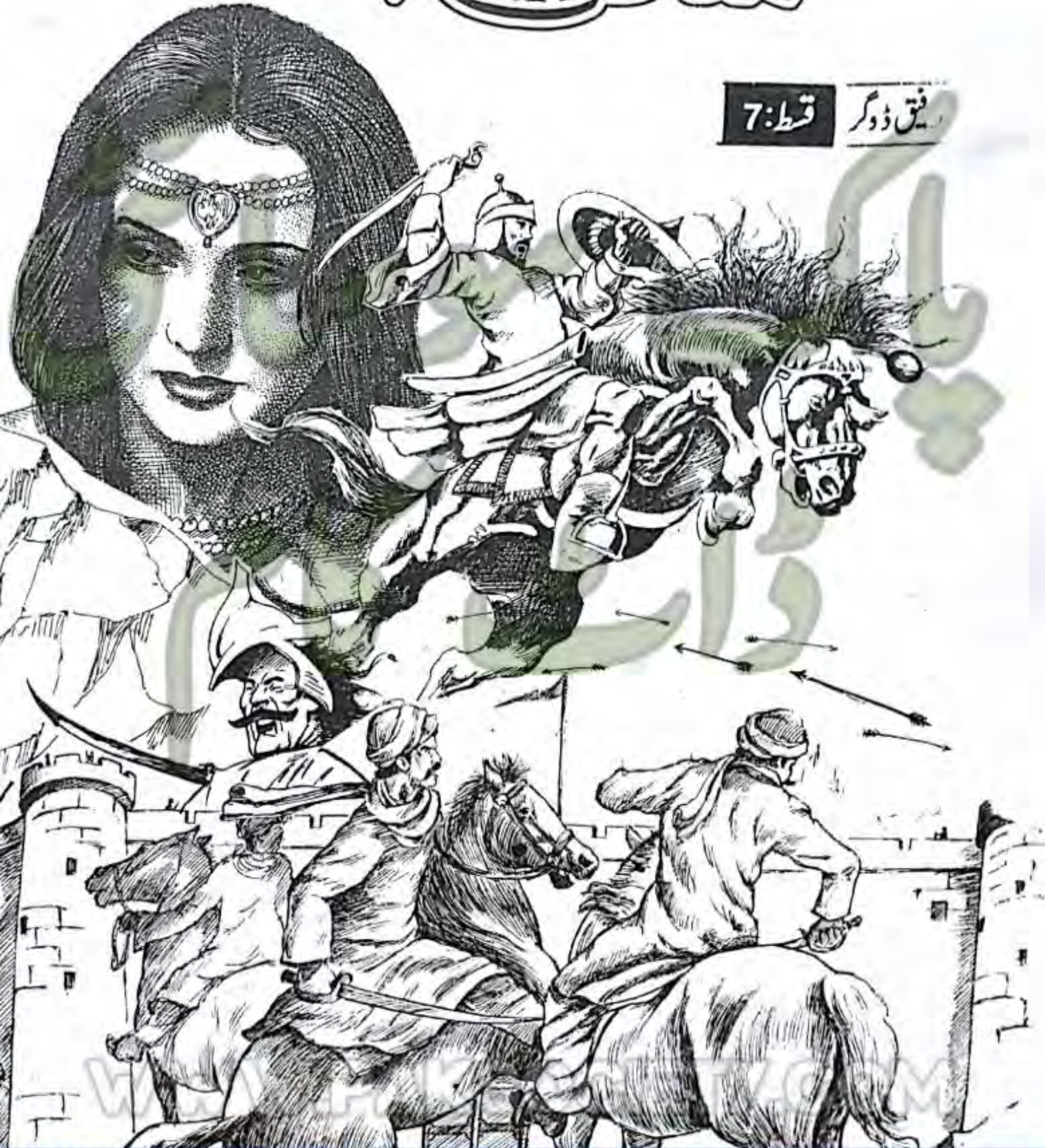
بارش ایک ہفتہ سے جاری تھی، میدانی علاقوں کے باسیوں کے لئے پوہ کی جھڑی لمبی ہو جائے تو بہت تکلیف دہ ہوتی ہے کیچڑ گارا سردی اور آسمان سے برستا پانی ان کے نظام زندگی کو مفلوج کر دیتا ہے۔

دوآبہ جالندھر کا حاکم اور شمالی ہندوستان کا سب سے طاقتور اور خوشحال حکمران آدینہ بیگ اپنی قلعہ نما حویلی کے دیوان میں دربار لگائے بیٹھا تھا اور اس کے عمال مختلف امور کے بارے میں رپورٹیں پیش کر رہے تھے۔

"بارش کی وجہ سے شہر میں غلہ اور ایندھن کی کمی تو نہیں ہوئی؟" اس نے ناظم شہر سے پوچھا۔

"بارش کے وقت سے باہر سے خشک ایندھن نہیں آ رہا مگر شہر میں غلہ کا ذخیرہ وافر ہے۔" ناظم نے جواب دیا۔

"آٹا ہو اور روٹی پکانے کے لئے ایندھن نہ ہو تو اس کا مطلب ہوتا ہے آٹا بھی نہیں ہے۔" آدینہ بیگ نے اس کی آنکھوں میں اس انداز میں آنکھیں ڈالیں کہ ناظم اس کی تاب نہ لا سکا۔

سب حاضرین نے آنکھیں نیچی کر لیں۔

"جو منصب دار موسم کے مزاج سے اور حاکم دشمن کے راز سے بے نیاز ہو وہ کتنے روز حاکم رہ سکتا ہے؟" آدینہ بیگ نے سوال کیا۔

سب نگاہیں نیچی کئے سر جھکائے بیٹھے رہے کسی نے جواب دینے کی جرأت نہیں کی۔

"فوج کے لئے محفوظ ایندھن سے لکڑ منڈی کے بیوپاریوں کو لکڑی فروخت کر دیں تاکہ عام لوگ ان سے خرید سکیں۔" اس نے فوج کے خوراک کے شعبہ کے سربراہ کو ہدایت کی۔

اس نے تعمیل حکم کے لئے سر جھکا دیا۔

اگر کوئی اور حاکم ہوتا تو ایسے حالات میں عام لوگوں کو مفت ایندھن فراہم کرنے کی ہدایت کرتا لیکن آدینہ بیگ مالیات کو سب سے زیادہ اہمیت دیتا تھا اور تھوڑا سا مالی خسارہ بھی گوارا نہیں کرتا تھا۔

"مویشیوں اور گھوڑوں کی خوراک دستیاب ہے؟" اس نے پھر ناظم شہر کو مخاطب کیا۔

"حضور مویشیوں اور گھوڑوں کے لئے چارہ مسلسل دستیاب ہے۔ کسان ضروریات کی خریداری کے لئے بارش میں بھی چارہ لا رہے ہیں۔" اس نے دست بستہ جواب دیا۔

"تمہیں ضروریات کی مشکل درپیش ہوتی تو تم بھی بارش میں ایندھن ڈھونڈتے پھرتے زندگی کی آسائشیں جو منصب دار کو اپنے ماتحتوں اور رعایا کی ضروریات سے غافل کر دیں اس میں اور ہمارے اصطبل کے گھوڑوں میں کیا فرق ہے۔" وہ ابھی تک ایندھن کی کمیابی پر ناراض تھا۔

"حضور اس بار یہ خطا معاف فرما دیں آئندہ کبھی ایسا نہ ہوگا۔" ناظم شہر نے دست بستہ درخواست کی۔

"اگر خبر آئے کہ شرپسندوں نے ہمارے علاقہ میں سرکشی شروع کر دی ہے تو کتنے گھنٹوں میں فوج ان کی سرکوبی کے لئے روانہ ہو سکتی ہے؟" آدینہ بیگ نے کمانڈار سے پوچھا۔

"نصف گھنٹہ میں فوج شہر سے نکل کر سرکشوں کو کچلنے کے لئے بڑھ رہی ہوگی۔" کمانڈار نے جواب دیا۔

آدینہ بیگ نے داد دینے کے انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

اس سوال اور جواب کی اس وقت اتنی ضرورت نہیں تھی لیکن دوسرے عمال کو ہوشیار اور خبردار کرنے کے لئے اس نے موضوع بدل دیا تھا تاکہ وہ جان جائیں کہ ان سے کتنی مستعدی کی توقع کی جاتی ہے۔

دربان نے آداب بجا لا کر اطلاع دی کہ چار سوار آئے ہیں اور ان کے کماندار بلاتاخیر ان سے ملنا چاہتے ہیں۔

''ان کے کپڑے خشک ہیں یا بھیگے ہوئے؟'' آدینہ بیگ نے پوچھا۔

''حضور وہ بارش میں بھیگ کر آئے ہیں۔'' دربان رکوع میں چلا گیا۔

''انہیں فوری طور پر خشک لباس اور تازہ خوراک دی جائے ان کے گھوڑوں کی دیکھ بھال کریں کھانا کھا چکیں تو کماندار کو حاضر کریں۔'' اس کے حکم کے انداز سے پتہ چلتا تھا کہ وہ بھی ان سے بلاتاخیر اس سرد سفر کی وجوہ جاننا چاہتا ہے۔

دربان سلام کر کے باہر نکل گیا۔

''تمہاری سواریاں نہ بھی بھیگی ہوں تو بھی تم بارش میں بھیگ سکتے ہو چاہو تو بارش تھمنے کا انتظار کرو۔'' اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

اس کے کھڑے ہوتے ہی سب عمال سر جھکا کر مؤدب کھڑے ہو گئے، وہ عقبی دروازہ سے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

***

آدینہ بیگ کی دستار میں لگے ہیرے سے نور کی شعاعیں پھوٹ رہی تھیں آتشدان کے سامنے شمعدان کی سیدھ میں بیٹھا وہ سیاست کی بساط پر اقتدار کے کھیل کی چالوں پر غور کر رہا تھا۔

''عمادالملک ابھی بچہ ہے اس کا خیال ہے اور کوئی اس کی چال نہیں سمجھتا۔'' داڑھی میں انگلیاں پھیرتے ہوئے اس نے اپنے آپ سے کہا۔

بارش میں بھیگتے جو چار سوار آئے تھے انہوں نے خبر دی تھی کہ وزیراعظم عمادالملک شکار کی غرض سے پنجاب جانے والے ہیں۔ دربار برخاست کرنے کے فوراً بعد آدینہ بیگ نے ان سواروں کے کماندار سید رحیم کو حاضری کے لئے طلب کیا تو اس نے یہ خبر زبانی دی تھی اس کارکردگی کے لئے انہیں انعام و کرام سے نواز کر وہ مغلیہ سلطنت کے وزیراعظم کے سلطنت قندھار کے علاقہ میں شکار کھیلنے کے سیاسی پہلوؤں پر غور کرنے لگا تھا۔

لاہور سے جالندھر تک کے سفر میں سید رحیم خان وہ خط دیکھنے میں کامیاب ہو گیا تھا جو اس کا دوست ریاست علی شاہجہان آباد لے جا رہا تھا۔ ریاست علی نے پہلی ملاقات میں اسے بتایا تھا کہ وہ مغلانی بیگم کی طرف سے عمادالملک کے لئے خط لے جانے والا ہے اسی انکشاف کے بعد رحیم خاں نے اس کے ساتھ جالندھر کے سفر کا پروگرام بنایا تھا۔ اس کے خیال میں یہ بہت اہم خط تھا لہٰذا آدینہ بیگ کو اس سے آگاہ کرنا لازم تھا۔ آدینہ بیگ نے اس خط کی روشنی میں عمادالملک کے پنجاب میں شکار کھیلنے کے پروگرام کا جائزہ لیا۔

''افغانوں کے علاوہ وزیراعظم دوآبہ اور سرہند کے حاکموں کو بھی شکار کرنا چاہتے ہیں؟ ہر نوجوان کو بیوی کی ضرورت ہوتی ہے۔ مغلانی بیگم کی بیٹی کو بیاہ لانے سے عمادالملک کی اور بھی بہت سی ضرورتیں پوری ہو جائیں گی۔ بیگم کا اس سے تعلق مضبوط ہوگا اور قندھار سے رابطہ کمزور پڑ جائے گا۔ عمادالملک ایک بار پھر مغلیہ اقتدار پنجاب تک وسیع کر کے اپنی پوزیشن مضبوط کرنے میں کامیاب ہو جائے گا مگر پنجاب پر قبضہ مستحکم کرنے کے لئے اسے میری ضرورت ہو گی۔'' اس کو اپنا پرانا خواب پورا ہوتا نظر آنے لگا۔

مگر مغلانی بیگم اور خواجہ عبداللہ کو راستہ سے کیسے ہٹایا جائے؟ اس کے لئے یہ بڑا اہم سوال تھا اور یہی سوال حل کرنے کے لئے وہ بساط پر پھیلے مہروں کی چالوں کے راستوں پر غور کر رہا تھا۔

صدیق خان کمرے میں داخل ہوا تو اس نے حکم

دیا۔ ''طویل مسافت اور بھرپور لڑائی کی تیاری کریں مگر اس طرح کہ کسی کو شبہ تک نہ ہو کہ ہم کسی مہم پر جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔''

''بہت بہتر حضور۔'' صدیق خان نے جواب دیا۔

''مہم کے دوران ہم شکار بھی کھیلنا چاہتے ہیں، اس کا بھی اہتمام ہونا چاہئے۔''

صدیق خان نے ایک بار پھر حکم کی تعمیل میں سر جھکا دیا لیکن اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ رحیم خاں کے آتے ہی اچانک فوجی مہم اور شکار کی ضرورت کیوں پیش آ گئی۔ وہ آدینہ بیگ کا سب سے معتمد ساتھی تھا۔ فوجی مہموں سے پہلے وہ ان سے حالات اور تفصیلات پر تبادلہ خیال کیا کرتا تھا مگر اس بار کچھ بتائے بغیر صرف حکم دے رہا تھا۔

''ہمیں خبر دی گئی ہے کہ موسم کی خرابی کو دیکھ کر سکھوں کی نیت خراب ہو رہی ہے اگر انہوں نے دوآبہ میں کوئی شرارت کی تو ہم انہیں بتانا چاہیں گے کہ یہ آدینہ بیگ کا علاقہ ہے۔'' اس نے اپنی فوج کے کماندار کی پریشانی کا اندازہ کرتے ہوئے کہا۔

''حضور کی اطلاع سو فیصد درست ہے مگر بندہ یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ سکھ حضور کی نوازشات اور طاقت سب کچھ بھول کیسے سکتے ہیں۔'' صدیق خان نے کہا۔

''ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ سکھ دوآبہ میں داخل ہونے کی غلطی کریں گے مگر ہم انہیں یہ بھی بتانا پسند کریں گے کہ بارش اور سردی میں، ہم صرف آتشدان کے سامنے ہی نہیں بیٹھا کرتے اس سے رعایا پر بھی خوشگوار اثر پڑے گا کہ حاکم ان کی خاطر موسموں کی سختیاں بھی برداشت کرتے ہیں۔'' آدینہ بیگ وقت سے پہلے صدیق خاں پر اصل ارادہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''حضور کی دور اندیشی اور بہادری شاہجہان آباد سے قندھار تک مسلم ہے۔'' فوجی جرنیل عام درباری کی سطح پر اتر آیا۔

''ہم نے سید رحیم خاں کو ہدایت کی ہے کہ وہ جلد از جلد لاہور روانہ ہو جائے۔ موسم کا انتظار نہ کیا جائے اس کے سفر کی آج ہی تیاری مکمل ہونا لازم ہے۔ ہماری طرف سے راستہ کے جتھیداروں کے نام چٹھیاں لکھوا دیں کہ وہ ہمارے خاص آدمی ہیں۔'' اس نے حکم دیا۔

''سفر کی تیاریاں مکمل ہونے کے دوران چٹھیاں لکھوائی جا چکی ہوں گی۔ حضور جب حکم دیں انہیں روانہ کر دیا جائے گا۔'' صدیق خاں نے عرض کیا۔

''کل صبح انہیں ہر صورت لاہور روانہ ہو جانا چاہئے۔'' آدینہ بیگ نے ہدایت کی۔

***

ماگھ کی عمر دو یوم تھی جب وزیراعظم عمادالملک اور شاہزادہ عالی گوہر دس ہزار فوج کے ساتھ بادشاہ قندھار کے علاقہ میں بلا اجازت شکار کھیلنے کے لئے شاہجہان آباد سے نکلے۔ آٹھ سال پہلے وزیراعظم قمرالدین خان احمد شاہ ابدالی سے لڑائی کے لئے فوج لے کر شاہجہان آباد سے روانہ ہوا تو اس کے ساتھ شاہزادہ احمد شاہ تھا۔ آٹھ سال کی مدت میں افغان فوجوں نے کئی دفعہ پنجاب پر حملہ کیا تھا مگر حاکم پنجاب کی درخواستوں کے باوجود شاہجہان آباد نے کبھی کوئی مدد نہ بھیجی تھی۔ افغانوں نے پنجاب ملتان اور سرہند تک اپنی سلطنت پھیلا دی تھی۔ سکھوں نے پنجاب کو تباہ و برباد کر دیا تھا مگر کسی مغلیہ وزیراعظم یا شہزادے نے کشور پنجاب تک آنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی اس لئے جب نواب قمرالدین خاں کا نواسہ عمادالملک شاہزادہ عالی گوہر اور فوج کے ہمراہ شاہجہان آباد سے روانہ ہوا تو چھوٹے موٹے سب حاکم اور صوبیدار ہوشیار ہو گئے اور پھر سے مغل بادشاہ سے وفاداری کی یقین دہانیاں کرانے اور وزیراعظم کو اپنے اپنے علاقوں میں شکار کی دعوت پیش کرنے لگے۔ وزیراعظم کے روانہ ہونے کی اطلاع ملتے

ہی آدینہ بیگ نے بھی اپنی وفاداری کا عریضہ ارسال کیا اور درخواست کی کہ وزیراعظم ہندان کے علاقہ کو بھی شکار کا اعزاز بخشیں۔

ملک سجاول اور سرفراز خان بھی وزیراعظم کے ساتھ تھے۔ اعلان کیا گیا تھا کہ وزیراعظم اہالیان پنجاب کی درخواست پر پنجاب میں شکار کھیلنے جارہے ہیں اور ملک سجاول ایک دستہ کے ہمراہ اہلِ پنجاب کے نمائندہ کی حیثیت سے ان کے ساتھ ہیں۔

عمادالملک لاہور پہنچنے کی جلدی میں نہیں تھے راستہ کے منصب داروں اور جاگیرداروں کو اپنے عزم اور ارادوں سے آگاہ کرتے ہوئے وہ ہانسی اور حصار کے جنگلوں میں شکار کھیلتے کھیلتے چالیس روز میں سرہند پہنچے۔ وزیراعظم نے ابھی تک آدینہ بیگ کی شرف میزبانی اور شکار کے اعزاز کی کسی درخواست کا جواب نہیں دیا تھا۔ اس لئے جیسے جیسے عمادالملک قریب پہنچ رہا تھا۔ آدینہ بیگ کی بے چینی بڑھتی جارہی تھی اس کا خیال تھا کہ درخواست موصول ہوتے ہی عمادالملک اسے فوری طلب کرے گا اور اس کے علاقہ میں شکار کی دعوت قبول کرکے اس کی اہمیت کا اعتراف کرے گا۔ عمادالملک چھوٹے چھوٹے منصب داروں اور پرگنوں کے حاکموں کے ہاں قیام کرتا آرہا تھا مگر اس کی درخواستوں کا جواب تک نہ دیا تھا اس سے آدینہ بیگ کے دل میں شبہات پیدا ہونے لگے کہ شاید عمادالملک نے پنجاب پر شاجہان آباد کا قبضہ بحال کرنے اور سکھوں کی سرکشی کو کچلنے کا فیصلہ کرلیا ہے اور اس کے لئے وہ احمد شاہ ابدالی سے لڑائی کے لئے بھی آمادہ ہے۔ اسی لئے منزل منزل چلتا ہوا ان علاقوں پر اپنا اختیار مستحکم کررہا ہے۔ وہ اپنے ماضی سے خود سب سے زیادہ واقف تھا وہ سوچنے لگا۔ کیا عمادالملک اسے نظرانداز کرکے اس سے اپنی ناراضگی اور عدم اعتماد کا اظہار کررہا ہے؟ اگر اس کی مدد اور تعاون کے بغیر عمادالملک لاہور اور پنجاب پر قبضہ کرلیتا ہے تو پنجاب کا نظم کسی اور کے ہاتھ میں دے گا اس کے بعد دوآبہ جالندھر کی طرف بھی دھیان کرسکتا ہے۔ آدینہ بیگ خوشامد اور سازش کا ماہر تھا مگر وزیراعظم اس کی خوشامد کے جال میں نہیں پھنس رہا تھا۔

وزیراعظم کے ہم رکاب امراء میں سید جمال الدین خان بہت بااثر تھے۔ آدینہ بیگ کے سید جمال الدین سے مراسم تھے۔ ''کیا سید جمال الدین اس مشکل میں کام آسکتا ہے؟'' اس نے صدیق خان سے پوچھا۔

''مغلیہ دربار سے وابستہ کوئی بھی سید اور ترک مملکت یا بادشاہ کا وفادار نہیں سب اپنے مفاد کے شکار پر نکلے ہیں اگر حضور انہیں کوئی سہانا خواب دکھاسکیں تو سید کو استعمال کرنا مشکل نہیں ہونا چاہئے۔'' صدیق خان نے جواب دیا۔

''تم سرہند کے لئے دستہ تیار کرو ہم سید کے نام مراسلہ لکھواتے ہیں۔'' آدینہ بیگ صدیق خاں کی بات سمجھ گیا۔ ''جیسے ہی مراسلہ تیار ہو دستہ روانہ ہوجائے گا۔'' اس نے حکم دیا۔

***

گل بنفشہ کے سرخ و سپید رخساروں پر سے آنسو بہہ رہے تھے۔ آنکھیں سرخ تھیں اور بال بکھرے ہوئے تھے۔ مغلانی بیگم نے اسے قریب آنے کا حکم دیا تو وہ اس کے پاؤں میں گرگئی۔

''تمہارا غم ہمارا ذاتی غم ہے، ہم نے تمہیں اس حالت میں دیکھنے کو نہیں پالا''۔ مغلانی بیگم نے اسے پاؤں سے جدا کرتے ہوئے کہا۔

''بندی کو اس کے ماردیئے جانے کا دکھ نہ ہوگا جتنا حضور!......'' وہ فقرہ مکمل نہ کرسکی۔

''میاں خوش فہم ہم جاننا چاہتے ہیں شہباز کیا خبر لایا ہے؟'' بیگم نے پردہ کے پیچھے کھڑے خوش فہم سے

پوچھا۔

''حضور! خبر کوئی اچھی نہیں''۔ میاں خوش فہم نے ہاتھ باندھ کر جواب دیا۔

''میاں خوش فہم ہم خبر کے اچھی یا بُری ہونے کا نہیں پوچھ رہے، ہم جاننا چاہتے ہیں شہباز کیا خبر لایا ہے؟'' اس نے غصہ سے پوچھا۔

''حضور کا خادم حضور کی ممانی کی قید میں ہے اور وہ اسے جان سے مار دینے کا حکم دے چکی ہیں''۔ خوش فہم کی آواز کانپ رہی تھی۔

گل بنفشہ کی چیخ نکل گئی۔ ''حضور!''

''شہباز کو ہماری طرف سے حکم دو کہ وہ ابھی نواب عبداللہ خاں تک ہمارا پیغام پہنچائے کہ اگر دو گھنٹے میں طہماس خاں ہم تک نہ پہنچا تو ہم خود دستہ لے کر اس کو رہا کرانے جائیں گے۔ تم ابھی تیز رفتار گھوڑے پر ممانی کی حویلی جاؤ اور ہمارا پیغام دو کہ طہماس خاں کا بال بیکا ہوا تو ہم بدلا لیں گے''۔ مغلانی بیگم بہت غصہ میں تھی۔

میاں خوش فہم جلدی سے گھوم کر دروازے سے باہر نکل گیا۔

''اٹھو اپنی شکل درست کرو، ہم اتنے بے وقعت نہیں ہوئے کہ اپنے خادموں کی جان کی حفاظت نہ کر سکیں''۔ اس نے گل بنفشہ کو تسلی دی۔

گل بنفشہ اٹھی اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی دروازے سے باہر نکل گئی۔

عمادالملک کے روانہ ہونے کی خبر پا کر لاہور کے ترک امراء نے بھی اسے خط ارسال کیا تھا جس میں مغل بادشاہ سے اپنی وفاداری کا یقین دلایا گیا تھا اور مغلانی بیگم کی مخالفت کی وجہ بیان کرتے ہوئے مغلانی بیگم پر بداعمالیوں کا الزام لگایا تھا اور لکھا تھا اس نے ترکوں کی ناموس خاک میں ملا دی ہے اور اپنی بیٹی کا نکاح احمد شاہ ابدالی کے بیٹے سے کرنا چاہتی ہے۔

طہماس خان پر بیگم کے لطف و کرم کے افسانے مشہور کیے گئے مغلانی بیگم کی ممانی نے اسے اپنی حویلی میں بلا کر قید میں ڈال دیا۔ اسے جان سے مروا کر وہ خاندان کی عزت کی حفاظت کر کے عمادالملک کو خوش کرنا چاہتی تھی۔ مغلانی بیگم کا پیغام ملتے ہی نواب عبداللہ خان نے طہماس خان کو رہا کروا کر شیش محل بھیج دیا۔ عمادالملک کے پنجاب کے سفر کی وجہ سے وہ کوئی ایسی صورتِ حال پیدا نہیں کرنا چاہتا تھا جس سے اس کے غضبناک ہونے کا خدشہ ہو۔

طہماس خان کی رہائی اور خواجہ عبداللہ کی پسپائی سے قلعہ کے محافظ اور پہریدار ایک بار پھر مغلانی بیگم کو بااختیار سمجھنے لگے۔

***

ملک سجاول نے قلعہ کی ڈیوڑھی پر کماندار کو بتایا کہ وہ بیگم سے ملنا چاہتا ہے تو کماندار نے فوراً قلعہ دار کو اطلاع دی اور قلعہ دار خود ڈیوڑھی پر حاضر ہو گیا۔

عمادالملک کی آمد کی خبر سے سب عمال کا رویہ بدل چکا تھا۔

مغلانی بیگم کے لئے ملک سجاول کی آمد غیر متوقع تھی اسے عمادالملک کے سرہند پہنچنے کی اطلاع مل چکی تھی۔ اسے امید تھی کہ ملک سجاول وزیراعظم کے ساتھ رہے گا اور پنجاب میں شکار کھیلنے کے بہانے عمادالملک فوج سمیت لاہور پہنچ جائے گا اس لئے جب اسے ملک سجاول کی آمد اور درخواست کا بتایا گیا تو وہ بے چین ہو گئی اور فوری حاضری کا حکم دیا۔

''ہم سمجھتے ہیں وزیراعظم کے پروگرام میں کسی تبدیلی کی وجہ سے آپ کو انہیں پیچھے چھوڑنا پڑا''۔ بیگم نے ملک کے بتانے سے پہلے ہی سوال کیا۔

''حضور کا اندازہ درست ہے''۔ ملک نے مؤدبانہ جواب دیا۔

''ہم جاننا چاہیں گے کہ آپ کیا پیغام لائے ہیں''۔اس نے بے چینی سے پوچھا۔

''وزیراعظم نے کشور پنجاب میں شکار نہ کھیلنے کا فیصلہ کیا ہے اور حضور سے درخواست کی ہے کہ انہیں بذات خود حاضری سے مستثنیٰ فرمایا جاوے''۔

مغلانی نے پریشانی پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔''آپ جانتے ہیں اس فیصلے کا سبب کیا ہوا؟''

''امراء نے خاص طور پر سید جمال الدین نے انہیں اس پر آمادہ کیا ہے کہ وہ احمد شاہ ابدالی کی سلطنت کی حدود میں فوج کے ساتھ داخل ہوئے تو اسے کشور پنجاب پر حملہ تصور کیا جائے گا۔ ابدالی کے امیر لشکر کے پاس مضبوط فوج ہے اگر اس نے مقابلہ کا فیصلہ کیا تو اس سے حالات ناخوشگوار ہوتے ہیں''۔ملک سجاول نے بتایا۔

''عمادالملک کا سرہند میں قیام کا کب تک ارادہ ہے''۔مغلانی بیگم کی پریشانی بڑھ رہی تھی۔

''وزیراعظم کے معتمد خواجہ سرا نسیم خان دو روز میں حضور کی خدمت میں پیش ہو رہے ہیں۔نواب آدینہ بیگ کے کمانداد صدیق خان بھی ان کے ہمراہ ہوں گے اور جب تک حضور چاہیں گے وہ لاہور میں قیام کریں گے اور شہزادی عالیہ کی ڈولی کے ساتھ واپس سرہند جائیں گے''۔

مغلانی بیگم کو عمادالملک کا یہ فیصلہ پسند نہیں آیا پھر بھی اس کی پریشانی کم ہوگئی۔ وہ اس فیصلے کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے لگی اس کا خیال تھا کہ جب عمادالملک اپنی فوج کے ساتھ اس کے حضور حاضری دے گا تو اس کی اپنی پوزیشن مضبوط ہو گی اور خواجہ عبداللہ خان اس کے اختیارات کی بحالی پر مجبور ہو جائے گا۔صدیق خان کا نام سن کر اسے آدینہ بیگ کی کسی سازش کا شبہ ہوا۔

''ہم سمجھتے ہیں آدینہ بیگ ابھی تک جالندھر میں ہے''۔اس نے سوال کیا۔

''حضور کا اندازہ درست ہے، آدینہ بیگ کو ابھی تک وزیراعظم کے حضور حاضری کی اجازت نہیں ملی''۔ملک سجاول نے بتایا۔

''صدیق خان بھی آدینہ بیگ کے ساتھ ہوگا؟''

''حضور درست سمجھتے ہیں، نسیم خان دو ہزار فوج کے ہمراہ جالندھر روانہ ہو چکا ہوگا وہاں سے صدیق خان اپنی فوج کے ساتھ اس سے مل جائے گا اور پھر حضور کے پاس حاضر ہو جائیں گے''۔ملک نے بتایا۔

''ہماری خواہش ہے آپ اپنے ساتھیوں سمیت ہماری حویلی میں قیام فرماویں اور نسیم خاں کی واپسی تک وہیں رہیں ہمیں آپ کی ضرورت ہوگی''۔بیگم نے کچھ سوچ کر کہا۔

''وزیراعظم نے اپنی فوج کا جو دستہ ہمارے ساتھ بھیجا تھا میں اسے ملک پور چھوڑ آیا ہوں۔اجازت ہو تو ایک دو شب کے لئے واپس جانا چاہوں گا''۔ملک سجاول نے کہا۔

''ہمارے خیال میں اس دستہ کو وہاں چھوڑنے کی ضرورت نہ تھی''۔

''وزیراعظم کا حکم تھا جب تک نسیم خان لاہور نہ پہنچ جائے ان کا کوئی سپاہی شہر کی حدود میں داخل نہ ہو''۔

''کل شام ہمارے خدام حویلی میں آپ کی مہمان نوازی کے لئے منتظر ہوں گے''۔بیگم نے فیصلہ سنا دیا۔

ملک سجاول آداب عرض کر کے کمرے سے باہر نکل گیا۔

اس رات شیش محل میں چراغاں کیا گیا اور صبح تک کنیزیں ڈھولکی پر گیت گاتی رہیں۔

****

خواجہ عبداللہ خان صبح کی نماز سے فارغ ہو کر نشست گاہ میں داخل ہوئے تو دربان نے خبر دی کہ پرچہ

نویسوں کے سربراہ حاضری کے منتظر ہیں۔ وہ کوئی اہم خبر سننے کے لئے تیار ہو گئے۔ "حاضر کریں"۔ انہوں نے دربان کی طرف دیکھے بغیر حکم دیا اور سیدھے چلتے ہوئے نشست پر جا بیٹھے۔

"شب رفتہ کے اندھیرے میں شاہ گنج میں ایک بڑی فوج نے خیمے نصب کر لئے ہیں"۔ آنے والے نے اطلاع دی۔

شاہ گنج قلعہ سے صرف تین میل کے فاصلہ پر تھا اور شام رفتہ تک پنجاب کی حدود میں کسی بیرونی فوج کے داخلہ کی کوئی اطلاع نہیں تھی۔ "فوج کس طرف سے آئی ہے؟" خواجہ پریشان ہو گیا۔

"فوج کا کماندار آدینہ بیگ کا جرنیل صدیق خان ہے"۔ اس نے جواب دیا۔

"کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ فوج ناظم دوآبہ کی ہے؟" خواجہ عبداللہ خان کی آواز میں گھبراہٹ تھی۔

"یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وزیراعظم ہند کی فوج کا ایک دستہ بھی اس میں شامل ہے"۔

"ہم یہ سمجھیں کہ لاہور کے دروازے پر دو فوجیں دستک دے رہی ہیں"۔

"حضور، پرچہ نویس کا یہی خیال ہے"۔ اس نے سر جھکا کر بتایا۔

"ہمارے پرچہ نویسوں کو جالندھر سے فوج کی روانگی کا علم ہوا نہ لاہور تک راستہ میں کسی کو اتنی بڑی فوج دکھائی دی"۔ وہ غصہ سے چلایا۔

پرچہ نویسوں کا سربراہ سر جھکائے خاموش کھڑا رہا۔

"اس فوج کی تعداد کیا ہو گی؟" خواجہ عبداللہ خان نے پوچھا۔

"پرچہ نویس نے اس فوج کی تعداد چودہ سے پندرہ ہزار تک متعین کی ہے"۔ اس نے جواب دیا۔

خواجہ عبداللہ خان کی فوج لڑائی کے لئے تیار نہ تھی، وہ ایک بار پھر لاہور سے فرار کے بارے میں سوچنے لگا مگر اس کے لئے بھی وقت چاہئے تھا اور صدیق خاں اس کے دروازے پر کھڑا تھا۔ اس نے پرچہ نویسوں کے سربراہ کو ڈانٹ کر کمرے سے نکال دیا اور فوجی کمانداروں کی فوری حاضری کا حکم دے کر دوڑتا ہوا زنانہ کی طرف چلا گیا۔

ابھی وہ قلعہ جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ خبر ملی یہ فوج وزیراعظم ہند عمادالملک کی دلہن کو لے جانے کے لئے آئی ہے اور خواجہ سرا نسیم خان ان کے نمائندہ کی حیثیت میں فوج کے ساتھ ہیں اور صدیق خاں وزیراعظم اور آدینہ بیگ کے دستوں کے کماندار ہیں۔ خواجہ عبداللہ خاں کو اس اطلاع سے کچھ اطمینان ہوا اس نے وزیراعظم سلطنت مغلیہ کی بارات کے شایانِ شان مہمان نوازی کا اہتمام کرنے کا حکم دے دیا۔

دوپہر تک سارے لاہور میں مغلانی بیگم کی بیٹی کی شادی کی خبر عام ہو چکی تھی، صبح شاہ گنج میں فوج اترنے کی خبر سنی تو شہر کی گلیاں اور بازار سُونے ہو گئے تھے۔ اب اہل لاہور ٹولیوں کی صورت میں شاہ گنج کی طرف رواں تھے۔ شہر کی تاریخ میں پہلی بار شاہجہان آباد سے کسی اتنے بڑے منصب دار کی بارات لاہور آئی تھی۔

شام کو شہر کی ہر محفل اور بیٹھک میں وزیراعظم ہند کی مسلح بارات کی باتیں ہو رہی تھیں۔ "واہ جی کیا شادی ہے، دولہا غائب بارات حاضر۔ نکاح خواں ایجاب و قبول کیسے کرائے گا؟" کسی نے کہا۔

"ایجاب و قبول چھوڑو یہ بتاؤ بارات لاہور قبول کر کے بیٹھ گئی ہے تو کیا ہو گا؟" دوسرے نے پوچھا۔

"اس کی فکر خواجہ عبداللہ خان کو ہو گی ہم کیوں سوچیں"۔ تیسرے نے جواب دیا۔

"حکومت خواجہ عبداللہ کی چکی نہ چولہا"۔ چوتھے نے کہا۔

محفل میں قہقہہ بلند ہوا۔

''چکی اور چولہے کی تو اب مغلانی بیگم کو بھی ضرورت ہوگی''۔

''ہاں بیٹی کو جہیز میں دینا تو ہوں گے اسے چکی اور چولہا بھی''۔

''جی ہاں وزیراعظم کی دلہن چکی ہی پیسے گی، شاہجہان آباد میں مغلوں کی حالت تو سنا ہے پہلے ہی بہت بے بس ہورہی ہے''۔

''بھائی اگر ساس نے پوچھ لیا جہیز میں چکی کیوں نہیں لائی تو بے چاری دلہن کیا جواب دے گی''۔

''اس کی ساس وزیراعظم کی ماں نہ ہوئی ہمارے محلے کی بھٹیارن ہوگئی''۔

''بھٹ جھونکنے سے بھٹیارن نہیں بنتی، ہم نے بڑے بڑے گھروں میں بھٹیارنوں کو حکم اور زبان چلاتے دیکھا ہے''۔

''قمرالدین وزیراعظم ہند کی بیٹی ہوگی، عمدہ بیگم کی ساس''۔

''کوئی بھی ہو ہے تو ساس ہی میں تو مغلانی بیگم کو چکی بھجوا رہا ہوں کہ جہیز میں رکھوا دے کہیں لاہور والوں کی ناک ہی نہ کٹوا دے''۔

''گویا تم خواجہ عبداللہ کی پارٹی سے ہو جو تمہاری چکی بچ گئی''۔

ایک اور قہقہہ بلند ہوا۔

بھرائیوں کی ایک ٹولی ڈھول بجاتی اور بارات کے استقبال کے گیت گاتی قلعہ کی طرف جارہی تھی۔ ایک نوجوان نے آگے بڑھ کر انہیں ویل دی ''یہ لو اور واپس جا کر گھر آرام سے بیٹھو خواجہ عبداللہ کو پتہ چل گیا تو ڈھول اور یہ روپیہ بھی چھین لیں گے''۔

اہل لاہور خواجہ عبداللہ کا مذاق اڑانے کا کوئی موقع ضائع نہیں کرتے تھے۔

اگلی صبح صدیق خان اور نسیم خان ہزاروں فوجی سواروں کے ساتھ شاہ گنج سے مغلانی بیگم کی ذاتی حویلی تک جلوس کی صورت میں آئے اور انہیں سلامی دی۔ نسیم خان نے بیگم کو عمادالملک کا مہر بند مراسلہ پیش کیا۔ مغلانی بیگم نے نسیم خان اور صدیق خان کو خلعت اور سواروں کو ایک ایک ریشمی پٹکا تحفہ میں دیئے۔ نسیم خان نے اجازت چاہی کہ وزیراعظم کی فوج کے دستوں کو حویلی پر ڈیوٹی دینے کی اجازت دی جائے مگر مغلانی بیگم نے ''ابھی اس کا وقت نہیں آیا'' کہہ کر انکار کردیا۔

مغلانی بیگم کو سلام کرنے کے بعد نسیم خان اور صدیق خان امیر لشکر خواجہ عبداللہ خان کی حویلی پر انہیں سلام کرنے کا حاضر ہوئے تو خواجہ نے ان کا نہایت گرم جوشی سے استقبال کیا۔ وہ مغلانی بیگم کا نائب ہونے کے علاوہ ان کے خاندان کا سب سے بزرگ مرد بھی تھا اور سمجھتا تھا کہ اسے شادی میں بھرپور حصہ لینا چاہیے۔ مغلانی بیگم نے لاہور میں موجود اپنے رشتہ داروں اور ترک امراء کو انتظام سے الگ رکھا تھا۔ خواجہ عبداللہ خان ان کے مہمانوں سے نہایت احترام سے پیش آئے اور انہیں خلعت دے کر وداع کیا۔ نسیم خان نے اگلے روز انہیں اپنے کیمپ میں آنے کی دعوت دی۔

خواجہ عبداللہ خان کی پرانی یادیں ابھی تازہ تھیں، جب وہ صدیق خان کے حملہ کے خوف سے اپنی فوج کے ساتھ سندھ کی طرف فرار ہوئے تھے۔ صدیق خان کو بھی وہ وقت یاد آرہا تھا جب جہان خان اور خواجہ عبداللہ خان کی فوجوں کے اچانک نمودار ہو جانے سے وہ نہایت عجلت میں لاہور اور قلعہ خالی کر کے جالندھر کی طرف دوڑنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ جب وہ لاہور پر قابض تھے تو مغلانی بیگم ان کی قیدی تھی اور آج وہ بیگم اور خواجہ عبداللہ خان کے گھروں پر سلام کر کے دونوں سے خلعت پار ہے تھے بیگم اور خواجہ دونوں ان کی مہمان نوازی اور خاطرداری

میں لگے تھے۔

***

راستہ کے دونوں طرف صدیق خان کی فوج کے سوار صف بستہ کھڑے تھے، ان کے ہتھیار اور وردیاں چمک رہی تھیں۔ عمر رسیدہ خواجہ عبداللہ خان منہ زور گھوڑے پر سوار ان کے درمیان سے گزرتے ہوئے سواروں کے سلام کی بجائے ان کے انداز اور ہتھیاروں کا جائزہ لے رہے تھے۔ کیمپ کے قریب پہنچے تو خواجہ سرا نسیم خان کے افسروں نے ان کا استقبال کیا اور اپنے آقا کے خیمے تک لے گئے۔ نسیم خان نے خیمے کے سامنے ان کا استقبال کیا۔ نسیم خان اور صدیق خان کے خیمے ساتھ ساتھ تھے اور ان کے گرد بندوق بردار سپاہی متعین تھے۔ قالینوں سے آراستہ خیمے میں خواجہ عبداللہ خان کو مسند خاص پر بٹھایا گیا اور شاہانہ انداز میں خاطر مدارات کی گئیں۔ خواجہ بظاہر ان سے دوستانہ بات چیت میں مصروف تھا مگر وہ بار بار صدیق خان کی چمکدار آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ صدیق خان کو بھی اس کا احساس تھا اور وہ خواجہ عبداللہ اور اس کے ساتھیوں کو مرعوب کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اپنی فوج کے ہتھیاروں نظم وضبط اور شان وشوکت کے بھرپور مظاہرہ کے ساتھ وہ شعوری طور پر خواجہ پر ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ لاہور سے اس کا فرار اس کے خوف سے نہیں تھا۔ نسیم خان اس پس منظر سے آگاہ تھا اور نہایت دلچسپی سے دونوں کا جائزہ لے رہا تھا۔

''آقا حضور کشور پنجاب کے شیروں کے شکار سے لطف اندوز ہونا چاہتے تھے مگر حضور کی ناراضگی کے خوف سے سرہند میں ہی رک گئے''۔ نسیم خاں نے اپنے مخصوص زنانہ مردانہ انداز میں کہا۔

''ہم اپنے فرزند عمادالملک کا استقبال کر کے دلی خوشی محسوس کرتے''۔ خواجہ عبداللہ خاں نے اس طرح جواب دیا جیسے وہ نسیم خان کے اچانک حملہ کے لئے تیار نہ ہو۔

''ہم تو جانتے ہیں یہ پنجاب کے شیروں اور چیتوں کی خوش بختی تھی جو آقا وہیں رک گئے''۔ نسیم خان نے شیروں اور چیتوں پر زور دیتے ہوئے جواب دیا۔

صدیق خان زیر لب مسکرائے۔

''راوی کے کناروں پر بسنے والے شیر اور چیتے عمادالملک کے جرنیلوں کا استقبال کرنا بھی اپنے لئے اعزاز سمجھیں گے۔ آپ پسند فرماویں تو ہم شکار کا اہتمام کروائے دیتے ہیں''۔ خواجہ عبداللہ خان نے خواجہ سرا کے طنز کے جواب میں پیشکش کی۔

خواجہ عبداللہ کو امید نہ تھی کہ صدیق خان اور نسیم خان شکار کے لئے تیار ہو جائیں گے۔ انہوں نے تکلفاً اور طنزاً ہی شکار کا اہتمام کر دینے کا کہا تھا۔ ''حضور بندوق سے شیر کا شکار کرتے ہیں یا نیزے سے؟'' اس نے نسیم خان پر براہ راست چوٹ کی۔

''جیسا شکار ویسا ہتھیار۔ ہم شیر دیکھ کر ہتھیار کا فیصلہ کرتے ہیں۔ بعض شیروں کو تو صرف ہم اتنا بتا دیتے ہیں کہ ہم عزت مآب عمادالملک وزیراعظم ہند کے خادم ہیں تو وہ سنتے ہی ڈھیر ہو جاتے ہیں''۔ نسیم خان نے اینٹ کا جواب پتھر سے دیا۔

صدیق خان محسوس کرنے لگا تھا کہ بات سفارتی آداب کے دائرہ سے باہر نکلتی جا رہی ہے۔ ''کشور پنجاب میں سکھوں کی سرکشی کا کیا حال ہے؟'' اس نے موضوع بدلنے کو پوچھا۔

''بادشاہ معظم احمد شاہ ابدالی کے حکم کے مطابق ہم سکھوں کو دبانے میں کافی حد تک کامیاب ہو گئے ہیں لیکن ذاتی طور پر میں ابھی تک ان کامیابیوں کو کامیابیاں نہیں کہہ سکتا۔ بادشاہ معظم پنجاب پر بہت توجہ دے رہے ہیں''۔ خواجہ عبداللہ خان نے انہیں یاد دلانے کی کوشش کی

کہ وہ پنجاب میں ابدالی کے امیر عساکر سے بات کر رہے ہیں اور احمد شاہ ابدالی کشور پنجاب کو اپنی سلطنت کا حصہ قرار دے چکے ہیں۔

''ہم حضور کی مزید کامیابیوں کے لئے دعاگو ہیں''۔ نسیم خان کو بھی احساس ہوگیا کہ خواجہ عبداللہ خان امیر عساکر ہیں۔

صدیق خان بات کو شیروں اور سکھوں سے ہٹا کر لاہور کے باغوں اور موسم کی خوبصورتی کی طرف لے جانے لگا تو خواجہ عبداللہ خان نے محسوس کیا کہ اب اسے واپس چلے جانا چاہئے۔

صدیق خان اور نسیم خان کیمپ کے باہر تک انہیں رخصت کرنے آئے۔ ہتھیار بند دستے اب بھی راستہ کے دونوں طرف کھڑے تھے اور صدیق خان بڑے اعتماد سے بات کرتے تھے۔ وہ خواجہ عبداللہ خان کو اپنی قوت اور اعتماد سے مرعوب کرنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔

***

قلعہ کے مستی دروازہ کے سامنے کے وسیع وعریض میدان میں ایک ہجوم جمع تھا۔ نسیم خان اور صدیق خان کی فوج کے سپاہی اور افسر دربار لاہور کے امراء اور اہالیان لاہور سب وہاں موجود تھے۔ جس میدان میں حاکم پنجاب اپنی فوجوں کا معائنہ کیا کرتا تھا اور مہمات پر روانہ ہونے والی فوجوں کو رخصت کیا کرتا تھا، اس میں فوجی اور غیر فوجی حاکم اور امراء حاکمہ پنجاب کی بیٹی کی شادی کے سلسلہ میں چھوڑی جانے والی آتش بازی سے لطف اندوز ہورہے تھے۔ ماگھ کی سردرات میں نیلے آسمان پر سنہری ستاروں کا ہجوم تھا اور زمین پر سے آسمان کی طرف ستارے چھوڑے جارہے تھے۔ شاہجہان آباد کے آتش باز اہل لاہور کو اپنے کمال فن سے آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے دولہا وزیراعظم کے مقام ومرتبہ کی بلندی کا اظہار۔ فضا میں اڑنے والی آتش بازی کے شعلوں اور

> **کامیابی:** یہ یاد رکھنا چاہئے کہ وہ کامیابی جو راتوں رات حاصل کی جاتی ہے وہ صبح سورج طلوع ہونے سے قبل ختم ہوجاتی ہے۔ (خادم حسین مجاہد)

شراروں سے کررہے تھے۔ نسیم خان اور صدیق خان خاص طور پر تیار کردہ بلند نشست پر بیٹھے بہت ہی خوش دکھائی دیتے تھے۔ ''اس بار تو خواجہ عبداللہ خان فوج بھی چھوڑ گئے''۔ ان کے پہلو میں بیٹھے مغلانی بیگم کے نمائندہ غازی بیگ خان بخشی نے کہا۔

''اس کا سبب نسیم خان ہیں، انہوں نے خواجہ عبداللہ خان کو اس قدر ڈرایا کہ وہ فوج بھی چھوڑ کر بھاگ گئے''۔ صدیق خان نے مسکرا کر نسیم خان کی طرف دیکھا۔

''وہ فوج چھوڑ کر نہیں بھاگے فوج انہیں چھوڑ کر بھاگ گئی تھی۔ اس کے بعد ان کے لئے یہاں رہنا ممکن نہ تھا''۔ غازی بیگ خان نے کہا۔

''ہم حیران ہیں کہ جس فوج کے ساتھ وہ پنجاب میں امن قائم کرنا چاہتے تھے وہ ان کے ساتھ کشمیر کی سیاحت پر جانے سے انکاری کیسے ہوگئی؟'' صدیق خان بولے۔

''اصل میں کشمیر میں ان دنوں برفباری ہورہی ہے اور خواجہ کے پاس اتنی فوج کے لئے برفباری کے جوتے اور کپڑے نہیں تھے، وہ فوج کو چھٹی دے کر خود برفباری دیکھنے چلے گئے ہیں۔ آپ اس گمان میں نہ رہیں کہ وہ آپ کے خوف سے بھاگے ہیں''۔ نسیم خان نے طنز کیا۔

''جس فوج کو کئی ماہ سے تنخواہ نہ ملی ہو وہ ایسی مہم میں ساتھ کیوں جائے گی جس کی کامیابی کا امکان ہی نہ ہو''۔ غازی بیگ نے کہا۔

''برف پر چلنے کی مہم میں فوج کی ضرورت بھی تو نہیں ہوتی۔ ڈیڑھ دو درجن ساتھی کافی ہوتے ہیں اور ہم نے سنا ہے اتنے لوگ تو خواجہ محترم کے ساتھ گئے ہیں''

نسیم خان مسلسل مسکرارہے تھے۔

''جن امراء اور سرداروں نے بیگم عالیہ کی شان میں گستاخی کی تھی اور عوام پر ظلم کیا تھا ان کا ساتھ جانا مجبوری تھی''۔ غازی بیگ خان اس کوشش میں تھے کہ نسیم خان کو خواجہ کی انتظامی خامیوں اور مغلانی بیگم کے ساتھ زیادتیوں سے آگاہ کریں۔

''وہ بھی نہ ہوتے تو خواجہ کو یخ بستہ راوی میں کشتی بھی خود ہی چلانا پڑتی''۔ نسیم خان اس کی کسی بات کو سنجیدگی سے نہیں لے رہا تھا۔

''امیر لشکر کے فرار کے بعد لشکر سارا بھاگ گیا یا کچھ بچا بھی ہے''۔ صدیق خان نے غازی بیگ خان سے پوچھا۔

''بیگم عالیہ کے جاں نثار دستے جو مجبوراً خواجہ کے ساتھ تھے اس کے فرار کی خبر سنتے ہی بیگم کے حضور حاضر ہو گئے اور اپنی وفاداری کا اعلان کر دیا''۔ غازی بیگ خان نے بتایا۔

''ان کی تعداد بھی کافی ہو گی تبھی تو بیگم صاحبہ کو بخشی کا عہدہ قائم کرنا پڑا''۔ نسیم خان نے اس پر بھی تیر پھینکا۔

خواجہ عبداللہ خان شاہ گنج سے واپسی کے بعد اسی رات لاہور سے فرار ہو گئے تھے انہیں خوف تھا کہ صدیق خان انہیں گرفتار کر لے گا، ان کے فرار ہونے کے بعد مغلانی بیگم نے پھر سے غازی بیگ کو بخشی کے عہدہ پر بحال کر دیا تھا اور شادی کی تمام تقریبات میں وہی بیگم کی نمائندگی کر رہا تھا۔

مسجدوں میں ''نماز نیند سے بہتر ہے'' کی آوازیں بلند ہوئیں تو آتش بازی ختم کر دی گئی۔ رات بھر جاگنے والے تماشائی کچھ مسجدوں کی طرف چل دیئے اور کچھ نے نیند پوری کرنے کے لئے گھروں کا رخ کیا۔ صدیق خان اور نسیم خان اپنی فوج کے ساتھ شاہ گنج کی طرف روانہ ہو گئے۔

''خواجہ عبداللہ خان کی عقلمندی سے ہمارا کافی بوجھ ہلکا ہو گیا ہے''۔ صدیق خان نے گھوڑا نسیم خان کے قریب لا کر کہا۔

''مگر آپ کے لئے خواجہ کی عقلمندی نقصان کا سبب ہوئی''۔ نسیم خان نے اس کے گھوڑے کے ساتھ گھوڑا چلانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''ہمارا نقصان؟ خواجہ جب بھی بھاگے ہم تو فائدہ میں رہے''۔ صدیق خان نے جواب دیا۔

''ہم تو اپنے آقا کی دلہن کی ڈولی لینے آئے تھے اور خدا کے فضل سے کامیاب جا رہے ہیں۔ حضور خواجہ عبداللہ خان کی ڈولی لینے آئے تھے اور خالی ہاتھ جا رہے ہیں، اس سے بڑا نقصان اور کیا ہو سکتا ہے''۔ نسیم خان نے وضاحت کی۔

''حضور کی برکت سے ہم نے خواجہ کی ڈولی کا بوجھ اٹھائے بغیر ہی حضور کے آقا کی ساس کا اقتدار بحال کر دیا ہے۔ ہم تو اسے بہت بڑی کامیابی تصور کرتے ہیں''۔ صدیق خان نے جواب دیا۔

''خواجہ حضور نے اپنی باتوں اور بے خوفی سے ہمیں تو بہت متاثر کیا تھا۔ آپ کی باتیں سن کر اب ہم ان کی عقلمندی کے بھی قائل ہونے لگے ہیں لیکن ایک بات ہم نہیں سمجھ سکے کہ عقلمند ہوتے ہوئے بھی وہ بے بنیاد حاکمیت کے لالچ میں کیسے آ جاتے ہیں''۔

''عقل اور ہوس جب کسی ایک ہی آدمی سے عقد کر لیں تو اس کے لئے دونوں کے حقوق پورا کرنا لازم ہو جاتا ہے''۔ صدیق خان نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

جب وہ اپنے کیمپ میں گھوڑوں سے اتر رہے تھے تو ان کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔

خواجہ عبداللہ خان کے فرار کی خبر ملتے ہی مغلانی بیگم نے ان کی حویلی پر قبضہ کر لیا تھا اور ان کے حامی امراء اور سرداروں کو اپنے ساتھ ملانے کی کوششیں شروع کر دی

تھیں جو فوجی سردار اور امراء کسی وجہ سے خواجہ کے ساتھ نہیں جا سکے تھے۔ انہوں نے ہوا کا رخ بدلتے دیکھا تو مغلانی بیگم کا اعتماد حاصل کرنے میں لگ گئے اور دو ہی روز میں مغلانی بیگم پھر سے کشور پنجاب کے سیاہ و سفید کی مالک بن گئی۔ احمد شاہ ابدالی کی بجائے وزیر اعظم سلطنت مغلیہ سے مدد طلب کرنے کا ان کا منصوبہ کامیاب رہا تھا۔ وہ جانتی تھیں کہ احمد شاہ ابدالی اس کے شاہجہان آباد کے ساتھ تعلق کو پسند نہیں کریں گے لیکن ان کا ردِعمل کیا ہوگا؟ اس بارے میں سوچنے کے لئے اس کے پاس وقت نہیں تھا۔ بیٹی کی شادی کی مصروفیات اور اس کی روانگی کی تیاریوں میں ایسی باتوں پر غور کی فرصت نہ تھی۔ خواجہ عبداللہ خاں نے جو فوجدار اور منصب دار مقرر کئے گئے تھے، ان کے فرار کی خبر ملتے ہی ان سب نے مغلانی بیگم سے وفاداری کا اعلان کر دیا تھا اور بیگم نے سب امور اور درخواستوں کا فیصلہ شادی سے فارغ ہونے تک ملتوی کر دیا تھا۔

اہلِ لاہور آئے دن کی ان تبدیلیوں اور سازشوں کی وجہ ایسی باتوں سے لاتعلق ہو چکے تھے انہوں نے خواجہ عبداللہ خان کے فرار پر زیادہ خوشی منائی نہ لاہور پر شاہجہان آباد کی فوجوں کے قبضہ کا دکھ محسوس کیا۔ ایک وقت تھا جب سکھوں کی شورش اور لوٹ مار کی خبروں پر وہ بہت دکھ محسوس کیا کرتے تھے لیکن اب جیسے انہوں نے سب کچھ مقدر پر چھوڑ دیا ہو۔ شہر کی گلیوں بازاروں اور محفلوں میں لوگ خواجہ کے فرار یا مغلانی بیگم کے اقتدار کی بحالی کی بجائے شاہجہان آباد والوں کی آتش بازی اور عمدہ بیگم کی شادی کی باتیں کرتے تھے۔

***

لاہور کے چاروں طرف پھیلے باغوں میں موسم بہار نے مضبوطی سے قدم جما لئے تھے۔ نحیف و ناتواں پتوں کی جگہ درختوں میں نئے توانا پتے نکل آئے تھے۔ ہر طرف رنگ رنگ کے پھول سیاسی ابتری سے خوفزدہ اور افسردہ لوگوں کے دل بہلانے کے لئے مسکرا رہے تھے۔ نسیم خان کے کیمپ سے نکل کر ملک سجاول نے گھوڑا ایک چھوٹی سی پگڈنڈی پر ڈال دیا جس کے دونوں طرف ہرے بھرے کھیت لہلہا رہے تھے، اس کے ساتھی سوار خاموش تھے۔ سڑک چھوڑ کر جب اس نے گھوڑے کو پگڈنڈی کی طرف موڑا تو انہوں نے ایک دوسرے کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا تھا اور اپنے گھوڑے موڑ لئے تھے۔ کچھ دور چل کر اس نے گھوڑے کی لگامیں کھینچ لیں تو اس کے ساتھی بھی رک گئے۔ ملک سجاول دور تک پھیلے لہلہاتے کھیتوں کو دیکھ رہا تھا۔

''پنجاب کے کتنے کسانوں کی فصلیں آج اس طرح لہلہا رہی ہوں گی''۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا۔

''سردار جو خبریں سن رہے ہیں ان کے بعد تو یہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ لاہور کے کسان ہی خوش بخت ہیں''۔ ایک نوجوان نے جواب دینا لازم جان کر کہا۔

''ایک وقت تھا جب پنجاب کا ہر کسان اتنا ہی خوش بخت تھا جب وہ شاہجہان آباد میں تھا تو اپنے ساتھی طلباء کو پنجاب کی ہریالی اور خوشحالی کی باتیں بتایا کرتا تھا۔ آج نسیم خان نے مجھ سے وہی سوال کیا تھا جو میں نے ابھی تم سے کیا ہے۔ میں اس کے سوال کا اور کیا جواب دیتا کہ کشور پنجاب میں وہی لوگ خوش بخت ہیں جو بدبخت حکمرانوں کے سایہ میں ہیں امراء بھی اور کسان بھی''۔ اس نے گھوڑے کو ایڑی لگاتے ہوئے بتایا۔

''سردار امراء تو بدبختی کے سایہ میں خوش بخت ہوئے، کسانوں کا کیا جرم ہے''۔ اسی سوار نے پوچھا۔

''کسان بے چارے کا کیا جرم ہو سکتا ہے، جرم ہمیشہ سے حکمران کرتے آئے ہیں، سزا کسان اور عام لوگ بھگتتے رہے ہیں''۔ اس نے جواب دیا۔

"خواجہ سرا نسیم نے کیا جواب دیا تھا؟" دوسرے سوار نے پوچھا۔

"نسیم خان تو خود بدبختی کے سایہ میں ہونے کی وجہ سے خوش بخت ہے، وہ کیا جواب دیتا"۔ ملک نے جواب دیا۔

"سردار ہم خود کہاں ہیں، بدبختی کے سایہ میں یا بدبختوں کا سایہ دراز کرنے والوں میں؟" نوجوان نے ادب سے پوچھا۔

"ہم بدبختوں کے سایہ میں بھی ہیں اور بدبختوں کے سایہ کو دراز کرنے والوں میں بھی"۔ اس نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔

"کیا ہم اس لئے تو بدبختوں کا سایہ دراز کرنے کی کوشش نہیں کر رہے کہ ہم پنجاب کی بدبختی میں اپنی خوش بختی تلاش کر رہے ہیں"۔ ملک قاسم نے اپنے بابا کو مائل بہ جواب دیکھ کر پہلا سوال کیا۔

"شاید یہ بھی درست ہو مگر ہماری کچھ مجبوریاں بھی ہیں۔ ہمارے اجداد جب جمنا کے کنارے چھوڑ کر راوی کے کناروں پر منتقل ہوئے تھے تو اس کا سبب مسلمان حکمرانوں کی حکمرانی کا استحکام تھا"۔

"اگر ہمارے اجداد جمنا کے کنارے سے نہ آئے ہوتے ہمیشہ سے راوی کے کنارے رہ رہے ہوتے تو کیا ہم بھی آج ستلج اور چناب کے کناروں پر بسنے والے قدیم کسانوں کی مانند سکھوں کے ساتھ ہوتے؟"

"اگر ہم مسلمان نہ ہوتے تو شاید ہم بھی آج سکھوں کے ساتھ ہوتے۔ پنجاب کے مسلمان کی مجبوری ہے کہ وہ مسلمان ہونے کی وجہ سے بدبخت اور بدفطرت حکمرانوں کا ساتھ دینے پر مجبور ہے"۔

کھیت ختم ہو گئے تو وہ قلعہ کو جانے والی سڑک پر نکل آئے جس پر سینکڑوں مزدور چھڑکاؤ کرنے میں لگے تھے اور سڑک کی صفائی میں مصروف تھے۔ وہ ہر بدنما نشان مٹا کر اس راستہ کو خوش نما بنانے کی کوشش کر رہے تھے۔ انہوں نے گھوڑوں کی رفتار تیز کر دی، قلعہ کے مستی دروازہ پر محافظوں نے ملک سجاول کو سلام کیا اور خدام ان کے گھوڑے اصطبل کی طرف لے چلے تو وہ مہمان خانہ کی طرف چل دیئے۔ ملک سجاول بہار کی خوشگوار صبح کے سفر کے بعد تھکے سے تھے اور قلعہ کے ایوانوں اور دیوانوں کو ایسے دیکھ رہے تھے جیسے پھر کبھی نہ دیکھنے کو دیکھ رہے ہوں۔

***

شاہی قلعہ کے در و دیوار رنگ و نور میں نہا رہے تھے، خدام سپاہی سردار سب زرق برق لباسوں میں ملبوس فضا میں تیرتے ہوئے معلوم دیتے تھے۔ تمام راستوں کے دونوں طرف اونچے سٹینڈوں پر شمعیں رکھی تھیں جن کے پاس کھڑے خدام ہر گزرنے والے کو جھک جھک کر سلام کر رہے تھے۔ ملک سجاول شیش محل کے دروازہ پر پہنچا تو دربان نے جھک کر سلام کیا، وہ پیغام بھجوا کر وہیں رک گیا اس کے دل پر صبح جس اداسی نے قبضہ کیا تھا رات گئے تک بھی قابض تھی۔ وہ منڈیروں اور دیواروں پر جلتے چراغوں کو دیکھ کر ان اندھیاروں کا تصور کرنے لگا جو اس وقت کشور پنجاب کے کسانوں کے آنگنوں میں خیمہ زن تھے۔ میاں خوش فہم نے جھک کر آداب عرض کیا۔ "بیگم حضور نے بندہ کو حکم دیا ہے کہ وہ آپ کو ان کے حضور پیش کرے"۔

وہ خاموشی سے اس کے ساتھ چلنے لگا۔

شیش محل کے مخملیں حوض میں رنگ برنگ کاغذی کشتیوں میں ننھے ننھے دیئے چمک رہے تھے، خوش لباس کنیزیں سروں پر چمکدار ٹوپیاں پہنے طشتریوں میں موم بتیاں جمائے کھڑی تھیں۔ ایوان میں قطار در قطار روشن دیئے دیواروں کے جسم میں پیوست آئینوں میں ناقابل شمار ہو گئے تھے۔ وہ سر کھپائے میاں خوش فہم کے ساتھ چلتا

رہا اور مغلانی بیگم کی نشست گاہ کے دروازہ پر پہنچ کر رک گیا۔ پردہ کے پیچھے کھڑی کنیز نے بیگم کو ان کی آمد سے آگاہ کیا اور جھک کر اطلاع دی۔ "بیگم حضور نے بندی کو اذن باریابی سے آگاہ کرنے کا حکم دیا ہے"۔

ملک سجاول نے آ کر آداب پیش کیا۔ بیگم نے غیر محسوس مسکراہٹ سے آداب قبول فرمایا اور سامنے کی نشست کی طرف اشارہ کیا۔ ملک سجاول نشست میں بیٹھ چکا تو بیگم نے پوچھا۔ "ہم سمجھتے ہیں نسیم خان پروگرام سے آگاہ ہو چکا ہے"۔

"حضور کے ارشاد کے مطابق تمام تفصیلات انہیں پہنچادی گئی ہیں"۔ ملک نے جواب دیا۔

"انہوں نے اپنا پروگرام بھی آپ کو بتا دیا ہوگا؟" بیگم نے پوچھا۔

"حضور کے احکام کی روشنی میں انہوں نے جو پروگرام ترتیب دیا ہے اس کے مطابق نسیم خان طلوع آفتاب کے بعد حضور کی خدمت میں حاضر ہوگا۔ صدیق خان کی فوج قلعہ سے شالامار باغ تک سڑک کے دونوں طرف سلامی کے لئے حاضر ہوگی شہزادی عالیہ کی ڈولی قلعہ سے برآمد ہوتے ہی وزیراعظم کی فوج کے سردار ڈولی وصول کریں گے"۔

مغلانی بیگم کی آنکھوں میں چمک آ گئی لیکن دوسرے ہی لمحہ اس کی آنکھوں کی چمک ماند پڑنے لگی ملک سجاول نے محسوس کیا شیش محل کی دیواروں میں پیوست آئینوں کے پیچھے چمکنے والے دیوں کی روشنی ماند پڑنے لگی ہے۔

"ہماری خواہش ہے کہ عمادالملک کے کیمپ تک آپ کے سوار بھی ہمارے دستوں کے ساتھ جائیں"۔ بیگم کی آواز مدھم پڑ چکی تھی۔

"حضور کے حکم کی تعمیل ہم پر لازم ہے مگر......"

"اگر آپ ہماری خواہش کے سلسلہ میں "مگر" کا اضافہ نہ کریں تو ہمیں خوشی ہوگی۔ آج میر منو مغفور زندہ ہوتے تو وہ خود اس خواہش کا اظہار کرتے۔ ہماری محرومی کو مجبوری سمجھ لیں"۔ مغلانی بیگم نے ملک کی بات کاٹ دی، اس کی آنکھیں مزید ویران ہو گئی تھیں۔

ملک سجاول نے بیگم کی بوجھل آنکھوں میں جھانک کر سرِ تسلیم خم کر دیا۔

***

عمدہ بیگم کی ڈولی برآمد ہوئی تو نسیم خان اور اس کی فوج نے سلامی دی، چار فوجی سرداروں نے آگے بڑھ کر ڈولی اپنے کندھوں پر اٹھالی اور دونوں طرف صف بستہ سپاہیوں کے درمیان چلنے لگے۔ مغلانی بیگم آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ڈولی کے ساتھ چل رہی تھی۔ اس کے پیچھے ریشمی لباسوں میں ملبوس کنیزیں اور خادمائیں تھیں جن سے ذرا فاصلے پر خواجہ سراؤں کا دستہ تھا۔ امراء، شرفاء، عمال، منصب دار، فوجی سردار اور اہل شہر ڈولی رخصت کرنے والے اور رخصتی دیکھنے والے کھلے میدان میں ہر طرف سر ہی سر تھے، کچھ تنے ہوئے اور کچھ جھکے ہوئے۔ بڑا عجیب منظر بڑھا، بڑی عجیب بارات تھی جس کے ساتھ نہ دولہا تھا نہ دلہن کو رخصت کرنے کے لئے اس کا باپ بھائی اور نہ کوئی چاچا تایا اور ماموں، مغلانی بیگم اور ننھی وقار بیگم کے سوا کوئی رشتہ دار ڈولی وداع کرنے کے وقت موجود نہ تھا۔ تھوڑا آگے جا کر مغلانی بیگم رک گئی اس کی فوج کے تین ہزار سوار قطار باندھے کھڑے تھے جو ڈولی کے ساتھ سرہند تک جا رہے تھے۔ ان سپاہیوں نے ڈولی کو سلامی دی اور ساتھ چلنے لگے۔ دلہن کے ساتھ جانے والی کنیزوں اور خواجہ سراؤں نے جھک کر بیگم کو آداب عرض کیا اور سواریوں کی طرف چل دیئے۔ سب بہت خوش تھے مگر بہت کم چہروں پر حقیقی خوشی تھی۔ مغلانی بیگم واپس مڑی تو نسیم خان اور اس کے دستوں نے ایک بار پھر سلامی دی اور فوجی نظم کے ساتھ چلتے ہوئے دو، ہونے

لگے۔ مغلانی بیگم رک گئی۔ کنیزیں، خادمائیں، خواجہ سرا، امرا، عمال حکام سب نے قدم روک لئے وہ اس وقت تک خاموش کھڑی رہی۔ جب تک ڈولی نظروں سے اوجھل نہیں ہوگئی۔

بیگم کے ملازم ناداروں اور فقراء میں خیرات بانٹ رہے تھے اور وہ سر جھکائے پیدل قلعہ واپس جارہی تھی۔

بیگم کئی سال سے بیٹی کو اس کے گھر رخصت کرنے کے جو خواب دیکھا کرتی تھی وہ پورے ہو گئے تھے مگر خوابوں کی تکمیل پر اس کا دل اور پاؤں کانپنے لگے تھے اور وہ انہیں قابو میں رکھنے کی کوشش کررہی تھی۔

اس شام ملاحوں کی بستی میں بچے، بوڑھے، عورتیں سب کالو کی جھونپڑی کے سامنے جمع تھے، خوشی اور رشک سے کالو کو دیکھ رہے تھے۔ وہ کالو کو مبارکباد دینے آئے تھے جو خوبصورت لباس پہنے ان کے درمیان میں بیٹھا بتا رہا تھا کہ کس طرح وہ ایک ماہ تک شادی کی تیاریوں میں معروف رہا تھا اور اب وہ بیگم کے حکم سے قلعہ میں منتقل ہو رہا ہے جہاں اسے ایک خوبصورت مکان دیا گیا ہے اور اسے سرکاری کشتیوں کے بیڑے کا سربراہ بنادیا گیا ہے۔ کالو اور اس کی بیوی اس رات شہر کے سب سے خوش افراد تھے۔

***

وزیراعظم عمادالملک شاہجہان آباد واپس جانے کی تیاریوں کا حکم دے چکے تھے۔ ان کی دلہن یکم ماگھ کو سرہند پہنچی تھی اور اب ماگھ نصف گزرنے کو تھا۔ وہ دو ماہ سے دارالحکومت سے باہر تھے۔ انہوں نے وہ مقاصد حاصل کرلئے تھے جن کے لئے وہ شاہجہان آباد سے شکار کے بہانے نکلے تھے۔ ان کی دلہن ان کے پاس پہنچ گئی تھی۔ خواجہ عبداللہ خان کے فرار سے ان کی ساس کا اقتدار بحال ہو گیا تھا جن کی مدد کے لئے انہوں نے سید جمیل الدین کو لاہور میں متعین کردیا تھا اور پنجاب ایک بار پھر سلطنتِ مغلیہ کا حصہ بن گیا تھا۔ لاہور میں احمد شاہ ابدالی کا نہ کوئی حامی باقی رہا تھا، نہ نمائندہ۔ مغلانی بیگم اب مغل بادشاہ کی نمائندہ تھی، اب اس کے احمد شاہ ابدالی کو پنجاب آنے کی دعوت دینے اور مدد کے لئے طلب کرنے کا کوئی خطرہ باقی نہ رہا تھا۔ وہ بہت خوش تھا اور دھوم دھام سے فاتحانہ انداز میں شاہجہان آباد میں داخل ہونا چاہتا تھا۔

ایک شام ان کے خیمہ خاص میں انہیں سید جمیل الدین کا مہر بند مراسلہ پہنچایا گیا۔ عمادالملک نے مراسلہ پڑھا تو ان کے چہرے پر پریشانی چھا گئی۔ مراسلہ کے ساتھ مغلانی بیگم کا ایک خط بھی تھا جو انہوں نے احمد شاہ ابدالی کو بھیجا تھا اور سید جمیل الدین کے مخبروں نے پہلی منزل میں خط لے کر جانے والے سواروں کو دبوچ کر ان سے خط چھین لیا تھا۔ مغلانی بیگم نے احمد شاہ ابدالی کو اپنی وفاداری کا یقین دلایا تھا اور خواجہ عبداللہ خان کی زیادتیوں اور فرار کی تفصیلات بیان کر کے لکھا تھا کہ پنجاب اب بھی ابدالی کی سلطنت کا حصہ ہے اور وہ اپنی مجبوریوں اور عمادالملک سے رشتہ کے باوجود اپنے کو قندھار کی نمائندہ سمجھتی ہے اور شاہ قندھار کے حکم کے مطابق پنجاب میں امن وامان بحال کرنے کی پوری کوشش کررہی ہے۔

عمادالملک نے واپسی کا پروگرام ملتوی کر دیا۔

"ہماری فوجوں کی واپسی کو آج دو ہفتے ہی ہوئے ہیں اور بیگم عالیہ نے ہمارے خلاف احمد شاہ ابدالی سے مدد طلب کرلی ہے"۔ اس نے بے چینی سے ٹہلتے ہوئے اپنے آپ سے کہا۔ اس کا دماغ اس کے دل کا ساتھ نہیں دے رہا تھا اس کے دل میں اپنی ممانی اور ساس کا احترام تھا وہ انہیں کسی قسم کی تکلیف نہیں پہنچانا چاہتا تھا اور کوئی ایسا اقدام نہیں کرنا چاہتا تھا جو اس کے لئے جائز نہ ہو۔ دماغ کہتا تھا اگر ممانی کو اپنی مرضی کرنے دی تو پنجاب ہاتھ سے نکل جائے گا اس کی اپنی پوزیشن متاثر ہوگی مخالف کہیں گے کہ ساس کی وجہ سے سلطنت کا مفاد قربان کر

دیا۔

وہ رات بھر غور و فکر کرتا رہا صبح ناشتہ پر اس نے اپنی بیگم سے پوچھا۔ "ہم چاہتے ہیں کہ شاہجہان آباد روانگی سے قبل ممانی حضور کی مہمانداری کا شرف حاصل کریں۔ ہم خود ان کی خدمت میں سلام عرض نہ کر سکے۔ آپ بھی ان کے لئے اداس ہیں اگر ممانی حضور کو چند روز کے لئے یہاں بلوالیں تو مناسب نہ ہوگا"۔

"حضور کا فیصلہ بہت مناسب ہے، ہم اماں حضور کے لئے اداس ہیں"۔ عمدہ بیگم نے جواب دیا۔

"مفسدوں کے فساد اور سکھوں کی سرکشی کے خدشہ کے پیش نظر لاہور کی فوج کا وہاں رہنا لازم ہے"۔ عمادالملک نے اپنے منصوبہ کی وضاحت کی۔ "اس لئے ہم نے مادر محترم کے لئے فوج بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے"۔

"ہمیں حضور کی فراست پر اعتماد ہے"۔ عمدہ بیگم خوش ہوگئی۔

سورج کی دھوپ پھیل چکی تو عمادالملک نے اپنے امراء کو مشورہ کے لئے طلب کیا۔ "کشور پنجاب پر سلطنت مغلیہ کا اقتدار بحال ہو چکا ہے، یقیناً آپ سب خوش ہوں گے مگر ہم چاہتے ہیں واپسی سے پہلے کوئی ایسا نظام قائم کر دیں کہ صوبہ میں امن بحال ہو سکے اور احمد شاہ ابدالی کو پھر سے پنجاب میں خلل اندازی کی جرأت نہ ہو"۔ سب امراء کے اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ جانے کے بعد اس نے کہا مگر سید جمیل الدین کے مراسلہ یا احمد شاہ ابدالی کے نام مغلانی بیگم کے خط کا ذکر نہیں کیا۔

"کشور پنجاب سلطنت مغلیہ کا مغربی حصار ہے اس کا دفاع پوری سلطنت کا دفاع ہے اور اس کی کمزوری سے سلطنت کمزور ہوگی۔ حضور نے بہت مناسب فیصلہ کیا ہے"۔ نثار محمد خاں شیر جنگ نے رائے دی اور اشارتاً پنجاب کے لئے مضبوط حکمران کی ضرورت بھی بیان کر دی۔

ضمیر

سڑک پر لگے اس معلوماتی سائن بورڈ کی طرح ہے جو راستہ اور صحیح سمت تو بتا سکتا ہے لیکن اس پر چلنے کے لئے مجبور نہیں کر سکتا۔ (جواد حیدر۔ تلہ گنگ)

سید جمیل الدین اور نثار محمد خاں آدینہ بیگ کے ساتھ پنجاب کی صوبیداری کے بارے میں خفیہ سمجھوتہ کر چکے تھے۔

"ہم حکیم عباداللہ خان کی رائے جاننا چاہیں گے"۔ عمادالملک حکیم سے مخاطب ہوئے جو ابھی تک خاموش بیٹھے سن رہے تھے۔

"بیگم عالیہ حضور کی ممانی اور خوشدامن بھی ہیں اور نواب عبدالصمد خاں مرحوم اور نواب میر منو مغفور کے خاندان کی عزت اور ناموس بھی ان کا احترام ہم سب پر لازم ہے"۔ حکیم عباداللہ خان نے داڑھی میں انگلیاں پھیرتے ہوئے جواب دیا۔

"حضور کی نگاہ دوررس اور فراست پورے ہندوستان میں مسلم ہے۔ حضور دیکھ چکے ہیں کہ پنجاب میں دوعملی سے حالات خراب ہوئے ہیں۔ حضور اس پہلو کو سامنے رکھ کر جو بھی فیصلہ کریں مناسب ہوگا اور کشور پنجاب اور سلطنت مغلیہ کے لئے مفید ہوگا"۔ نثار محمد خاں شیر جنگ نے حکیم عباداللہ خان کی بات کا اثر محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"مادر محترم کا احترام ہم پر فرض ہے مگر سلطنت کا تحفظ اس سے بھی اہم تر فرض ہے ہم جاننا چاہتے ہیں ان دونوں فرائض کو کس طرح پورا کیا جائے۔ ہمیں آپ کی فراست پر اعتماد ہے اسی لئے آپ کو مشاورت کے لئے جمع کیا ہے"۔ عمادالملک نے پوچھا۔

"حضور اور بیگم صاحبہ کے تعلق کے احترام میں ہم

کچھ کہنے سے قاصر ہیں۔ اگر صرف کشور پنجاب کے تحفظ کا مسئلہ ہوتا تو ہم اپنی رائے دینا فرض سمجھتے''۔ شیر جنگ نے عمادالملک کو بتانے کے لئے کہا کہ اگر بیگم کی وجہ سے پنجاب ہاتھ سے نکل گیا تو الزام ان پر آئے گا۔

''ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ مادر محترم کو اپنے ساتھ شاہجہان آباد لے جائیں وہ اپنی بیٹی اور ہمارے قریب رہیں گی مگر مشکل یہ ہے کہ انہیں آمادہ کیسے کیا جائے۔ اگر کسی طرح وہ ہمارے کیمپ تک آ جائیں تو یہ کام آسان ہوسکتا ہے''۔ عمادالملک نے اپنا ارادہ ظاہر کر دیا۔

''حضور کا فیصلہ ملک اور ملت کے مفاد میں ہے، ہم اس کو سراہے بن نہیں رہ سکتے۔ بیگم عالیہ کے حضور ایک وفد بھیجا جا سکتا ہے جو ان سے عرض کرے کہ آپ کی صاحبزادی شاہجہان آباد روانگی سے پہلے حضور کے درشن کرنا چاہتی ہے۔ بیگم صاحبہ بیٹی کی خواہش پر لازماً سرہند تک آنے پر آمادہ ہو جائیں گی''۔ شیر جنگ نے کسی اور کو بات کرنے کا موقعہ نہیں دیا۔

''ہم یہ بھی فیصلہ کرنا چاہتے ہیں کہ پنجاب کے لئے کون صوبیدار ہو جو مضبوط اور مستحکم حکومت بنا سکے''۔ وزیراعظم نے پوچھا۔

''اس خطہ میں ایک ہی ناظم ایسا ہے جس نے اپنی طاقت اور صلاحیت سب سے منوائی ہے۔ حضور اس پر اعتماد کرنا پسند کریں تو اسے تیار کرنا مشکل نہ ہوگا؟'' شیر جنگ جھٹ سے بول پڑا۔

''پنجاب کی حکومت آدینہ بیگ کی شدید خواہش ہے مگر اس کو پنجاب کا مختار کل بنانا چاہئے یا نہیں اور آدینہ بیگ حضور کی شرائط کہاں تک پوری کرے گا، یہ دیکھنا ہوگا''۔ سعادت یار خان نے رائے دی۔

''ہم چاہتے ہیں کہ آپ تینوں آدینہ بیگ کے پاس ہمارے نمائندوں کے طور پر جائیں اگر وہ پنجاب اور ملتان کی صوبیداری کے عوض تیس لاکھ روپیہ سالانہ دینے پر آمادہ ہو جائے تو ان سے شرائط طے کر لیں۔ مغل بادشاہ کا نمائندہ لاہور میں ان کے نائب کے طور پر مقیم رہے گا۔ شرائط طے ہو جائیں تو شیر جنگ فوج کے ساتھ لاہور روانہ ہو جائیں اور کسی طرح مادر محترم کو آمادہ کر کے ساتھ لے آئیں۔ ہم یہاں منتظر ہوں گے''۔ عمادالملک نے فیصلہ سنا دیا۔ ''سعادت یار خاں اور حکیم صاحب آدینہ بیگ سے مل کر واپس آ جائیں ہم ان شرائط کے مطابق معاہدہ تیار رکھیں گے اور آدینہ بیگ کو نظم سونپ کر شاہجہان آباد چلے جائیں گے''۔

نثار محمد خاں شیر جنگ کی دلی خواہش پوری ہو گئی تھی، اس نے فوراً دایاں ہاتھ سینے پر رکھ کر حکم کی تعمیل کا یقین دلایا۔

اگلے روز شیر جنگ سعادت یار خاں اور حکیم عباداللہ خان ایک دستہ اور دس خواجہ سراؤں کے ساتھ جالندھر روانہ ہو گئے۔

***

لاہور کے گلی کوچوں میں ہر کوئی ایک دوسرے کو ایک ہی خبر سنا رہا تھا۔ ''مغلانی بیگم کو اغوا کر لیا گیا''۔

مغلانی بیگم اور اس کی حکومت نے پنجاب کو امن دیا تھا نہ لاہور کی خوشحالی بحال رہ سکی تھی۔ اس کی وجہ سے مختصر سے عرصہ میں کئی حکمران بدلے، کئی حکومتیں بنیں اور ٹوٹ گئیں، افغان فوجیں کئی بار پنجاب آئیں۔ شروع میں مغلانی بیگم کے لئے جو ہمدردی پائی جاتی تھی وہ ختم ہو چکی تھی۔ اس کے ذاتی کردار کے بارے میں ترک امراء کی حویلیوں سے شروع ہونے والی باتیں گلیوں اور بازاروں تک پہنچ چکی تھیں۔ غازی بیگ خان بخشی کے ساتھ اس کے حسن سلوک کو معنی پہنائے جا رہے تھے۔ محراب و منبر اور درگاہ و مدرسہ میں کہیں بھی اس کی حمایت باقی نہ رہی تھی۔ اس کے اغوا پر لوگوں کو افسوس کم اور حیرانی زیادہ ہوئی۔

"لو بھئی اب تو ہماری حکمران شیش سے اغوا کر لی گئی"۔

"کل کو کوئی ہمیں بھی اغوا نہ کرلے جائے"۔

"جو فوج اور قلعہ کی فصیل کی پناہ میں تھی وہ اغوا کر لی گئی تو ہم کیا ہیں"۔

"تاریخ میں حکمران گرفتار تو ہوتے رہے مگر اغوا کبھی نہ ہوئے تھے"۔

"خاتون جو تھی اغوا ہی ہوسکتی تھی"۔

"اور وہ بھی داماد کے ہاتھوں"۔

"داماد نے اپنی ساس کو اغوا کرلیا؟"

"اغوا کیا نہیں کرایا ہے، آدینہ بیگ کو پیسے دے کر اپنی بے عزتی آپ کروائی"۔

"غازی بیگ خان اغوا کر لیتے تو کوئی بات بھی تھی"۔

"وہ بچ گئے یا وہ بھی اغوا کر لئے گئے؟"

"وہ تو اب خود ہی شہر چھوڑ جائیں گے"۔

"آدینہ بیگ آرہا ہے"۔

"ساس کے اغوا کی داماد اتنی بڑی قیمت دے گا؟"

"کم قیمت پر اتنا بڑا اغوا کون کرتا ہے؟"

"اس کا مطلب ہے آدینہ بیگ مغویہ کو اس کے داماد کے ہاتھ بیچ رہا ہے"۔

"بے چاری مغلانی بیگم آخر بک ہی گئی"۔

شیر جنگ کی قیادت میں آدینہ بیگ کی فوج نہایت برق رفتاری سے لاہور پہنچی تھی اور اسی تیزی سے مغلانی بیگم کو لے کر غائب ہوگئی تھی۔ جالندھر سے لاہور کا فاصلہ صرف چوبیس گھنٹوں میں طے کیا۔ مغلانی بیگم کا کوئی پرچہ نویس اسے جالندھر سے فوجوں کی روانگی کی خبر اس تیزی سے نہیں بھیج سکتا تھا۔

بیگم بیٹی کی شادی اور اقتدار کی بحالی پر خوش تھی اور بے فکر ہو چکی تھی۔ اسے کوئی فوری خطرہ درپیش نہیں تھا۔ اسے یقین تھا کہ احمد شاہ ابدالی اس کی مجبوریوں کو سمجھ کر اسے حاکم بنائے رکھنے پر تیار ہو جائے گا اور جو بھی نائب مقرر کرے گا وہ عمادالملک کی وجہ سے اس سے وہ سلوک نہیں کرے گا جو خواجہ عبداللہ خاں نے کیا تھا۔ اس رات وہ دیر تک امور نظم نپٹاتی رہی تھی، جب آدینہ بیگ کی فوجوں نے اچانک قلعہ پر دھاوا بولا تو وہ گہری نیند سو رہی تھی۔ فصیل اور ڈیوڑھی کے پہرےدار بے فکر تھے، آدینہ بیگ کے سپاہی کمندیں ڈال کر فصیل سے پار اتر گئے اور ڈیوڑھی اور قلعہ کے دروازے کھول دیئے۔ مغلانی بیگم کو جب اطلاع ہوئی تو شیر جنگ کا کماندار شیش محل میں اس کی خواب گاہ کے سامنے بے وقت حاضری کی درخواست لئے کھڑا تھا۔

کنیز کو بے وقت خواب گاہ میں بلا اجازت داخل ہوتے دیکھ کر بیگم نے غصہ سے کہا۔ "ہماری نرمی نے تمہیں کڑی سزا کا حقدار بنادیا ہے"۔

"حضور بے وقت مداخلت کے لئے جو سزا تجویز فرمادیں بندی کو قبول ہے۔ میاں خوش فہم اور دیگر ملازمین حملہ آوروں کی حراست میں ہیں اور وہ حاضری کی درخواست لئے دروازے پر کھڑے ہیں"۔ کنیز نے کانپتے ہوئے بتایا۔

"کون حملہ آور؟" مغلانی بیگم نے بدحواسی سے پوچھا اس کے گمان میں بھی نہ تھا کہ آدینہ بیگ یا عمادالملک کے فوجیوں نے قلعہ پر قبضہ کرلیا ہے اس کا پہلا خدشہ سکھوں کے شب خون کے بارے میں تھا۔

"حضور وہ کہتے ہیں کہ سرہند سے آئے ہیں اور حضور وزیراعظم نے بھیجا ہے"۔ کنیز نے اطلاع دی۔

مغلانی بیگم کا خوف کچھ کم ہوگیا مگر کیا عمادالملک ایسی حرکت کرسکتا ہے؟ اسے سمجھ نہیں آرہا تھا۔ "انہیں کہو ہم آرام فرمارہے ہیں، دن کے وقت حاضری کے لئے بلائیں گے"۔ اس نے بے فکری ظاہر کرنے کی کوشش

کی۔

کنیز آداب بجا لا کر باہر نکل گئی، وہ بے چینی میں بستر میں بیٹھ گئی۔ ابھی وہ صورتِ حال پر غور کرنے کی کوشش ہی کر رہی تھی کہ کنیز کانپتی ہوئی واپس آ گئی۔

''حضور وہ کہتے ہیں ابھی اور اسی لمحہ وہ حاضر ہونا چاہتے ہیں۔ حضور نے اجازت نہ دی تو وہ بلا اجازت اندر آ جائیں گے''۔ وہ رونے لگی۔

''ہمارے جوتے سیدھے کرو اور شمع جلاؤ''۔ اس نے حالات کی سنگینی کا احساس کرتے ہوئے حکم دیا۔ ''ہمارا لباس تیار کرو اور انہیں بتاؤ کہ ہم ابھی طلب فرماتے ہیں''۔

کنیز نے جلدی سے جوتے سیدھے کئے، شمع کی بتی تیز کی اور بھاگتی ہوئی باہر نکل گئی۔ مغلانی بیگم نے حاکمانہ لباس زیب تن کیا، نشست گاہ میں شمعدان روشن کروائے اور درخواست بدست کو وہاں پیش کرنے کا حکم دیا۔ عمادالملک کے بھیجے خواجہ سراؤں کا کماندار اندر آیا۔ فرشی سلام کر کے وزیراعظم عمادالملک اور ان کی بیگم صاحبہ کی طرف سے سلام عرض کیا اور درخواست کی۔ ''حضور جلد تیار ہو جائیں ہمیں ابھی سرہند روانہ ہونا ہے''۔

''اگر ہم تیار نہ ہوں تو؟'' اس نے درخواست گزار کے عزم کا جائزہ لینے کو پوچھا۔

''تو پھر ہمیں اپنے آقا کے حکم کی تعمیل کرنا ہوگی اور حضور کو اسی طرح پالکی میں بٹھا کر لے جانا پڑے گا''۔ خواجہ سرا نے نہایت ادب سے بے ادبی کا مظاہرہ کیا۔

''تم جانتے ہو اس کا انجام کیا ہو گا؟'' بیگم نے دھمکی آمیز انداز میں کہا۔

''حضور! اس کا انجام تو وزیراعظم ہی جانتے ہوں گے، بندہ تو یہ جانتا ہے کہ اگر ہم سے حضور کو فوری قلعہ سے باہر لے جانے میں کوتاہی ہوئی تو ہمارے لئے اس کا انجام اچھا نہیں ہو گا''۔

مغلانی بیگم اس کے انداز اور جواب کا مطلب سمجھ گئی۔

''پالکی بردار دروازے پر حاضر ہیں، حضور کے ملازمین اور خدام صبح ضروری سامان کے ساتھ ہمارے کیمپ پہنچ جائیں گے''۔ خواجہ سرا نے جھک کر عرض کیا۔

مغلانی بیگم وقار سے اٹھی اور ''تم باہر انتظار کرو'' کہہ کر خواب گاہ میں چلی گئی۔ وقار بیگم کو بلوایا۔ ''جانِ مادر! ہم آپ کی ہمشیر کے پاس جا رہے ہیں انہوں نے دستہ بھیجا ہے، لباس تبدیل کر لو''۔

ننھی وقار بیگم نے اس بے وقت بیداری اور تیاری کے حکم پر سوالیہ نگاہوں سے ماں کی طرف دیکھا تو اس نے آگے بڑھ کر بیٹی کو سینے سے لگایا اور پیشانی چوم کر مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''عمدہ بیگم شاہجہان آباد جانے والی ہے اور بے وقت پیغام ملا ہے''۔

پھر اس نے خادمہ کو بلا کر مختصر سامان سفر باندھنے کا حکم دیا اور خود کمرے میں ٹہلنے لگی۔ جب اہل لاہور بیدار ہوئے تو ان کی حاکمہ آرام دہ پالکی میں سوار فوج کی نگرانی میں قلعہ سے کئی میل دور پہنچ چکی تھی۔

***

عمادالملک کے امراء مشیر اور فوجی سردار کیمپ سے باہر قطاریں باندھے کھڑے تھے۔ ان سے آگے فوج سلامی کے لئے صف بستہ تھی۔ خود عمادالملک ایک دستہ کے ہمراہ کیمپ سے دو کوس باہر کھڑے تھے۔ جیسے ہی مغلانی بیگم کا ہاتھی قریب پہنچا عمادالملک نے گھوڑے سے اتر کر استقبال کیا اور فوجوں نے سلامی پیش کی۔

فوج کی قطاروں کے درمیان سے گزرتا ہوا ہاتھی امراء کی قطاروں تک پہنچا تو وہ بھی سلامی کے لئے جھک گئے۔ عمادالملک آگے آگے چل رہا تھا۔ کیمپ میں پہنچ کر امراء اور درباری خیمہ بستی کے دیوان خاص کی طرف چلے گئے اور عمادالملک بیگم کی پالکی کے ساتھ زنان خانہ کی

طرف چل دیا۔ خواجہ سرا آراستہ خیمے میں پالکی رکھ کر سلام عرض کر کے رخصت ہو گئے۔ کنیزوں نے پالکی کا پردہ ہٹا دیا۔ عمدہ بیگم سلام کے لئے جھکی تو مغلانی بیگم نے اس کی پیشانی چوم لی۔ وقار بیگم بہن سے لپٹ گئی۔ دو ہفتے کی جدائی کے بعد وہ تینوں ماں بیٹیاں ایک بار پھر ایک دوسری سے مل رہی تھیں مگر اب انداز مختلف تھا۔ عمدہ بیگم کے چہرے پر خوشیوں کے قافلے اتر آئے تھے جبکہ مغلانی بیگم بہت سنجیدہ تھی۔ عمادالملک نے اشارہ کیا تو عمدہ بیگم وقار بیگم کا ہاتھ پکڑ کر دوسرے خیمے میں چلی گئی۔

''مادر مکرم! ہم حضور کو اپنے درمیان پا کر بہت شاداں ہیں۔ ہماری خوش بختی کہ حضور نے ہمارے لئے سفر کی تکلیف گوارا فرمائی''۔ عمادالملک نے کہا۔ ''ہمیں امید ہے کہ حضور کا سفر آرام دہ رہا ہوگا۔ خدام سے کوئی گستاخی ہوئی ہو تو ہم ذاتی طور پر معافی کے خواستگار ہیں''۔

مغلانی بیگم نے تمام سفر نہایت پُر وقار طریقہ سے مکمل کیا تھا اور کسی مرحلہ پر یہ تاثر نہیں دیا تھا کہ وہ ایک مجبور قیدی ہے۔ عمادالملک کی بات سن کر اس کی برداشت کے بند ٹوٹ گئے۔ ''ہمیں افسوس ہے کہ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ تم ہمارے فرزند نہیں لیکن تم نے ہمارے ساتھ جو سلوک کیا وہ کوئی بیٹا اپنی ماں سے نہیں کر سکتا۔ تم نے نہ ہمارے مرتبہ کا خیال کیا نہ اپنے خاندان کی عزت کا۔ تمہاری سازش کی سزا تمہارے سارے مشیروں کو بھگتنا پڑے گی، ہم یہ توہین برداشت نہیں کر سکتے''۔

''عمدہ بیگم حضور سے الگ ہو کر اداس تھیں اور ہم انہیں اداس نہ دیکھ سکے۔ اس لئے اس سفر کی زحمت دینا پڑی۔ ہم اس گستاخی کے لئے معذرت خواہ ہیں''۔ عمادالملک نے مغلانی بیگم کی ڈانٹ کے باوجود نہایت ادب سے عرض کیا۔

''احمد شاہ ابدالی ہماری توہین اور تمہاری گستاخی کبھی معاف نہیں کرے گا۔ میں تمہیں سازش کا مشورہ دینے والے امراء کی عزت خاک میں ملا دوں گی اور ان کے گھروں کے چولہوں میں پانی ڈال دوں گی۔ تمہارے اس اقدام کی سزا تمہاری سلطنت اور بادشاہ کو بھگتنا پڑے گی۔ اس کے حرم کی خواتین کی اسی طرح توہین کراؤں گی جس طرح تم نے میری بے عزتی کرائی ہے''۔ بیگم نے غصہ سے کہا۔

''اگر کسی خادم نے حضور کی شان میں کوئی گستاخی کی ہے تو ہم اس کی چمڑی اتروا دیں گے۔ ہم نے تو یہ درخواست حضور کی بھلائی اور عمدہ بیگم کی خوشی کی خاطر کی تھی''۔ عمادالملک نے جواب دیا۔

''ہمیں دکھ ہے کہ ہمارا بیٹا ہمیں بھی احمق سمجھتا ہے۔ بہت جلد پتہ چل جائے گا احمق کون ہے''۔

''ہم سمجھتے ہیں کہ عمدہ بیگم کی خوشی اسی میں ہے کہ حضور اس کے ساتھ رہیں اور ہمیں اپنے قیمتی مشوروں سے نوازیں۔ ہم دست بستہ اس جرأت گستاخی پر معافی چاہتے ہیں''۔ وزیراعظم سلطنت مغلیہ نے مغلانی بیگم کے سامنے ہاتھ باندھ دیئے۔

جب اسے معلوم ہوا کہ شیر جنگ نے مغلانی بیگم کو کس طرح زبردستی اغوا کرایا تھا تو اس نے اسے خوب ڈانٹا اور اس رویہ پر اس سے باز پُرس کی۔

مغلانی بیگم کا خزانہ، گھریلو سامان اور سب لوازمات سید جمیل الدین نے گھوڑوں اور ہاتھیوں پر لاد کر سرہند بھجوا دیئے، بیگم کے خدام اور کنیزیں اپنے اپنے اہل و عیال اور سامان کے ساتھ سرہند پہنچ گئے تو وزیراعظم عمادالملک بہت خوش ہوئے، ان کی شکار کی مہم ان کی توقع سے بہت زیادہ کامیاب رہی تھی۔

***

پوہ کا تیسرا ہفتہ ختم ہونے کو تھا، آسمان پر چھائے سیاہ بادل زمین کو چھونے کی کوشش میں تھے، ہوا کے مزاج

سے اندازہ ہوتا تھا کہ شمال میں بارشیں وافر ہو رہی ہیں۔ مغلانی بیگم کو لاہور سے آئے آٹھ ماہ ہو رہے تھے، عمادالملک نے انہیں ہر قسم کی سہولتیں فراہم کر رکھی تھیں۔ ان کے ساتھ آنے والے ملازمین کے خاندانوں کو اجمیری دروازہ سے باہر غازی خان کے مدرسہ کے قریب ایک شاندار حویلی میں آباد کر کے سب کے وظائف مقرر کر دیئے تھے لیکن اس چھوٹی سی ذاتی ریاست کی حکمرانی سے پنجاب اور لاہور کی حکمرانی کی کمی پوری نہیں ہو سکتی تھی۔ بیگم گزرے وقتوں اور لاہور کی یادیں تازہ کرنے کے بہانے ڈھونڈتی رہتی تھی۔

''رات سے ہوا لاہور میں بارش کا پیغام دے رہی ہے''۔ آتشدان کے سامنے لگی مسند پر بیٹھی بیگم نے گل بنفشہ سے کہا جو پاس مؤدب کھڑی تھی۔

''حضور نے بجا فرمایا اُدھر بادل اتنے قریب ہوں تو بارش لازماً ہو جاتی ہے، یہاں کے بادلوں کا بھی کوئی بھروسہ نہیں''۔ گل بنفشہ نے بیگم کی تائید کی۔

''اس مہینے بارش سے پنجاب میں گندم کی فصل اچھی ہوتی ہے، کسان خوشحال ہو جاتے ہیں''۔

''حضور کے کسانوں کی خوشحالی سے راوی میں کشتی چلانے والے ملاحوں کے بھی دن پھر جاتے تھے۔ جب وہ رات کے پچھلے پہر گیت گاتے تھے تو بہت بھلے معلوم ہوتے تھے۔ کتنے میٹھے ہوتے تھے راوی کے ملاحوں کے گیت؟'' گل بنفشہ بھی بیتے دنوں کی یاد میں گم ہو گئی۔

''تمہیں ان ملاحوں کا کوئی گیت یاد ہے؟''

''نہیں، حضور! یاد تو نہیں بس کانوں میں ان کی مٹھاس باقی ہے''۔

''کاش! ہمارے لئے کوئی راوی کے گیت گا سکے''۔ مغلانی بیگم بے دھیانی میں اپنے احساسات چھپا نہ سکی۔

''بندی کو گستاخی کے لئے معاف فرمایا جائے۔ یہاں کے لوگ ہمارے لوگوں جیسے ہیں نہ یہاں کے نواب معظم ہمارے نواب مغفور کی طرح ہیں''۔ گل بنفشہ نے معصومیت میں ایسا تیر اچھوڑا جو مغلانی بیگم کے سینے سے پار نکل گیا۔

وہ کافی دیر خاموش بیٹھی آتشدان میں سلگتے کوئلوں اور ایک دوسرے سے دست و گریباں ہوتے شعلوں کو دیکھتی رہی، گل بنفشہ نے محسوس کیا کہ اسے ایسا نہیں کہنا چاہئے تھا۔

''کالو کتنا اچھا ملاح تھا، اس نے حضور کے لئے وہ کام کئے جو نمک حرام ترک نواب بھی نہ کر سکے''۔ گل بنفشہ نے بیگم کو سوچ میں گم دیکھ کر کہا۔

''لاہور کی مٹی میں وفا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں ملک سجاول نے ہمارے لئے جو کچھ کیا خون کے تعلق دار بھی نہ کر سکے''۔ بیگم مسلسل شعلوں میں کچھ تلاش کر رہی تھی۔

پردے کے پیچھے سے خادمہ نے اذنِ باریابی چاہا اور اطلاع دی کہ میاں خوش فہم کوئی اہم خبر پہنچانا چاہتے ہیں۔ بیگم نے گل بنفشہ کی طرف دیکھا وہ آداب کر کے جانے کے لئے مڑی تو بیگم نے حکم دیا۔ ''ہم سمجھتے ہیں کوئی معمولی خبر ہے''۔ اس نے گل بنفشہ کو روک لیا۔ ''تمہاری حاضری لازم ہے''۔

میاں خوش فہم کمرے میں داخل ہوتے ہی آداب کے لئے جھک گیا۔

''ہمارے لئے یہاں کی کوئی خبر اہم نہیں''۔ اس کے عرض کرنے سے پہلے ہی بیگم نے کہا۔

''حضور کا ارشاد بجا ہے، بندہ یہ اطلاع دینے آیا تھا کہ یہاں والے کسی دشمن کے حملہ سے پریشان ہیں''۔ خوش فہم نے دست بستہ اطلاع دی۔

''یہاں کے امراء سے بڑا شاہجہان آباد والوں کا کوئی دشمن نہیں، ان کی پریشانی پر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں''۔

"عاقل خان بتاتا ہے کہ چاندنی چوک سے لوگ ایسے بھاگ رہے ہیں جیسے دشمن کے حملہ کے وقت بھاگا کرتے ہیں، اس پردیس میں ہمیں حضور......"

"ہمیں فکر کی ضرورت نہیں"۔ بیگم نے اس کی بات کاٹ دی۔ "شاہجہان آباد والے جانیں اور ان کا دشمن"۔

میاں خوش فہم سلام کر کے کمرے سے باہر نکل گیا۔ گل بنفشہ نے محسوس کیا کہ شاہجہان آباد والوں کی پریشانی کی اطلاع سے بیگم کی آنکھوں میں چمک آ گئی ہے۔

***

دم توڑتی مغلیہ سلطنت کا نوجوان وزیراعظم غازی الدین عمادالملک بے چینی سے اپنے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ وہ اپنے اجداد کی خدمت کے سہارے سلطنت کا وزیراعظم بنا تھا اور اس سلطنت اور اپنے منصب کو بچانے کی جدوجہد کر رہا تھا لیکن بیرونی حملہ آوروں سے زیادہ دربار شاہی کے امراء سلطنت کے لئے خطرہ بن گئے تھے۔ وہ ایک محاذ پر آگے بڑھتا تو دوسرے پر پسپائی اختیار کرنا پڑتی۔ امراء کا ایک بڑا طبقہ ان ساری ناکامیوں کا ذمہ دارا سے ٹھہراتا تھا اور اسے وزارت عظمٰی کے منصب سے علیحدہ کرانے کی سازشوں میں مصروف رہتا تھا۔ پنجاب پر قبضہ سے اس کی ساکھ کچھ بحال ہوئی تھی اور اس نے فوج کی تنظیم کی طرف توجہ دینا شروع کیا تھا کہ اس کی یہ کامیابی نئی پسپائیوں کا پیش خیمہ بنتی نظر آنے لگی۔

"امرائے دربار اور وزرائے کرام دیوان میں حضور کے ورود کے منتظر ہیں"۔ خادم نے سلام کے بعد اطلاع دی۔

"امراء کو ہماری آمد کے ارادہ کی اطلاع دی جائے"۔ عمادالملک نے اس کی طرف دیکھے بغیر حکم دیا۔

خادم سلام کر کے الٹے قدموں کمرے سے باہر نکل گیا اس کے جاتے ہی پردہ ہٹا اور سنہری وردیوں میں ملبوس خدام خاص کمرے میں داخل ہوئے اور سلام کر کے خاموش کھڑے ہو گئے۔ عمادالملک آہستہ آہستہ ان کی طرف بڑھا۔ ایک خادم نے پردہ ہٹایا اور وہ ان کے پیچھے چلتا ہوا اس دیوان کی طرف چل دیا جہاں امراء اور وزراء اس کی آمد کے انتظار میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ وہ سب مؤدب کھڑے ہو گئے۔ وزیراعظم آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اپنی مخصوص نشست تک پہنچے اور سب کو تشریف رکھنے کا اشارہ کر کے مسند پر تکیہ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔

خدام ایوان سے باہر چلے گئے۔

"مغلیہ سلطنت کے وجود اور وقار کے تحفظ میں آپ سب نے ہمیشہ قابل فخر روایات قائم کی ہیں"۔ عمادالملک نے امرائے دربار سے مخاطب ہو کر کہا۔ "آپ کی دانائی اور مشورے ہماری قوت ہیں، ہم امید کرتے ہیں کہ اس مشکل آزمائش میں بھی آپ ہماری رہنمائی فرمادیں گے اور شہنشاہ معظم کے وقار اور عظمت کے تحفظ میں اپنی روایات کو مستحکم فرمادیں گے۔ سلطنت کی جنوبی اور مشرقی ریاستوں کے مخصوص حالات کی وجہ سے ہم احمد شاہ ابدالی سے جنگ نہیں کرنا چاہتے تھے اسی لئے ہم نے آغا علی رضا خاں کو ان کے پاس بھیجا تھا کہ وہ انہیں قندھار واپسی پر آمادہ کریں۔ ہمیں آغا کی دانائی اور وفا شعاری پر ہمیشہ فخر رہا ہے۔ احمد شاہ ابدالی نے واپسی کے لئے جو شرائط پیش کی ہیں ہم سمجھتے ہیں وہ شہنشاہ معظم اور ان کے خاندان کے وقار کے منافی ہیں۔ ہم اس بارے میں آپ سے رہنمائی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ آغا علی رضا خاں آپ کو بادشاہ قندھار سے ملاقات اور ان کی شرائط سے خود آگاہ فرمادیں ہم امید کرتے ہیں کہ آپ ان شرائط پر غور کر کے بہتر تدابیر سے نوازیں گے"۔

"سلطنت مغلیہ اور تاج شہنشاہی کے جاں نثار

وزیراعظم ہند غازی الدین عمادالملک کی ہدایت پر بندہ شاہ کابل وقندھار کی لشکرگاہ میں حاضر ہوا''۔ آغا علی رضا خاں نے بات شروع کی۔ ''اور اکیس روز تک افغان لشکر کے ہم رکاب رہا۔ اس سفر کے دوران میں شرف باریابی کی دخواست دہراتا رہا آخر بائیسویں روز مجھے احمد شاہ ابدالی کے روبرو پیش کیا گیا۔ میں نے اپنی ہمت اور دانش کے مطابق احمد شاہ ابدالی کو شاہجہان آباد پر حملہ سے باز رہنے کی ترغیب دی اور ان کی واپسی کی شرائط میں نرمی کی بہت کوشش کی مگر افسوس سے بتانا پڑ رہا ہے کہ احمد شاہ ابدالی کی پیش کردہ شرائط خاندان تیموری کی عزت ووقار اور سلطنتِ مغلیہ کے نمک خواروں کی شان کے خلاف ہیں اور ابدالی ان میں نرمی پر آمادہ نہیں''۔ وہ اتنا کہہ کر رک گیا۔

عمادالملک نے درباریوں کی طرف دیکھا وہ سب خاموشی سے آغا علی رضا خان کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''ہمیں دکھ اور افسوس کے ساتھ احمد شاہ ابدالی کی توہین آمیز شرائط آپ کے سامنے پیش کرنا پڑ رہی ہیں کہ اس کے بغیر چارہ نہیں ورنہ غیرت یہ بات زبان پر لانے کی اجازت نہیں دیتی کہ بادشاہ کابل وقندھار نے حملہ سے باز رہنے اور واپس جانے کے لئے دو کروڑ روپیہ زر نقد سرہند سے مغرب کے سلطنت مغلیہ کا حصہ پنجاب ملتان اور کشمیر کے علاوہ مغل شہنشاہ کی صاحبزادی کے رشتہ کا بھی مطالبہ کیا ہے اور لاہور پر قبضہ کے لئے تحریری معافی مانگنے کی شرط رکھی ہے''۔

''ہمیں یہ کہنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی کہ ہم خاندان تیموری کی عزت اور وقار کے منافی کوئی مطالبہ ماننے کے حق میں نہیں''۔ آغا علی رضا خاں کی بات ختم ہوتے ہی ایک امیر نے بلند آواز میں کہا۔

''ہم جاننا چاہتے ہیں کہ شاہ قندھار کو اتنی توہین آمیز شرائط پیش کرنے کی جرأت کیسے ہوئی؟'' دوسرا امیر بولا۔

''خاندان تیموری کے نمک خواروں کی رگوں میں غیرت کا خون ابھی خشک نہیں ہوا۔ شاہ قندھار نے ہماری غیرت اور قوت کا غلط اندازہ کیا ہے''۔ ایک اور آواز گونجی۔

''شاہ قندھار کی لشکرگاہ میں طویل قیام کے دوران ہمیں معلوم ہوا ہے کہ شاہجہان آباد کے بعض امراء اور علماء نے انہیں شاہجہان آباد پر حملہ کی دعوت دی ہے۔ ان کے پاس ان اہم لوگوں کے مراسلے بھی پہنچے ہیں۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ یہ توہین آمیز شرائط شاہجہان آباد پر حملہ کا جواز پیدا کرنے کے لئے پیش کی گئی ہیں''۔ آغا علی رضا خاں نے مداخلت کی۔

''ہم اس ذلت اور رسوائی کے معاہدہ میں شریک نہیں ہو سکتے، وزیراعظم جو پسند فرماویں فیصلہ کریں''۔ ایک امیر نے غصہ سے کہا۔

عمادالملک خاموش بیٹھا امراء کا ردعمل دیکھ رہا تھا، امرائے دربار نے صورتِ حال پر سنجیدگی سے غور کرنے کی بجائے اتنے اہم مسئلہ پر جس جذباتی انداز میں بات شروع کی تھی وہ اس کی توقع کے خلاف تھا۔

''ہم سمجھتے ہیں احمد شاہ ابدالی شہنشاہ ہند کی دختر کا رشتہ مانگ کر اپنی اس توہین کا بدلہ لینا چاہتے ہیں جو ہم نے ان کی منہ بولی بیٹی کو اغوا کر کے کی ہے۔ ان توہین آمیز شرائط اور ابدالی کے حملہ کے ذمہ دار وہ لوگ ہیں جنہوں نے حاکمہ پنجاب کو اغوا کرنے کا مشورہ دیا اور احمد شاہ ابدالی کی غیرت اور قوت کا غلط اندازہ لگایا''۔ ایک امیر نے اس کی ذمہ داری عمادالملک پر ڈال دی۔

عمادالملک خاموش بیٹھا پیچ وتاب کھا رہا تھا اگر احمد شاہ ابدالی کی فوجیں شاہجہان آباد کی طرف بڑھ نہ رہی ہوتیں تو ان امراء کو ایسی بات کی جرأت نہ ہو سکتی تھی۔

''ہم نے خود احمد شاہ ابدالی کو حملہ کی دعوت دی ہے

لاہور پر قبضہ اور حاکمہ لاہور کے اغوا کے وقت ہم دور اندیشی کا ثبوت نہ دے سکے۔ اب بھی جو کوئی سمجھتا ہے کہ ابدالی واپس چلا جائے گا اور شاہجہان آباد پر حملہ سے باز رہے گا، اس کی دانش قابل بھروسہ نہیں"۔ عمادالملک پر ایک اور تیر پھینکا گیا۔

"ہم سمجھتے ہیں دانایان دربار کو اس مشکل سے نکلنے کی تدبیر کرنا چاہئے۔ سلطنت مغلیہ کا وجود اور عظمت ہی خطرہ میں نہیں دوبار مغلیہ کے امراء اور وابستگان کا اپنا وقار اور نام و ناموس بھی محفوظ نہیں رہیں گے۔ احمد شاہ ابدالی کس لئے آیا ہے اور یہ غلطی کس نے کی ہے فی الحال اس بحث کو مناسب وقت کے لئے اٹھا رکھیں۔ اہالیانِ شاہجہان آباد سخت سراسیمہ ہیں۔ لوگ خوف کے مارے شہر سے بھاگ رہے ہیں امرائے دربار کو شہنشاہ معظم کے علاوہ انہیں بھی تحفظ کا یقین دلانا ہے"۔ آغا علی رضا خاں نے بحث کا رخ بدلنے کی کوشش کی۔

عمادالملک کے حامی امراء اور وزراء کے لئے اس کا دفاع کرنا بہت مشکل ہو رہا تھا۔ احمد شاہ ابدالی کے ہراول دستوں کے پانی پت تک پہنچ جانے اور اس کی طرف سے توہین آمیز شرائط کے بعد اس دلیل میں کوئی وزن نہیں رہ گیا تھا کہ سلطنت اور شہنشاہ سے وفاداری میں عمادالملک نے اپنی ممانی اور خوشدامن کو اغوا کرانے کی ذلت بھی گوارا کی تھی۔ مخالف امراء کو اندازہ ہو گیا تھا کہ ابدالی کسی صورت واپس نہیں جائے گا۔ اس لئے وہ ان توہین آمیز شرائط حملہ اور انجام کی ساری ذمہ داری وزیر اعظم اور اس کے حامیوں پر ڈالنا اور عمادالملک سے ساری رنجشوں اور رقابتوں کا حساب چکانا چاہتے تھے وہ اس کی مجبوریوں اور کمزوریوں سے آگاہ تھے اور جانتے تھے کہ وہ ان کے خلاف کسی کارروائی کے قابل نہیں۔

***

حضرت نظام الدین اولیاء کی درگاہ پر محفل سماع جاری تھی ایک درویش نے "حق...... حق...... حق" پکارتے ہوئے والہانہ رقص شروع کیا تو باقی درویش بھی رقص میں شامل ہو گئے اور فضا "حق...... حق...... حق" سے گونجنے لگی۔ رات کا جوبن ڈھل چکا تھا۔ عروس البلاد شاہجہان آباد سیاہ لحاف اوڑھے کروٹیں بدل رہا تھا اور درویش حق...... حق...... حق کے نعرے لگا رہے تھے اور والہانہ رقص میں مست تھے۔ انہیں احمد شاہ ابدالی کی فوجوں کی آمد کی کوئی فکر تھی اور نہ مغل شہنشاہ اور اس کے امیر الامراء کی پریشانیوں سے کوئی واسطہ تھا۔ اہل شہر کے فرار اور بے چینی سے بے نیاز وہ دیوانہ وار "حق...... حق...... حق" پکار رہے تھے۔

"آنے والا آئے گا جانے والا جائے گا، حق سدا رہتا ہے حق سدا رہے گا"۔ ایک درویش نے کہا اور باقی درویش بھی "حق سدا رہا ہے حق سدا رہے گا، حق سدا رہا ہے حق سدا رہے گا" کے نعرے لگانے لگے۔

عمادالملک اور ان کے ساتھیوں نے محفل کا رنگ دیکھا تو راستہ بدل کر مزار کی طرف نکل گئے۔ جب وہ شاہ قندھار کی فوجوں سے مغلیہ سلطنت شہنشاہ اور اہل شہر کے تحفظ کی دعاؤں سے فارغ ہو کر واپس لوٹے تو درویش اس وقت بھی محو رقص تھے۔ قوال امیر خسرو کی نئی غزل گانے لگے تھے مگر درویش اب بھی "آنے والا آئے گا جانے والا جائے گا حق سدا رہا ہے حق سدا رہے گا" کے نعرے لگا رہے تھے۔

ساتھیوں نے عمادالملک کے چہرے کی طرف دیکھا اور نظریں جھکا لیں۔

عمادالملک اپنے مرشد کے حضور حاضری دے کر حضرت نظام الدین اولیاء کے مزار پر دعا مانگنے آیا تھا۔ ان کے مرشد نے کہا تھا۔ "جن حملہ آوروں کو فوجیں نہ روک سکیں ان کی فوجوں کو دعا نے پسپا کر دیا"۔ اور حکم دیا تھا کہ حضرت نظام الدین اولیاء کے دربار میں دعا کرتے

وقت وہ اپنی ذات اور منصب کو ذہن سے نکال دے اور صرف سلطنت اور اس کے لوگوں کے تحفظ کو ذہن میں رکھے۔ عمادالملک نے اس حکم پر عمل کرنے کی مقدور بھر کوشش کی تھی مگر ذات کے بت کو توڑنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا اس لئے ''آنے والا آئے گا جانے والا جائے گا'' کے نعرے سن کر وہ اور بھی افسردہ ہو گیا۔ اس کے ساتھی چہرے سے اس کے دل کی حالت کا اندازہ کر کے اس کی آنکھوں میں جھانکنے کی گستاخی نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے وہ نگاہیں نیچی کئے اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگے تھے۔ سکوت شب میں ''حق...... حق'' اور ''حق سدا رہا ہے حق سدا رہے گا'' کی آوازیں مقبرہ ہمایوں کی دیواروں تک پہنچ رہی تھیں۔

عمادالملک نے امرائے دربار کے تعاون سے مغل بادشاہ احمد شاہ کو سلطنت اور ملت کے تحفظ اور مرہٹوں کی بغاوت پر قابو پانے میں ناکامی کے جرم میں تخت سے اتار دیا تھا اور اندھا کر کے قلعہ سلیم گڑھ کے قید خانہ میں ڈال کر عالم گیر ثانی کو تخت پر بٹھا دیا تھا مگر علماء اور امراء نے اس سے جو امیدیں وابستہ کی تھیں بادشاہ کی تبدیلی کے باوجود وہ انہیں پوری نہیں کر سکا تھا۔ مرہٹے دن بدن طاقت پکڑتے جا رہے تھے اور علماء محسوس کرنے لگے تھے کہ عمادالملک میں مرہٹوں کے مقابلہ کی صلاحیت نہیں وہ سلطنت کے مستقبل کے بارے میں فکر مند تھے جس وجہ سے انہوں نے احمد شاہ ابدالی کو خط لکھ کر بلایا اور تعاون کا یقین دلایا تھا۔ احمد شاہ ابدالی کو دعوت دینے والے امراء میں سب سے طاقتور نجیب الدولہ تھا جو اپنی فوج کے ساتھ ابدالی کے ساتھ جا ملا تھا بعض لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ احمد شاہ ابدالی کو دعوت دینے والے علماء اور امراء کو خود عالمگیر ثانی کی درپردہ حمایت بھی حاصل ہے اور وہ اس کی مدد سے مرہٹوں اور اپنے وزیراعظم کی سرکشی پر قابو پانے کے خواب دیکھ رہا ہے۔

جب عمادالملک کی سواری کی اس کی حویلی میں داخل ہو رہی تھی تو شاہجہان آباد کی مساجد میں صبح کی اذان ہو رہی تھی اور ہر طرف سے ''اللہ اکبر...... اللہ اکبر'' آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ سواری سے اترا اور سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ مؤذن کے ساتھ ''اللہ اکبر...... اللہ اکبر'' دہرانے سے اسے تقویت اور سکون قلب محسوس ہونے لگا تھا مگر خواب گاہ تک پہنچتے پہنچتے وہ پھر سے ماضی کے واقعات اور مستقبل کے خدشات کے جال میں الجھ گیا اسے احمد شاہ ابدالی کو شاہجہان آباد میں داخلہ سے باز رکھنے کی کوئی تدبیر نہیں سوجھ رہی تھی اور نہ ہی اس کی کوئی چال کامیاب ہو رہی تھی کیا اس کی دعائیں رنگ لا سکیں گی وہ سوچنے لگا۔

***

مغلانی بیگم کی حویلی کے سامنے شاہی دستہ اترا تو اس کے خدام جیسے ہوا میں اڑنے لگے انہوں نے کبھی گمان بھی نہ کیا تھا کہ شہنشاہ ہندوستان کے فرزند شہزادہ علی گوہر خود چل کر بیگم کے حضوری حاضری کے لئے آئیں گے اور وزیراعظم ہند اس طرح بیگم صاحبہ کی خوشامد اور منت کرے گا مگر شہزادہ اور وزیراعظم کی بیگم صاحبہ کے حضور حاضری سے بھی زیادہ وہ اس خیال پر خوش ہو رہے تھے کہ اب ان کی لاہور واپسی ممکن ہو جائے گی اور بادشاہ کابل و قندھار مغلانی بیگم کو ساتھ لے جا کر ایک بار پھر پنجاب کی حاکمیت پر بحال کر دیں گے۔ بیگم صاحبہ نے پہلے سے انہیں لمبے سفر کی تیاری کا حکم دے رکھا تھا لیکن کسی کو یہ نہیں معلوم تھا کہ کہاں جانا ہے۔ اس لئے جب شاہی دستہ کے ہمراہ ان سب کے لئے سواریاں اور بیگم صاحبہ کے لئے آراستہ ہاتھی وہاں پہنچے تو خوشی سے ان کے پاؤں زمین پر نہیں ٹکتے تھے۔

جب مغلانی بیگم کی سواری شاہجہان آباد کے بازاروں میں نکلی تو اہل شہر راستہ کے دونوں جانب جمع ہو

گئے۔ ہاتھی پر سوار ایک پُر وقار خاتون کے ایک طرف وزیراعظم سلطنت مغلیہ کی سواری تھی اور دوسری طرف شہزادہ عالی گوہر کی سواری۔ شاہجہان آباد والوں نے اس شہر میں کسی خاتون کو اس شان سے سفر کے لئے نکلتے نہیں دیکھا تھا چار صد آراستہ سوار اور خدام ایک نظم سے ان کے پیچھے چلے جاتے تھے۔ شاہجہان آباد والوں نے مغلانی بیگم کے اغوا اور قیام کے بارے میں تو سن رکھا تھا مگر اپنی آنکھوں سے اس خاتون کو کبھی نہ دیکھا تھا جس کی مدد کے لئے افغان بادشاہ قندھار سے فوجیں بھیجا کرتے تھے۔ شاہجہان آباد کے گھر گھر میں کہا جاتا تھا کہ احمد شاہ ابدالی مغلانی بیگم کی رہائی اور اسے اغوا کرنے کی گستاخی پر عمادالملک کو سزا دینے کی خاطر ہندوستان پر فوجیں چڑھا لایا ہے۔ جب انہوں نے بیگم کو اس شان سے واپس جاتے دیکھا تو سکھ کا سانس لیا۔ "اب ابدالی کا ہے کو شاہجہان آباد میں آدے ہے"۔ وہ سرگوشیاں کررہے تھے۔ عمادالملک اور شہزادہ عالی گوہر مغلانی بیگم کو وداع کر کے واپس لوٹے تو رات اپنا بستر جما چکی تھی۔

***

شاہ قندھار کا جرنیل جہان خاں ایک اونچے ٹیلے پر کھڑا دور تک پھیلے افغان فوج کے رنگ برنگ خیمے دیکھ کر حیران کن خوشی محسوس کر رہا تھا وہ کسی لڑائی اور مزاحمت کے بغیر کرنال پہنچ گیا تھا۔ پانی پت اور پھر شاہجہان آباد وہ چشم تصور میں قلعہ معلّیٰ کے ایوانوں میں پہنچ گیا۔ اس نے دیوان خاص میں شاہجہان کو تخت طاؤس پر بیٹھے دیکھا تو اس کے دل میں آیا کہ وہ اس کے سطوت و شکوہ کو سلام کرے لیکن دوسرے ہی لمحہ اسے یاد آیا کہ قلعہ معلّیٰ میں اب نہ تو تخت طاؤس ہے نہ کوہ نور سے منور تاج شاہی ہے اور نہ ہی وہاں کوئی شاہجہان یا اورنگ زیب عالمگیر ہے وہاں تو اب عالمگیر ثانی کی شہنشاہیت ہے جس کی سلطنت میں وہ بلا کسی روک ٹوک کے ساتھ مقام تک پہنچ

فطرت ہے زندگی

غیر فطری زندگی میں سہولیات تو ہیں مگر سکون فطری زندگی میں ہی ہے۔ نفس کی پرورش اور لمبی خواہشوں سے بچو۔ (حکیم ممتاز۔میانوالی)

گیا ہے پھر اس نے سوچا کیا ہی اچھا ہوتا اگر تخت طاؤس آج بھی قلعہ معلّیٰ میں ہوتا اور وہ اسے اپنے ساتھ قندھار لے جاتے۔ ان کا بادشاہ اس تخت پر بیٹھ کر احکامات جاری کرتا تو کیسا معلوم ہوتا؟ وہ سوچنے لگا۔

پوہ کا نرم خو سورج کہیں دور آسمانوں سے جھک کر افغان فوجوں کے خیموں کا جائزہ لے رہا تھا۔ آج صبح جب اس نے قلعہ معلّیٰ کے ایوانوں اور دالانوں میں جھانک کر دیکھا تھا تو ان کے در و دیوار شب رفتہ کی طاؤس و رباب کی محفل کے خمار سے بیدار ہونے کی کوشش کر رہے تھے اور اطلس و کمخواب کے زرق برق لباسوں میں ملبوس خدام کی فوجیں دست بستہ قطار در قطار کھڑی تھیں۔ افغانیوں کے خیموں میں اسے نہ کہیں طاؤس نظر آیا نہ رباب دکھائی دیا ہر طرف شمشیر و سناں تھے اور کھردرے لبادوں میں چھپے سپاہی اپنے ہتھیار صاف کررہے تھے۔

جہان خان اپنی خوش بختی اور مغلوں کی بدبختی پر غور کرتا ہوا اپنے خیمے کی طرف لوٹنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ مغلانی بیگم کے ایلچیوں کی آمد کی اطلاع موصول ہوئی اس نے کیمپ کی طرف رفتار تیز کر دی۔

اس روز کے سورج نے آخری بار آنکھ کھول کر دیکھا کہ افغان کیمپ سے شاہسواروں کا ایک دستہ نکل رہا ہے۔ جہان خان کے نصف درجن سردار اور سینکڑے شاہسوار مغلانی بیگم کی خدمت میں جلد از جلد حاضر ہونے کے لئے اپنے گھوڑوں کو دوڑائے لئے جا رہے ہیں۔

کیمپ سے ملحق بیگم اور ان کے سواروں کے لئے الگ کیمپ لگانے کے احکامات جاری کر کے جہان خان احمد شاہ ابدالی کو بیگم کی آمد کی اطلاع کا مراسلہ لکھوانے بیٹھ گیا۔ بادشاہ کا کیمپ دس کوس پیچھے تھا، پانی پت روانہ ہونے سے پہلے وہ بادشاہ سے بیگم صاحبہ کے بارے میں احکامات حاصل کرنا چاہتا تھا اس نے مغلانی بیگم کے کئی روپ دیکھے تھے۔ کئی بار اسے پنجاب کی حاکمیت پر بحال کرانے آیا تھا۔ بیگم صاحبہ کا یہ روپ کیا ہے احمد شاہ ابدالی کے شاہجہان پہنچنے سے پہلے ہی وہ ان کے کیمپ تک کیسے پہنچ گئی ہے اور آگے کہاں جانا چاہتی ہے اس کے ذہن میں بہت سے سوالات گڈمڈ ہونے لگے تھے۔

اگلی صبح اس نے کیمپ سے باہر نکل کر مغلانی بیگم کا استقبال کیا۔ بیگم کی سواری دیکھ کر وہ گھوڑے سے اتر گیا اور احمد شاہ ابدالی کی طرف سے انہیں خوش آمدید کہا۔ مغلانی بیگم ہاتھی سے اتر کر گھوڑے پر سوار ہو گئی۔ اسے افغان جرنیل کے مرتبہ کا احساس تھا۔ افغان سرداروں اور سواروں کے درمیان سے گزرتا ہوا ان کا قافلہ اس کیمپ میں اتر گیا جو ان کے لئے قائم کیا گیا تھا، کیمپ کے درمیان میں بیگم کا خیمہ خاص تھا اور اردگرد ان کے خدام کے لئے خیمے تھے۔ ان کا قافلہ رات بھر چلتا رہا تھا۔ پیشوائی کے لئے جانے والا افغان دستہ پانی پت میں ان سے جا ملا تھا۔ طویل سفر کے باوجود بیگم کے چہرے پر تھکاوٹ کے کوئی آثار نہیں تھے۔ جہان خان نے انہیں بتایا کہ احمد شاہ ابدالی دوپہر تک کرنال پہنچ رہے ہیں اور انہوں نے حکم دیا ہے کہ بیگم صاحبہ اسی جگہ ان کا انتظار کریں وہ خود تھوڑی دیر میں اپنے لشکر کے ساتھ پانی پت روانہ ہو رہے ہیں۔ جہاں سے کل آگے بڑھ جائیں گے۔ بیگم کے چہرے پر فکر کی لہریں گہری ہو گئیں۔ انہیں امید تھی کہ وہ جہان خاں کو واپسی کے فوائد سمجھا کر اپنی تائید پر آمادہ کر لیں گی اور اس کی مدد سے احمد شاہ ابدالی سے واپسی کی درخواست اور شرائط منوانا آسان ہو جائے گا مگر وہ آگے روانگی کی جلدی میں تھا۔ اگر افغان فوجیں شاہجہان آباد کے دروازوں تک پہنچ گئیں تو کیا پھر بھی ابدالی کو واپس جانے پر آمادہ کیا جا سکے گا؟ وہ نئی صورتِ حال پر غور کرنے لگی افغان لشکر کے دوسرے اہم جرنیل شاہ ولی خان تھے لیکن بیگم ان کے مزاج سے واقف نہ تھی اس نے فیصلہ کیا کہ جیسے بھی ہو وہ احمد شاہ ابدالی کے حضور حاضری سے پہلے شاہ ولی خاں سے ملاقات ضرور کرے گی اور اس سے ابدالی کے ارادہ کے بارے میں معلوم کرنے کی کوشش کرے گی۔

سورج دوسری منزل سے نکل رہا تھا۔ جب اسے ابدالی کے ورود کی اطلاع ملی شاہ کی آمد سے قبل خیمہ گاہ شاہی آراستہ کر دیا گیا تھا۔ شاہ ولی خاں کا ڈیرہ مغلانی بیگم کے ڈیرہ کے پاس تھا۔ وہ شاہ ولی خاں سے رابطہ کے بارے میں سوچنے لگی اور پس پردہ ڈیوٹی پر موجود کنیز کو سرفراز خاں کو پیش کرنے کا حکم دے کر پہلے سے تیار مراسلہ نکال کر پڑھنے لگی۔

"ہم چاہتے ہیں یہ مراسلہ شاہ ولی تک جلد پہنچ جائے"۔ بیگم نے مراسلہ تہہ کرتے ہوئے سرفراز خاں کو حکم دیا۔

"بندہ حضور کے حکم کی تعمیل میں تاخیر نہیں کرے گا"۔ سرفراز خاں ادب کے لئے جھک گیا۔

"سواریاں اور خدام تیار ہیں؟"

"جی حضور سب تیار ہیں"۔

"مراسلہ پہنچا کر جلد واپس آئیں اور ہمیں اطلاع دیں"۔ بیگم نے اسے ہدایت کی۔

سرفراز خان نے جھک کر مراسلہ وصول کیا اور خیمے سے باہر نکل گیا۔

وہ تکیہ سے ٹیک لگا کر اقتدار کے نئے کھیل کی چالوں پر غور کرنے لگی اس کے لئے سب سے اہم پنجاب

کی حاکمیت کا حصول تھا اگر وہ احمد شاہ ابدالی کو شاہجہان آباد میں داخل ہونے سے باز رکھنے میں کامیاب ہو جائے تو عمادالملک بھی اپنے منصب پر فائز رہ سکے گا اور آئندہ ان کی حاکمیت پنجاب میں مداخلت نہیں کرے گا لیکن کیا وہ ابدالی کو شاہجہان آباد کے دروازوں سے واپسی پر آمادہ کر سکے گی؟ وہ سوچنے لگی سلطنت مغلیہ کی صدیوں پرانی عمارت وقت کے طوفانوں میں کسی خانہ بدوش کے خیمے کی مانند لرز رہی تھی۔ شہاجہان آباد کے خوفزدہ امراء اور علماء نے خطوط لکھ لکھ کر احمد شاہ ابدالی کو بلوایا تھا۔ وہ خود انہیں شاہجہان آباد کے خفیہ خزانوں کے بارے میں خط لکھ لکھ کر بھیج چکی تھی اسے کسی طرف کوئی روشنی کی کرن دکھائی نہ دی۔ خیمے سے باہر دن کی روشنی پھیلی تھی خیمے کے اندر ہر طرف اندھیرے سے گھبرا کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

شاہی لشکرگاہ میں شب کے پہریدار اپنی اپنی ڈیوٹیوں پر مستعد ہو چکے تھے اپنے مراسلہ کا کوئی جواب نہ ملنے پر بیگم خیمے میں خاموش بیٹھی تھی کہ اس کے ڈیرے میں شاہ ولی خاں کی آمد کا اعلان ہونے لگا۔ وہ جلدی جلدی افغان وزیراعظم کے استقبال کے لئے الفاظ جمع کرنے لگی اور سوچ کی زنجیریں مخملیں تکیہ کے نیچے چھپا کر بیٹھ گئی۔ افغان وزیراعظم نے خیمے میں قدم رکھا تو وہ اس وقت تک کھڑی رہی جب تک وہ تشریف نہ رکھ چکا۔ شاہ ولی خان کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور بیگم کی نگاہیں اس کے چہرے کے تاثرات سے اس کی شخصیت کی گہرائی ناپنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

''بادشاہ معظم حضور کی آمد پر خوش ہیں''۔ شاہ ولی نے گفتگو کا آغاز کیا۔

مغلانی بیگم نے بادشاہ معظم کا شکریہ ادا کیا اور بادشاہ کے حضور حاضری کی اپنی درخواست کے بارے میں جاننے کے لئے کہا۔ ''بادشاہ معظم کے کرم شمار کرنا اس نمک خوار کے لئے بہت دشوار ہے۔ حضور عالی مقام کی شفقت ہے کہ انہوں نے آپ کو بھیج کر عزت افزائی فرمائی۔ ہم ان کی قدم بوسی کی سعادت حاصل کر کے اپنی وفا اور احسان مندی کا ثبوت دیں گے''۔

''بادشاہ معظم طلوع آفتاب کے بعد پانی پت کے لئے روانگی کا ارادہ رکھتے ہیں وہیں پر حضور کو شرف باریابی بخشیں گے''۔ شاہ ولی خاں نے جواب دیا۔

اس خبر سے بیگم کی مایوسی بڑھ گئی۔ ''ہم پر بادشاہ معظم کے لطف و کرم میں ان کے آپ جیسے ان مشیروں کا بھی حصہ ہے جن کی ماؤں کے دودھ میں وفا اور دانائی تھی اور جو اہل عزت و شرف کے مقام شناس ہیں''۔

''بادشاہ معظم کی امور مملکت کی مصروفیات حضور کی مدد کے لئے ان کے جلد پہنچنے کی راہ میں حائل ہوئیں اس کا ہمیں احساس ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم حضور کو آزاد دیکھ رہے ہیں''۔ شاہ ولی خاں نے جواب دیا۔

شاہ ولی خاں سے بات چیت سے بیگم اندازہ نہ کر سکی کہ وہ کہاں تک ان کی مدد کر سکے گا۔ اس نے رخصت کی اجازت چاہی تو اس نے اپنا آزمودہ نسخہ استعمال کیا۔ ''یہ حقیر نذرانہ قبول فرما کر اس بے وطن کے احساس غربت کا بوجھ کم فرما دیں''۔ بیگم نے نہایت قیمتی شال اور تلوار پیش کرتے ہوئے کہا۔

''ہم اپنے کو اس نوازش پر سربلند پاتے ہیں''۔ شاہ ولی نے تلوار کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

بیگم کے سوار شاہ ولی خاں کے ڈیرے تک اس کے ساتھ گئے۔

بیگم نے اپنی ''بے وطنی'' کا ذکر خاص مقصد کے لئے کیا تھا لیکن افغان وزیراعظم کے الفاظ میں ایسا کوئی اشارہ نہیں تھا کہ وہ بیگم کا مطلب سمجھ گئے تھے۔ احمد شاہ ابدالی کے اشرف الوزراء شاہ ولی خاں کی فراست اور سفارت کے بارے میں سنی کہانیوں کی روشنی میں اس کے

جواب کے الفاظ کا ماہرانہ تجزیہ بیگم کی مایوسی کو کم نہ کر سکا۔

***

نواب نجیب الدولہ کی فوج کے سردار اس کے خیمے میں جمع تھے وہ افغان فوج کے لئے رسد کی فراہمی کے انتظامات کا جائزہ لے رہے تھے۔ خادم نے قاضی ادریس کی آمد کی اطلاع دی تو نواب نے اجلاس برخاست کر دیا اور ان کے استقبال کے لئے ننگے پاؤں خیمے سے باہر نکل آیا۔ اس کے سردار بھی اپنی عبائیں اور چغے سنبھالتے ہوئے تیزی سے خیمے سے باہر نکل کر قطاروں میں کھڑے ہونے لگے۔ نجیب الدولہ نے خیمے سے کافی دور جا کر ان کا استقبال کیا اور سر جھکا کر ساتھ چلنے لگا۔ روہیلہ سرداروں اور سپاہیوں میں سے جس کسی نے قاضی صاحب کو دیکھا جہاں تھا وہیں سر جھکا کر کھڑا ہو گیا ایسے معلوم ہوتا تھا کہ ڈیرے میں زندگی نے اپنے قدم روک لئے ہیں۔ ''حضور نے اس خادم کو حکم دیا ہوتا''۔ نجیب الدولہ نے قاضی صاحب سے جھک کر عرض کیا۔

''ملک سجاول شاہ صاحب قبلہ کا مراسلہ لے کر ابھی پہنچے ہیں اس لئے آپ کو تکلیف دینا پڑی''۔ قاضی ادریس نے اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے بتایا۔

''ہم شاہ صاحب قبلہ کے مراسلہ کے بڑی شدت سے منتظر تھے''۔ نجیب الدولہ نے ملک سجاول کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''آپ کے چہرے پر سفر کی گرد دیکھ کر اندازہ کر سکتا ہوں کہ شاہ صاحب قبلہ کا پیغام کتنا اہم ہے''۔

''شاہجہان آباد میں پہنچنے والی خبریں پریشان کن تھیں۔ شاہ صاحب کا حکم تھا۔ گھوڑے سے صرف نماز کے لئے اترنا ہے''۔ ملک سجاول نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔

وہ خیمے کے قریب پہنچ چکے تھے۔ سرداروں نے قاضی صاحب کے لئے ادب سے سر جھکا دیئے۔ ان کے درمیان سے چلتے ہوئے وہ خیمے کے دروازے تک پہنچے تو

نواب نجیب الدولہ نے آگے بڑھ کر خود پردہ ہٹایا وہ قاضی ادریس کو ملک سجاول کے بعد خیمے میں داخل ہوا۔ خیمے کے دروازے پر کھڑے سردار منتشر ہو گئے۔

وہ تینوں نشستوں پر بیٹھ چکے تو قاضی ادریس نے شاہ ولی اللہ کا مراسلہ نجیب اللہ کی طرف بڑھایا۔ ''شاہ صاحب قبلہ کو بتایا گیا ہے کہ احمد شاہ ابدالی نے پانی پت سے واپس قندھار لوٹ جانے کی مغلانی بیگم کی سفارش منظور کر لی ہے''۔

''بادشاہ معظم نے عماد الملک کے عریضہ کا ابھی تک کوئی جواب نہیں دیا''۔ نجیب الدولہ نے بتایا۔ ''انہوں نے مغلانی بیگم کے ساتھ روایتی کرم اور شفقت سے سلوک کیا اور اپنے خیمے میں کھڑے ہو کر بیگم صاحبہ کو خوش آمدید کہا۔ ان کی آمد پر خوشی اور اغوا پر ناراضی کا اظہار کیا مگر بیگم صاحبہ کی عماد الملک کو معاف کر دینے اور پانی پت سے واپس قندھار لوٹ جانے کی درخواست پر کوئی واضح فیصلہ نہیں فرمایا۔ بادشاہ معظم نے فرمایا کہ ما بدولت شاہجہان آباد کے اتنا قریب آ کر مغل شہنشاہ کے دربار میں حاضری اور جامع مسجد میں جمعہ کی نماز ادا کرنے کی سعادت کے بغیر واپس جانا مناسب نہیں سمجھتے۔ ہم شاہجہان آباد کے علماء کے علم مرتبہ اور زہد و تقویٰ کے معترف ہیں اور ان سے ملنے کی تمنا رکھتے ہیں''۔

''اگر بادشاہ معظم کے الفاظ یہی تھے تو اس کا مطلب ہے وہ شاہجہان آباد تک جانے کا مصمم ارادہ رکھتے ہیں''۔ ملک سجاول نے رائے دی۔

''بادشاہ معظم کے الفاظ یہی تھے ارادہ یہ ہے یا نہیں کچھ علم نہیں۔ بیگم صاحبہ نے بادشاہ معظم کو عماد الملک کی طرف سے مراسلہ پیش کیا تو بادشاہ معظم نے فرمایا تھا کہ وہ اس کا جواب بیگم صاحبہ کو پہنچا دیں گے۔ بیگم یہ جواب عماد الملک کو بھجوا دیں''۔ نجیب الدولہ نے بتایا۔

''خدائے واحد امت مسلمہ کو اس خاتون کے شر

سے محفوظ رکھے''۔ قاضی ادریس نے دعا کی وہ خاموش بیٹھے سن رہے تھے۔ ''امت مسلمہ کی کوتاہیوں کی سزا کے لئے عماد الملک ہی کیا کم تھے کہ اب یہ خاتون بھی اس پر مسلط کی جارہی ہے''۔

''شاہ صاحب قبلہ کا مراسلہ بادشاہ معظم تک پہنچا کر میں شاہجہان آباد روانہ ہو جاؤں گا تاخیر اور قیام کی اجازت نہیں''۔ ملک سجاول نے بتایا اور پوچھا۔ ''کیا شاہ صاحب کو یقین دلا دیں کہ ابدالی واپسی کی درخواست قبول نہیں کرے گا''۔

''آثار ایسے ہی ہیں لیکن یقین سے کچھ رائے دینا مناسب نہ ہوگا''۔ نجیب الدولہ نے جواب دیا۔

''شاہ صاحب کا حکم ہوا تو ابدالی واپس نہیں جائے گا''۔ قاضی ادریس نے ایک بار پھر خاموشی توڑی۔

''اس سے انکار ممکن نہیں''۔ نجیب الدولہ نے قاضی صاحب کی تائید کی اور پھر ملک سجاول سے پوچھا۔ ''اگر بادشاہ معظم عماد الملک کی درخواست مسترد کر دیتے ہیں تو اس کا کیا رویہ ہوگا بتایا جارہا ہے کہ وہ لڑنے کی تیاریاں بھی کر رہا ہے''۔

''بعض امراء عماد الملک کو ایسا مشورہ دے رہے ہیں مگر وہ ان کے اندازہ سے زیادہ ہوشیار ہے یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ وہ خودکشی نہیں کرے گا''۔

''شاہ ولی خاں کے دل میں عماد الملک کے لئے نرم گوشہ ہے اگر اس نے ایسا فیصلہ کیا تو وہ بادشاہ کو لڑائی سے اجتناب کا مشورہ دے سکتا ہے''۔ قاضی ادریس نے کہا۔

''شاہ ولی خان بادشاہ معظم کے مزاج شناس ہیں۔ شاہ صاحب قبلہ کے خط کے بعد وہ جو فیصلہ کریں گے۔ شاہ ولی اس سے اختلاف نہیں کرے گا''۔ نجیب الدولہ نے جواب دیا۔

''ہم دعا کرتے ہیں کہ افغانوں کے دل ہمارا درد محسوس کر سکیں اور ان کے دماغ دل کا ساتھ دیں''۔ قاضی ادریس نے دعا کی۔

ملک سجاول اور نجیب الدولہ نے ''آمین'' سے ان کی تائید کی۔

''ہم سمجھتے ہیں پنجاب میں سکھوں کی شورش دم توڑ رہی ہے اور بادشاہ معظم نے کفر کا فتنہ نابود کر دیا ہے''۔ قاضی ادریس ملک سجاول سے مخاطب ہوئے تو نجیب الدولہ نے محسوس کیا کہ احمد شاہ ابدالی کی واپسی کے بارے میں وہ ان کی رائے سے مطمئن ہو چکے ہیں۔

''میں یہ کہتے ہوئے دکھ محسوس کر رہا ہوں کہ سکھوں کی شورش کا دبایا جانا اب ممکن نظر نہیں آتا''۔

قاضی ادریس اور نجیب الدولہ نے ملک سجاول کے جواب پر اس طرح اس کی طرف دیکھا جیسے انہیں اس کی بات پر یقین نہ آیا ہو۔

''نچلی ذاتوں کے ہندوؤں اور غیر مسلم کاشتکاروں میں سکھوں کا دین اور بغاوت بڑی تیزی سے پھیل رہے ہیں اور مذہبی جوش نے انہیں سرفروش بنا دیا ہے''۔ ملک سجاول نے ان کی نگاہوں میں شکوک کے سائے دیکھ کر اپنی رائے کی وضاحت کی۔ ''گورو نانک کی مساوات کی تعلیم میں نچلی ذاتوں کے لئے کشش ہے اور زمین کاشتکار کی ملکیت ہوگی کہ نعرے نے کاشتکاروں کے ہاتھ میں تلوار دے دی ہے''۔

جیسے وہ پہلی دفعہ سکھوں کے مذہب اور سرکشی کے فروغ کے اسباب کے بارے میں سن رہے ہوں۔ قاضی ادریس نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''اس کو ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ سکھ مذہب ہندو مذہب کے خلاف بغاوت اور مسلم نظم کے خلاف سرکشی ہے؟''

ملک سجاول اور نواب نجیب الدولہ نے سر ہلا کر قاضی ادریس کی تائید کر دی۔

(جاری ہے)

☆راوی: محمد خان/تحریر: حکیم مختار احمد ناز

78 دن موت وحیات کی کشمکش میں رہنے والی اذیت بھول چکا ہوں لیکن شاداں سے جدائی کی اذیت اتنے سال گزرنے کے باوجود بھی زندہ ہے اور قبر میں اترنے تک زندہ رہے گی۔

بابا

محمد خان سے جب کبھی ملاقات ہوتی ہے تو وہ ایک نہ ایک واقعہ سنا دیتے ہیں۔ دبلے پتلے جسم کے ساتھ وہ تاحال صحت مند ہیں۔ قوتِ سماعت اور نظر ٹھیک ہے۔ عمر نوے سال کے لگ بھگ ہے انہوں نے جو کہانیاں سنائی ہیں وقتاً فوقتاً "حکایت" کی نذر کرتا رہوں گا۔

میں اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد ہونے کی وجہ سے بے حد لاڈ پیار سے پلا تھا۔ والد نے گاؤں میں ایک کریانہ کی دُکان کھول رکھی تھی جو ہماری تمام ضروریات پوری کر رہی تھی۔ میں تیرہ چودہ سال کا تھا جب میری ماں دنیا سے رخصت ہوگئی لیکن باپ نے ماں کی کمی محسوس نہ ہونے دی اور میری خاطر دوسری شادی بھی نہ کی۔ دیسی گھی اور خالص دودھ کا زمانہ تھا ہر چیز ارزاں نرخوں پر دستیاب تھی۔ گھی تو بہت سستا تھا اور دودھ فروخت نہیں ہوتا تھا۔ چائے کا رواج نہ تھا بلکہ چائے بطور دوا استعمال ہوتی تھی۔ میرا جسم کافی مضبوط تھا اور قد بھی خوب نکل رہا تھا۔ اُس دور میں وزن اٹھانا، بازو چھڑانا، مگدر گھمانا، دوڑ اور کبڈی و کشتی اہم کھیل ہوا کرتے تھے۔ میں علاقے کے نامی گرامی کھلاڑیوں سے بھی کبھی کبھار پنجہ آزمائی کر گزرتا۔ کبڈی اور دوڑ تو میرے پسندیدہ کھیل تھے۔

میری عمر تقریباً سترہ سال تھی جب میرے ایک دوست نے مجھے کہا کہ میرا بہنوئی بہاولپور فوج میں ہے، اس نے مجھے خط لکھا ہے کہ اگر فوج میں بھرتی ہونا چاہو تو بہاولپور آ جاؤ۔ کوئی اور لڑکے ہوں تو اُن کو بھی ساتھ لے آؤ۔ مجھے یہ مشورہ بڑا پسند آیا، میں نے اور میرے دوست نے اکٹھے میرے والد سے بات کی۔ میرے دوست کے والدین تو پہلے ہی فوت ہو چکے تھے لیکن میرے والد کسی طرح بھی اس پر تیار نہ تھے۔ وہ ہر وقت مجھے اپنے سامنے دیکھنا چاہتے تھے۔ بالآخر ہم نے کئی روز کی محنت سے اُن کو رضامند کر لیا اور چند دن بعد ہم دونوں بہاولپور دوست کے بہنوئی کے پاس پہنچ گئے۔ دو تین روز بعد ہمارا میزبان ہمیں بھرتی سینٹر لے گیا اور ہم بغیر کسی رکاوٹ کے بھرتی ہو گئے۔

جنگِ عظیم اپنے عروج پر تھی۔ فوجی مکھیوں کی طرح مر رہے تھے۔ انگریز سرکار نے شہر شہر بھرتی سینٹر کھول دیئے تھے جہاں جسمانی طور پر صحت مند ہر جوان آدمی کو بھرتی کر لیا جاتا تھا۔

ہماری ٹریننگ شروع ہو گئی۔ آج کل اور اس دور کی ٹریننگ میں زمین آسمان کا فرق تھا، بہت سختی کی جاتی تھی۔ ٹریننگ میرے لئے تو کوئی مشکل نہ تھی کیونکہ گاؤں میں بھاگ دوڑ اور کھیل کود کی وجہ سے میں سب سختی برداشت کر رہا تھا لیکن میرے دوست کے لئے بڑی مشکل بن گئی تھی کیونکہ اس نے کسی بھی کھیل میں کبھی حصہ نہیں لیا تھا۔ چند ہی ہفتے بعد میرا دوست تو دلبرداشتہ ہو گیا اور اپنے بہنوئی کی وجہ سے ڈسچارج ہو گیا حالانکہ میں نے اس کو بڑا حوصلہ دیا لیکن وہ نہ مانا اور گھر واپس آ گیا۔ میری ٹریننگ مکمل ہونے والی تھی۔ جنگ عظیم زوروں پر تھی اور جنگ برما اور آسام تک پھیل چکی تھی۔ دیگر افواج کی طرح ہماری بٹالین کو بھی برما محاذ پر بھیج دیا گیا۔ جس جگہ ہمارا کیمپ تھا اس جگہ کا نام "کوہما" یا "کوما" تھا۔ جاپانی فوجوں نے کلکتہ تک کے اہم پل اڑا دیئے تھے جس سے ہم تک راشن اور اسلحے کی سپلائی بھی منقطع ہو چکی تھی جو تھوڑا بہت راشن ہمیں ملتا وہ معلوم نہیں کس طرح ہم تک پہنچ پاتا تھا۔

ایک صبح ایک سکھ سپاہی مہندر سنگھ کو میرے ساتھ ریکی کے لئے بھیجا گیا اور ایک علاقہ دیا گیا کہ وہاں وہاں تک جانا ہے اور اپنے آپ کو چھپا کر دشمن کی نقل و حرکت دیکھنی ہے۔ جن لوگوں نے اس دوران برما کا علاقہ دیکھا تھا وہ اس سے بخوبی آگاہ ہیں کہ وہاں کا زیادہ تر علاقہ نشیبی ہے، گھنی جھاڑیاں سرکنڈے اونچے نیچے ٹیلے ہیں اور

بڑی بڑی گھاس ہے۔ اکثر آسمان پر بادل چھائے رہتے ہیں اور بارشیں زیادہ ہوتی ہیں۔ جھاڑیوں اور گھاس سے گزر کر ہم آہستہ آہستہ اپنی منزل کی جانب بڑھ رہے تھے۔ دو میل سے بھی کم فاصلہ ہم نے تقریباً تین گھنٹے سے بھی زیادہ وقت میں طے کیا۔ دفعتاً ہمیں دور سے چند فوجی ہماری طرف آتے دکھائی دیے، ہم نے نیچے ہو کر اپنے آپ کو جھاڑیوں میں چھپا لیا اور آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگے کیونکہ فوجیوں نے ہمارے سامنے سے گزرنا تھا۔ گھنی جھاڑیاں اور گھاس ہمیں فائدہ دے رہی تھی لیکن سانپ یا بچھو کے کاٹنے کا بھی ڈر تھا اور یہ ڈر بھی تھا کہ اگر ہمارے قریب سے کوئی جانور نکل کر بھاگا تو فوجیوں کی توجہ ادھر نہ ہو جائے۔ بہرحال اللہ نے کرم کیا ہم دبک کر بیٹھے رہے۔ یہ چند فوجی نہیں تھے بلکہ پورا کانوائے تھا۔ فوجی کانوائے دو دو تین تین کی ٹولیوں میں ہم سے کچھ فاصلے پر سے گزر رہا تھا۔

جب یہ قافلہ گزر گیا تو ہم آگے بڑھ گئے۔ جلد ہی سورج اپنا سفر مکمل کر کے مغرب میں اوجھل ہونے لگا، آہستہ آہستہ اندھیرا چھانے لگا اور اس کے ساتھ ہی جنگلی جانوروں اور حشرات الارض کا شور بلند ہونا شروع ہو گیا۔ سن رکھا تھا کہ یہ بڑے خطرناک جنگلات کا سلسلہ ہے جس میں شیر، لگڑبگڑ اور پتہ نہیں کیا کیا خوفناک جانور رہتے ہیں۔ چھوٹے موٹے جانوروں گیدڑ، سؤر، خرگوش اور بھیڑیوں کے تو غول کے غول نظر آتے تھے۔ اتنے بڑے بڑے اژدھے پائے جاتے ہیں جو ہرن وغیرہ کو سالم نگل جاتے ہیں۔

بندہ گھر اور وطن سے دور ہو جنگل کا بے حد خطرناک ماحول ہو رات کا وقت ہو تو بڑے بڑے بہادروں کے پتے پانی ہو جاتے ہیں، وہ تو میلوں پر پھیلا ہوا جنگل تھا۔ ہم نے اندازے سے واپسی کا سفر شروع کیا۔ فوجی کیمپ نقل و حرکت تو ہم نے دیکھ لی لیکن اُن کے کمی تک ہم نہ پہنچ سکے۔ مسلسل چلتے سارا دن بھوکا رہنے کی وجہ سے اب ہم سے صحیح طور پر چلا بھی نہیں جا رہا تھا اکا دکا جانور جسے رات کے اندھیرے میں ہم پہچان سکتے تھے اچانک اٹھ کر بھاگ کھڑا ہوتا اور ہم بھی رائفلیں تان لیتے لیکن چلانے کی نوبت نہ آتی۔ رات نصف سے زیادہ گزر چکی تھی کہ ہمارے سامنے ایک صاف ٹیکری آ گئی وہاں ہم نے اپنا سامان وغیرہ رکھا ہمارے پاس کچھ بسکٹ اور پانی تھا چند ایک بسکٹ کھائے اور پانی پی لیا۔ میں نے سکھ ساتھی سے کہا کہ تھوڑی دیر کے لئے تم سو جاؤ، میں پہرہ دوں گا پھر تم پہرہ دینا میں سولوں گا۔

سکھ تو لیٹتے ہی خراٹے لینے لگا، میں رائفل ہاتھ میں لئے چوکس ہو کر پہرہ دیتا رہا۔ تقریباً دو گھنٹے بعد اُسے جگا کر میں سو گیا۔ میں تھوڑی دیر ہی سویا ہوں گا کہ مجھے عجیب سی آوازیں آنے لگیں۔ میں آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا دیکھا تو میرا سکھ ساتھی گھٹنوں پر سر رکھے رو رہا تھا اور اس کی ہچکی بندھ گئی تھی۔ میں پریشان ہو گیا کہ اسے شاید کسی سانپ وغیرہ نے کاٹ لیا ہے۔ میں اٹھ کر اس کے قریب بیٹھ گیا، پوچھا۔ مہندر سنگھ خیریت تو ہے؟ میرے پوچھنے پر وہ اور زیادہ رونے لگ گیا۔ بڑی مشکل سے اسے چپ کرایا اور رونے کی وجہ پوچھی۔

”بھا محمد کھان! مینوں اپنی ماں تے بہن یاد آ گیاں سن“۔ اس نے روتے ہوئے کہا۔ ”میری اکو بہن اے، ٹردے ویلے میری بہن نے کہیا سی۔ ویرا اپنی بڈھڑی ماں تے بہن نوں یاد رکھیں، توں اکو ای ساڈا سہارا ایں۔ بھا محمد کھان! توں ای دس جے اساں کدی دشمن دی گولی دا نشانہ بن گئے یا کوئی سپ شپ وڈ لوے تے ساڈی ہڈیاں تاں ایتھے ای رُل جانیاں نیں“۔ یہ کہہ کر وہ پھر رونے لگا۔

(بھائی محمد خان! مجھے اپنی ماں اور بہن یاد آ رہی ہیں جنہوں نے مجھے چلتے وقت کہا تھا کہ ہمیں یاد رکھنا، تم

ہی ہمارا سہارا ہو۔ بھائی محمد خان! اگر ہم دشمن کی گولی سے مر جائیں یا ہمیں سانپ وغیرہ نے ڈس لیا تو ہماری ہڈیاں تو یہیں بکھر جائیں گی۔)

بڑی مشکل سے اُسے چپ کرایا اور کہا کہ دیکھو اور لوگ بھی تو ان جنگلوں میں موجود ہیں۔ پھر ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ پو پھٹنے والی تھی جب ہم نے چلنے کا پروگرام بنایا کیونکہ سورج نکلنے سے پہلے ہم اپنے ٹھکانے پر پہنچنا چاہتے تھے۔

دشمن کی فوج سے بچ کر چلنے کا یہی موزوں وقت تھا۔ سورج نکلنے سے تھوڑا پہلے ہم ایک چھوٹی سی ندی کے پاس پہنچ گئے تھوڑی دیر بیٹھے پانی پیا اور اپنی بوتلیں پانی سے بھر کر ندی سے ذرا ہٹ کر جھاڑیوں کی اوٹ میں آگے بڑھنے لگے۔ سورج اوپر آ گیا لیکن ہماری منزل ہمیں نظر نہ آ رہی تھی۔ شاید ہم راستہ بھول چکے تھے۔ بھوک شدت سے تنگ کر رہی تھی۔ دور درختوں کے جھنڈ میں ہمیں کچھ سر ہلتے جلتے نظر آئے ہم نے آپس میں مشورہ کیا کہ چھپ چھپا کر دور سے دیکھتے ہیں اگر اپنا کیمپ ہوا تو چلے جائیں گے اور اگر دشمن کا ہوا تو چپ کر واپس آ جائیں گے۔ چنانچہ ہم جھاڑیوں کی اوٹ لیتے ہوئے قریب پہنچ گئے۔

ہم نے پہچان لیا کہ یہ ہمارے اپنے فوجی ہیں چنانچہ ہم بے دھڑک اس جانب چل دیئے۔ بڑے گھنے درختوں میں لمبے بانس ڈال کر بہت بڑا چھپر بنایا گیا تھا، ساتھ ہی راشن کا سٹور تھا اور لنگر خانہ تھا۔ لنگر کمانڈر کو ہم نے اپنی یونٹ کے بارے میں بتایا اور کہا کہ ہمیں شدید بھوک لگی ہے۔ لنگر کمانڈر نے کہا کہ اپنے راشن ٹین لنگر پر لے جاؤ اور وہاں سے کھانا لے لو۔ میں مہندر سنگھ کا راشن ٹین بھی ساتھ لے گیا۔ کک سے پوچھا کہ کیا پکا ہے تو اس نے بتایا کہ جھٹکا اور سؤر کا گوشت الگ الگ پکایا گیا ہے۔ یہ بھی کبھار پکتا ہے جبکہ عام روٹین میں دال ہی پکائی جاتی ہے۔ میں نے مہندر سنگھ کے راشن ٹین میں گوشت ڈلوا کر وہیں رکھوا دیا اور آٹھ روٹیاں اور اپنا راشن ٹین خالی لے کر واپس آ گیا۔ چار روٹیاں اسے دے دیں اور کہا نہ وہاں جا کر اپنا گوشت لے آؤ۔ میں نے پانی سے تین روٹیاں کھا لیں اور ایک روٹی اپنے تھیلے میں ڈال لی۔ جب ہم کھانا کھا چکے تو وہاں موجود ایک جمعدار (موجودہ حوالدار) نے ہماری راہنمائی کی اور ہمیں اپنے فوجی کیمپ کا راستہ سمجھا دیا۔ ہم شام تک اپنے کیمپ میں واپس پہنچ گئے۔

تین چار دن بعد ہماری بٹالین کو ایڈوانس کا حکم ملا، ہمیں اپنے ہدف کے بارے کوئی علم نہ تھا نہ ہی منزل کی خبر تھی۔ مسلسل چلتے ہمیں آٹھ دن ہو چکے تھے۔ راشن کی شدید قلت تھی پانی کہیں کہیں سے مل جاتا تو ہم بوتل پانی کی بھر لیتے۔ آٹھ پہروں میں صرف ایک بار کھانا ملتا جو کہ انتہائی کم ہوتا۔ کبھی ابلے ہوئے چاول، کبھی ایک روٹی اور تھوڑی سی دال فی کس، دن میں ایک بار آدھ گھنٹہ اور رات کو دو گھنٹے آرام ہوتا تھا۔

چلتے ہوئے شاید ہمیں آٹھواں دن تھا کہ مجھے ہلکا ہلکا بخار محسوس ہو رہا تھا اور سردی بھی لگ رہی تھی حالانکہ موسم سردی کا نہیں تھا۔ تھکاوٹ، خوراک کی کمی اور اس کے ساتھ بخار لیکن مجبوری تھی۔ شام تک بخار بہت زیادہ ہو گیا، خدا خدا کر کے اندھیرا چھانے لگا اور ہمیں آرام کرنے کا حکم ملا۔ لڑائی کا مرکز شاید ہم سے زیادہ دور نہیں تھا۔ توپوں کی گھن گرج سنائی دیتی تھی۔ میں نے اپنا کمبل نکالا اور لے کر لیٹ گیا۔ ایسے لگتا تھا کہ پورے جسم کی ہڈیاں ٹوٹ چکی ہیں۔ میرے پاس پانی بھی ختم ہو چکا تھا، باقیوں کے پاس بھی پانی نہ ہونے کے برابر تھا۔ مجھے لیٹے تھوڑی دیر گزری کہ مجھے اپنے قریب سے آواز آئی کہ یہاں کوئی جہلمی سپاہی ہے (ہمارا ضلع اس وقت جہلم تھا) میں نے منہ سے کمبل ہٹایا تو ایک لمبا چوڑا جوان کھڑا تھا۔

میں نے آہستہ سے کہا کہ میں ہوں۔ وہ میرے قریب آ کر بیٹھ گیا، میری تحصیل اور پھر گاؤں کا نام پوچھا تو اس نے پھر پوچھا تمہارے والد کا کیا نام ہے؟ جب میں نے بتایا تو اس نے کہا کہ مجھے پہچانا ہے؟ میں نے نفی میں جواب دیا۔ ایک تو اندھیرا تھا اور وہ اس وقت حوالدار تھا، وہ زیادہ عرصہ باہر ہی رہا تھا اس لئے میں نے اس کو پہلے دیکھا نہیں تھا، اس نے مجھے بڑا دلاسہ دیا اور مجھے کہا کہ میں تمہارے لئے کچھ راشن اور دوا لے کر آتا ہوں۔ تھوڑی دیر بعد اس نے مجھ دو گولیاں تھوڑے سے چاول اور ایک ڈبہ چینی دودھ کا مکس دیا اور کہا کہ کچھ کھا کر ایک گولی پانی سے کھالینا۔

میں نے اپنے ساتھی سے کہا کہ یہ چاول پکالو۔ اس نے اِدھر اُدھر سے ایندھن اکٹھا کیا اور لوہے کے ہلمٹ سے پتری نکال کر اس میں چاول ابال کر لے آیا جو پکے کم اور کچے زیادہ تھے۔ میں نے صرف دو نوالے لئے تو جی بھر گیا۔ دو ساتھی اور بھی شامل ہو گئے اور چاول کھا گئے۔ پاؤ بھر چاول ہوں گے میں نے پانی سے دونوں گولیاں کھا لیں۔ شاید کونین کی گولیاں تھیں، کھانے کے بعد میرے تو سینے اور پیٹ میں جیسے آگ لگ گئی ہو دل گھبرا گیا، جسم پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ میرے ساتھی نے اِدھر اُدھر دوڑ کر تھوڑا سا پانی اکٹھا کر کے مجھے دیا جو میں ایک ایک گھونٹ پیتا رہا تھا اور پھر وہ پانی بھی ختم ہو گیا، میری حالت بدستور وہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہمیں پھر چلنے کا حکم مل گیا۔ ہمارا فوجی دستہ چل پڑا۔

ابھی ہم تھوڑا سا ہی چلے ہوں گے کہ اچانک برما کا خاموش جنگل طیاروں کی خوفناک آوازوں سے گونج اٹھا۔ طیارے نیچی پرواز کرتے ہوئے ہمارے اوپر سے زناٹے کی آواز پیدا کرتے ہوئے گزر گئے۔ پھر ذرا سی دیر گزری ہو گی کہ یہ طیارے گھوم کر واپس آتے دکھائی دیئے۔

''سب بکھر کر چھپ جاؤ''۔ کمانڈر کی دھاڑتی آواز اُبھری۔ ''ہمیں دیکھ لیا گیا ہے۔ ائر اٹیک آ رہا ہے''۔

بس سیکنڈوں کی بات تھی۔ طیاروں نے ہمارے سروں پر غوطہ لگایا اور بم برساتے ہوئے آگے نکل گئے۔ چند لمحوں بعد جنگل خوفناک بم دھماکوں سے گونج اٹھا۔ ہمارے چاروں طرف گرد و غبار کا طوفان اٹھا۔ اس کے ساتھ ہی کئی انسانی چیخیں اور کراہیں سنائی دیں۔ درختوں کے پتے اور ٹہنیاں ٹوٹ ٹوٹ کر نیچے گرنے لگیں۔ ایسا لگنے لگا جیسے قیامت آ گئی ہو۔ جس کا جدھر کو منہ اٹھا وہ بھاگ اٹھا۔ افراتفری مچ گئی۔

ابھی ہم اس مصیبت سے سنبھلے نہیں تھے کہ اچانک جاپانیوں کی توپوں کا فائر آنے لگا۔ ہمارے اردگرد گولے پھٹنے لگے۔ گولہ جہاں پھٹتا، اس کے ٹکڑے موت کے ہرکارے بن کر اردگرد پھیل جاتے۔ جو ان کی زد میں آتا ہلاک ہو جاتا یا جسم کے جس حصے پر لگتا وہ حصہ اڑا لے جاتا۔ فوجی مرنے اور زخمی ہونے لگے۔

تھوڑی دیر بعد گولہ باری ختم ہو گئی۔ ہمارے کمانڈر نے گلا پھاڑ کر اعلان کیا کہ جتنی جلدی ہو سکے اس علاقے سے دور نکلنے کی کوشش کرو۔ گولہ باری کے بعد اب جاپانی فوجی آئیں گے۔ یہ سن کر ہم پر خوف و ہراس طاری ہو گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جاپانیوں کے متعلق مشہور تھا کہ بڑے ظالم ہیں اور جنگی قیدیوں کے ساتھ وحشی درندوں جیسا سلوک کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ دشمن کے بیمار اور زخمی فوجیوں کو فوراً گولی مار دیتے ہیں۔

اگرچہ بخار نے میری ہڈیوں کو توڑ کر رکھ دیا تھا لیکن جاپانیوں کے خوف سے میں بھی ایک طرف بڑھنے لگا۔ سمت کا کوئی تعین نہیں تھا بس جان بچانے کا خیال دماغ پر حاوی تھا۔ معلوم نہیں میں کتنی دیر چلا ہوں گا۔ بس ایک غشی کا سا عالم تھا۔ میرے حواس قابو میں نہیں تھے۔ کبھی

چلتے چلتے گر پڑتا، پھر ہمت کر کے اٹھتا اور چل پڑتا۔ نہ جانے میں کدھر نکل گیا تھا، مجھے کہیں بھی کوئی اپنا ساتھی نظر نہ آیا اور نہ ہی جاپانی نظر آئے۔ اب مجھے احساس ہونے لگا تھا کہ میں جنگل میں بھٹک گیا ہوں۔ پھر میں تھک ہار کر بے دم سا ہو کر گر پڑا۔

کافی دیر بعد میں اٹھا تو چلا نہیں جا رہا تھا، آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا اللہ تعالیٰ کے آسرے پر ایک طرف چل پڑا۔ کبھی چلتا کبھی بیٹھ جاتا، دور سے کہیں پانی کے اوپر سے نیچے گرنے کا شور سا سنائی دیا۔ میرا منہ خشک تھا اور حلق میں جیسے کانٹے چبھ رہے ہوں، سینے میں تو جیسے کسی نے انگارے بھر دیئے تھے۔ میں نے ہمت باندھی اور پھر چل پڑا، اب پانی کا شور بالکل نزدیک سے آ رہا تھا۔ میرا حوصلہ بڑھ گیا اور میں پانی کے قریب پہنچ گیا۔ پہاڑی کے اوپر سے پانی نشیب میں گر رہا تھا اور چھوٹی سی ندی کی شکل اختیار کئے ہوئے تھا۔ میں نے پیٹ بھر کر پانی پیا اور ایک بوتل بھر کر اٹھا تو پیٹ میں درد شروع ہو گیا اور میرا پورا جسم پسینے سے نہا گیا۔ جتنا پانی میں نے پیا تھا شاید اتنا پانی پسینہ کی شکل میں نکل گیا، میری وردی بھی جسم کے ساتھ چپک گئی۔

وہاں کے موسم کے بارے میں پہلے بتا چکا ہوں، زیادہ وقت آسمان پر بادل چھائے رہتے، ہلکی بارش تو عموماً ہوتی ہی رہتی تھی۔ اس دن بھی آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے لگتا تھا کہ ابھی بارش شروع ہو جائے گی۔ میں نے گرتے پڑتے ایک گھنٹے میں بمشکل ایک یا ڈیڑھ فرلانگ سفر طے کیا ہوگا کہ ہلکی پھوار کی شکل میں بارش شروع ہو گئی۔ وہ زمین پہلے ہی نمناک تھی بارش سے جلد ہی پھسلن بن گئی۔ میرے وجود میں پہلے ہی سکت نہ تھی پھسلن سے میرا چلنا دشوار ہو گیا۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر درخت تھے، ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر میں نے رائفل اتار کر زمین پر رکھی اور اپنی فوجی کٹ پٹھو درخت کے تنے کے ساتھ رکھ کر ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ جسم سے آگ نکل رہی تھی اور اوپر سے بارش، مکمل اندھیرا جنگل کا ماحول دور کہیں سے توپ کے گولوں کی آوازیں آتی تھیں کبھی کبھار جنگلی جانوروں کی آوازیں اس سکوت کو توڑ دیتیں۔

قدرت نے مجھے اتنا بڑا دل دیا ہے کہ مجھے ذرا برابر بھی خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا لیکن پھر بھی جب یہ خیال آتا کہ گھر سے ہزاروں میل دور اکیلے باپ کا واحد سہارا اگر مجھے کچھ ہو گیا تو میرے باپ کا کیا بنے گا تو یہی سوچتے سوچتے میرا دل ڈوبنے لگتا۔

میں سورۂ اخلاص، آیت الکرسی، درود شریف اور جو کچھ مجھے یاد تھا پڑھتا رہتا۔ کبھی چند لمحے آنکھ لگ جاتی اور کبھی آنکھ کھل جاتی۔ خدا خدا کر کے صبح ہوئی تو میرے سامنے کچھ اور ہی منظر تھا۔ پہاڑیوں اور ڈھلوانوں کے درمیان جگہ ہموار کر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کی شکل میں کھیت بنائے گئے تھے اور شاید مونجی کاشت کی گئی تھی، فصل کٹی ہوئی تھی جگہ جگہ بانسوں کے جھنڈ تھے۔ دور ایک جھونپڑی نظر آ رہی تھی، میں نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن اٹھ نہ سکا۔ میرا نیچے والا دھڑ جیسے مفلوج ہو چکا تھا، دونوں ہاتھوں سے آہستہ آہستہ ٹانگوں کو ملتا رہا، ٹانگوں کو آگے پیچھے کرتا رہا، بخار کی حالت میں بارش سے پورا جسم اکڑ کر رہ گیا تھا۔ آہستہ آہستہ اٹھانے کی کوشش کی، رائفل اور پٹھو اٹھایا قدم گھسیٹنے شروع کئے، معلوم ہوتا تھا کہ میرے پاؤں کے ساتھ منوں کے حساب سے وزن باندھ دیا گیا ہے۔

میرا ارادہ تھا کہ میں جھونپڑی میں کچھ دیر سکون سے لیٹ سکوں، خدا خدا کر کے بہت دیر بعد میں جھونپڑی میں پہنچ گیا۔ بانسوں کی مدد سے سرکنڈے ڈال کر جھونپڑی بنائی گئی تھی، نیچے مٹی ڈال کر باہر سے فرش کی زمین اونچی کر دی گئی تھی کہ باہر کی پانی اندر نہ آئے۔

ے ایک سہولت یہ ہوگئی کہ بارش اگر پُر سکون ہوتی تو پانی اندر نہ آتا تھا اور اگر تیز ہواؤں کے ساتھ ہوتی تو چھینٹے سیدھے میرے اوپر آتے تھے۔ میں نے رائفل اپنے پاس رکھ لی اور پٹھو کو بطور تکیہ استعمال کیا۔ بھوک کی حس تو جیسے ختم ہو چکی تھی، منہ بار بار خشک ہوتا تھا، پانی میرے پاس تھا، دن ختم ہوا پھر رات آئی پھر صبح ہوئی۔ میرا ارادہ تھا کہ اٹھ کر آہستہ آہستہ چل پڑوں گا۔ میں اٹھ کر بیٹھا پھر بڑی مشکل سے کھڑا ہونے کی کوشش کی تو کھڑا نہ ہو سکا۔ جونہی کھڑا ہوتا تو سر گھومنے لگتا چکر آتے اور ایسا محسوس ہوتا کہ میں گر رہا ہوں پھر بیٹھ جاتا اب میں نے اٹھ کر چلنے کا ارادہ ترک کر دیا پانی بھی ختم ہو رہا تھا۔ میں نے اپنے مگ کی مدد سے جھونپڑی کے دروازے پر ایک چھوٹا سا گڑھا کھود لیا۔ اب بارش کا پانی اس میں جمع ہو جاتا اور میں پی لیتا۔

آہستہ آہستہ بخاری کی وجہ سے میرے جسم کی توانائی ختم ہو رہی تھی۔ جب بخار تیز ہوتا تو پتہ نہیں آنکھوں کے سامنے کیا کیا منظر آ جاتے۔ کبھی ماں کھڑی ہاتھ میری طرف بڑھاتی ہوئی نظر آتی، کبھی والد پریشان کھڑے نظر آتا، کبھی کبھی تو اتنی ڈراؤنی چیزیں نظر آتیں کہ جسم سے پسینہ پانی کی طرح نکلتا۔ غالباً یہ بخار کا اثر تھا۔ کبھی کبھار جب بخار کا زور کم ہوتا تو میں ہمت کر کے اٹھ بیٹھتا اور اپنے آپ کو گھسیٹتا ہوا جھونپڑی سے باہر آتا۔ آس پاس جھاڑیاں تھیں اُن کے پتے توڑ کر چباتا اور گڑھے سے پانی پی لیتا اور سوچتا کہ اللہ تعالیٰ نے پتہ نہیں مجھے کیوں زندہ رکھا ہوا ہے، پتہ نہیں کب تک یہاں سکتا رہوں گا۔

اب کم و بیش سترہ سال بعد جب میں اس واقعہ پر غور کرتا ہوں تو خالق اکبر کی قدرت مجھ پر عیاں ہو جاتی ہے اور فوراً حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کا فرمان مجھے یاد آ جاتا، فرماتے ہیں۔ ”اے میرے اللہ میں نے اپنے

ارادوں کے بار بار ٹوٹنے کی وجہ سے تیری قدرت کو پہچانا ہے یعنی میں ارادہ اور کرتا ہوں لیکن تُو کچھ اور چاہتا ہے"۔

کبھی کبھی میں ارادہ کرتا کہ اس زندگی سے تو موت اچھی ہے۔ اپنی رائفل اٹھاتا کہ مرنا تو ویسے بھی ہے کیوں نہ زندگی کا خاتمہ ایک گولی سے کرلوں لیکن قدرت کو میری حرام موت منظور نہ تھی، وہ ازل سے میرے جواں بیٹے کو شہادت کے رتبے پر فائز کر چکی تھی اور آج جب لوگ اپنے مرنے والوں پر بَین کر کے روتے ہیں تو میں اپنے آپ پر فخر بھی محسوس کرتا ہوں۔ میرا سر فخر سے بلند ہے کیونکہ میرا جوان بیٹا اپنے ملک پاکستان کی حفاظت کرتے ہوئے چند سال قبل 27 رمضان کو "وانا" میں شہید ہو گیا تھا۔ میں اپنے تین سالہ پوتے کو دیکھتا ہوں تو اپنے پروردگار کی قدرتِ کاملہ پر میرا ایمان اور بڑھ جاتا ہے اور یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ میرے مولا تیرا کوئی بھی کام حکمت سے خالی نہیں۔

اگر میں وہاں مر جاتا تو آج شہید کے باپ کا رتبہ حاصل نہ کر سکا ہوتا۔ آیئے! آپ کو پھر واپس ان پہاڑوں اور جنگلوں میں لے جاؤں جہاں روزی کی تلاش میں پتہ نہیں کتنی ماؤں کے بیٹے، کتنی بہنوں کے بھائی اور کتنی خواتین کے سہاگ انگریزوں کی جنگ میں موت کی بھینٹ چڑھ گئے اور جنگلی جانوروں کی روزی کا ذریعہ بن گئے اور اُن کی ہڈیاں وہیں بکھر گئیں۔

برما اور آسام میں رہ کر آنے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہاں اژدھا اور سانپ بے شمار ہیں اور خاص کر درختوں پر رہنے والے ہلکے سبز رنگ کے بہت زہریلے سانپ ہیں جو درخت سے ہی اگر ننگے سر ہو تو ڈس لیتے ہیں اور فوراً موت واقع ہو جاتی ہے۔ وہاں سیاہ رنگ کا بچھو بھی ہے جو درمیانے درجے کے مینڈک کے باہر ہوتا ہے، وہ بھی سانپ جتنا ہی زہریلا ہے۔

اور بھی بہت سی قسم کے سانپ ہیں، رات کو زیادہ تر

گیدڑوں اور سؤروں کے غول آ جاتے تھے۔ جب بھی اندھیرے میں کھڑکھڑاہٹ سنتا تو اپنے پاس رکھی ہوئی پانی کی کیتلی پر جو لوہے کی تھی، پانی پینے والا مگ زور زور سے بجاتا۔ کئی دفعہ غنودگی میں یوں محسوس ہوتا جیسے کوئی جانور میرے منہ کو سونگھ رہا ہے۔ میں ہلتا جلتا تو وہ جانور مجھے بھاگتا ہوا محسوس ہوتا۔ وہ شاید یہ دیکھ رہے ہوتے تھے کہ یہ مر گیا ہے یا زندہ ہے۔ کئی دفعہ میں نے دن کو بھی سانپ اپنی جھونپڑی میں پھرتے دیکھے۔ ایک رات میں نے بہت زیادہ خوف محسوس کیا شاید میں غنودگی میں تھا، جب میں نے ایک خوفناک آواز سنی اِدھر اُدھر دیکھا لیکن اندھیرا تھا، مجھے کوئی چیز نظر نہ آئی دوبارہ وہی آواز آئی تو میں نے جسم کی تمام توانائی اکٹھی کرتے ہوئے اٹھ بیٹھنے کی کوشش کی اور آخر بیٹھنے میں کامیاب ہو گیا۔ میرے سامنے جھونپڑے کے باہر مجھے اندھیرے میں آنکھیں چمکتی ہوئی نظر آئیں جو شاید چار تھیں میں سمجھ گیا کہ یہ کوئی خونخوار جوڑا ہے یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ چیتے ہیں، لگڑ بگڑ ہیں یا پھر بھیڑیے ہیں۔

میں نے اپنی رائفل پر ہاتھ رکھا اور اٹھا کر سیدھی کر لی اس پر اُن کا غرانا تیز ہو گیا۔ مجھے فوراً خیال آ گیا کہ اگر میں نے رائفل چلا دی اور ان میں سے کوئی زخمی ہو گیا تو پھر میری موت یقینی ہے۔ اگر بھیڑیے ہوئے تو شاید بھاگ جائیں لیکن چیتے یا لگڑ بگڑ ہوئے تو مجھ پر حملہ کر دیں گے۔ مجھ میں اتنا بیٹھنے کی سکت بھی نہ تھی، میں نے آہستہ سے رائفل نیچے رکھ دی لیکن اس رات یوں محسوس ہوتا تھا کہ اب میں موت کے سامنے ہار چکا ہوں اور موت جیت رہی ہے۔ میرا جسم پسینہ سے بھیگ چکا تھا اور میں کانپ رہا تھا۔ اسی کیفیت میں پتہ نہیں کتنا وقت گزر گیا اور پتہ نہیں وہ جانور کس وقت چلے گئے تھے۔

میری تو اب جیسے سونے جاگنے کی حس بھی ختم ہو چکی تھی، پتہ نہیں کب غنودگی ہو جاتی اور کب آنکھ کھل

جاتی۔ پو پھوٹ رہی تھی جب میں نے دیکھا کہ وہ جانور وہاں موجود نہیں ہیں لیکن مجھ پر مرنے کا خوف سوار ہو گیا اور بار بار اپنے باپ کا خیال ستانے لگا کہ میرا باپ تو کہتا ہوگا کہ میرا بیٹا کمائی کرنے گیا ہوا ہے لیکن اُسے کیا معلوم کہ بیٹا موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہے اور چند دن کا مہمان ہے۔ حقیقتاً اس دن میں بے حد رویا اور میری ہچکی بندھ گئی۔ ورد و وظیفہ تو جو مجھے یاد تھا وہ میں پڑھتا ہی رہتا تھا اور اللہ کے حضور دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیتا کہ میرے رب تیری اس اَن گنت مخلوقات میں، میں بھی ایک تیرا حقیر سا بندہ ہوں، اپنے پیارے حبیبؐ کے صدقے مجھے بخش دے، مجھ پر رحم فرما اگر میری زندگی ختم ہے تو مجھے عزت کی موت دے دے اور اگر میری زندگی باقی ہے تو مجھ پر اپنا کرم فرما۔ اس کے بعد دن ہو یا رات میری کیفیت یہی ہوتی لیکن اسی دوران جب غنودگی ہو جاتی تو پھر وہی ڈراؤنے خواب آنے لگتے لیکن میں ہوش میں آنے پر اپنے حواس پر قابو رکھتا اور اسی طرح اپنے رب سے مخاطب ہو جاتا۔

یقین کیجئے کہ اس سے مجھے اتنی استقامت ملتی کہ میرے ذہن میں اب مایوس خیالات کی جگہ اچھے خیالات نے جگہ لے لی، اپنے رب سے لَو لگانے سے مجھے اتنا سکون ملتا کہ میرے اندر سے موت کا خوف کم ہو گیا۔

اسی دوران مجھے اپنی مسجد کے مولوی صاحب یاد آنے لگے جو ہر جمعہ کو بڑے پیارے انداز میں واعظ سناتے تھے۔ میں بھی اپنے والد کے ساتھ مسجد میں نماز جمعہ کے لئے جاتا تھا۔ جب واعظ سنتے تھے اُس وقت میں بچہ تھا لیکن عملی زندگی میں قدم رکھ کر جب برما کے ان جنگلوں میں پہنچا تو مولوی صاحب کے کہے ہوئے واقعات میرے سامنے فلم کی طرح چلنے لگے۔ ایک جمعہ کو انہوں نے حضرت یونسؑ کا مچھلی کے پیٹ میں رہنے کا واقعہ سنایا تھا۔ ایک جمعہ کو فرما رہے تھے کہ زندگی کی

حفاظت دو طرح سے ہوتی ہے۔ ایک تو موت خود زندگی کی حفاظت کرتی ہے اور دوسرا اللہ تعالیٰ نے ملائکہ مقرر کر رکھے ہیں جو انسان کی اس وقت تک حفاظت کرتے ہیں جب تک اس کا وقت معین آ نہ جائے۔ اب جب جان پر بنی تو ان باتوں کا مفہوم میری سمجھ میں آنے لگا۔

مجھے وہاں پڑے ہوئے پتہ نہیں کتنے دن گزر چکے تھے۔

میں سوچتا تھا کہ جس قادر مطلق نے حضرت یونس کو مچھلی کے پیٹ میں زندہ رکھا تھا وہی اگر میری زندگی باقی ہے تو کوئی نہ کوئی سبیل پیدا کر دے گا۔ نقاہت اور کمزوری آخری حد تک پہنچ چکی تھی۔ موت کا خوف تو ذہن سے نکل چکا تھا اللہ کے ذکر سے جسم کو طاقت ملتی تھی لیکن اٹھ کر بیٹھنا مشکل ہو گیا تھا۔ غنودگی زیادہ ہونے لگی تھی جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکا تھا۔ بچپن میں خالص خوراک اور کھیل کود کی وجہ سے میرا جسم بڑا مضبوط تھا تب ہی شاید اتنے دنوں تک میں زندہ رہا، کبھی کبھی رونا آ جاتا لیکن آنکھوں میں آنسو بھی خشک ہو چکے تھے۔

وردی جسم کے ساتھ چپک چکی تھی بلکہ لیٹے رہنے سے پشت کی طرف سے پتلون اور شرٹ جگہ جگہ سے گل چکی تھی۔

جگہ نمناک ہونے کی وجہ سے نیچے سے پتہ نہیں دیمک تھی یا چیونٹیاں تھیں یا جونکیں جب کاٹتی تو شدید چبھن اور خارش ہوتی لیکن مرتا کیا نہ کرتا اٹھنے سے بھی معذور تھا۔ یاد نہیں کتنے دن یا کتنے مہینے گزر گئے۔ مجھے سب کچھ خواب لگ رہا تھا۔

ایک صبح سورج اپنی پوری آب و تاب سے نکلا، دھوپ خوب پھیلی ہوئی تھی۔ پہلی بار جھونپڑی میں بھی دھوپ آ رہی تھی۔ دن کا پہلا پہر تھا مجھے ایسی آوازیں آ رہی تھیں جیسے چھوٹے بچے آپس میں لڑ رہے ہوں اور زور سے چیخ رہے ہوں۔ مجھ میں اٹھنے کی سکت ختم ہو گئی تھی۔ میں نے سر کو اِدھر اُدھر پھیرا لیکن مجھے کچھ نظر نہ آیا۔ پوری قوت سے جسم کو اکٹھا کرتے ہوئے اٹھنے کی کوشش کی سر اٹھایا لیکن آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا اور سر پٹھو پر جا لگا۔ پتہ نہیں کتنی دیر گزر گئی جب آنکھیں کھولیں تو ایک ادھیڑ عمر آدمی میری کلائی پر ہاتھ رکھے بیٹھا تھا۔ اس کا نصف بدن ننگا تھا۔ اس کے ساتھ دو چھوٹے چھوٹے بچے میرے سامنے کھڑے تھے۔ اس نے مجھے اٹھا کر بٹھانے کی کوشش کی لیکن میں بیٹھ نہ سکا۔ وہ شخص کسی اجنبی زبان میں مجھ سے باتیں کرتا رہا لیکن مجھے کچھ سمجھ نہ آتی کہ کیا کہہ رہا ہے، ہاتھ کے اشارے سے پتہ چلتا تھا کہ شاید پوچھ رہا تھا کہ میرے ساتھ کیا بیتی ہے۔

میں نے نفی میں سر ہلایا کہ مجھے معلوم نہیں۔ اس نے اپنے پاس سے مٹی کا ایک لوٹا جس کے گلے میں رسی بندھی تھی، اُن بچوں کو دے کر کچھ کہا۔ وہ بھاگ کر چلے گئے اور کچھ دیر بعد پانی کا لوٹا بھر کر لے آئے اب تو پیاس بھی ختم ہو چکی تھی۔ اس نے مگ میں مجھے پانی ڈال کر دیا اور میری بوتل دھو کر باقی پانی اس میں ڈال دیا اس نے اشارے سے مجھ سے کھانے کے بارے میں پوچھا۔ میں نے نفی میں سر ہلایا اس نے اشارہ سے بتایا کہ میں کھانا لاؤں گا۔

وہ وہاں سے اٹھا، بچوں کو اشارہ کیا وہ بھی بھاگتے گئے تھوڑی دیر بعد وہ پانچ چھ چھوٹی چھوٹی گائیں (اتنی تھیں جتنی ہمارے علاقہ میں بچھڑیاں ہوتی ہیں) اکٹھی کر کے میرے سامنے سے گزر گئے غالباً وہ مویشی چرانے یہاں آئے تھے۔ مجھ پر پھر غنودگی غالب آ گئی۔ مجھے معلوم نہیں کہ کتنی دیر بعد وہ آدمی واپس میری جھونپڑی میں داخل ہوا اس کے ساتھ ایک جواں سال آدمی اور بھی تھا۔

گو کہ میں نیم مردہ حالت میں پڑا تھا لیکن میرا ذہن صحیح کام کر رہا تھا۔ میں نے فوراً اٹھل اپنے پہلو سے

لگائی اور یہ سوچ لیا کہ اگر انہوں نے میرے ساتھ کوئی ہیرا پھیری کی تو میں رائفل چلا دوں گا، ویسے تو میں ان کے ایک گھونسے کی مار تھا۔ دونوں میرے قریب بیٹھ گئے۔ جوان نے اپنی زبان میں مجھ سے مخاطب ہو کر کوئی بات کی جو میں نہ سمجھ سکا۔ پھر اس نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں مجھ سے پوچھا کہ یہاں کتنے دن ہو چکے ہیں۔ میں نے نحیف آواز میں جواب دیا مجھے یاد نہیں۔ اس نے میرا نام پوچھا اور بٹالین کا پوچھا میں نے اپنی کٹ کی طرف اشارہ کر دیا۔

اس نے میری کٹ کو کھول کر زمین پر الٹا اس میں جو تھوڑا بہت سامان تھا ایک طرف رکھا اس میں سے ایک ایک روپے کے دو سکے اور دو سگریٹ بھی نکلے۔ سگریٹ تو نمی کی وجہ سے گل سڑ چکے تھے، دونوں سکے میں نے اُن کو دے دیئے جو بڑی مشکل سے انہوں نے قبول کیے۔

اس دور میں ایک روپے کا ایک سیر دیسی گھی ملتا تھا یعنی ایک روپیہ آج کے آٹھ سو روپے سے بھی زیادہ قدر رکھتا تھا۔

انہوں نے آپس میں کوئی باتیں کیں اور جوان نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے ٹوٹی پھوٹی اردو میں کہا کہ میں پہلے گاؤں جاؤں گا، وہاں سے خچر پر تمہارے کیمپ جاؤں گا جو یہاں سے تیس میل سے زیادہ ہے، وہاں جا کر تمہارے بارے میں اطلاع کروں گا۔

چنانچہ وہ میری فوجی کٹ لے کر مجھ سے رخصت ہو گیا۔ اس وقت دن کا تیسرا پہر تھا پھر شام ہو گئی اور پھر رات گزر گئی۔ اگلے روز دوپہر کا وقت تھا مجھے کسی گاڑی کی آواز دور سے آ رہی تھی پھر آہستہ آہستہ گاڑی میرے قریب آ کر رک گئی، وہ فوجی ٹرک تھا اور اس کے ساتھ ایک فوجی جیپ تھی۔ ٹرک سے پچیس کے لگ بھگ فوجی اترے سب میری طرف بڑھ رہے تھے، وہ جوان جو گزشتہ روز میرے پاس آیا تھا وہ ان کی راہنمائی کر رہا تھا۔

سب کے پاس رائفلیں تھیں ان میں شاید ایک ڈاکٹر تھا، ایک جمعدار تھا۔ جمعدار اور ڈاکٹر میرے پاس آ گئے مجھ سے ہاتھ ملایا۔

ڈاکٹر میرے پاس بیٹھ گیا، مجھے ہر طرح سے چیک کیا اور حوالدار کو باہر لے گیا اس کے ساتھ کوئی بات کی پانچ چھ جوان کلہاڑیاں اور ''دھا'' (یہ اُس علاقے کا ہتھیار ہے) لے کر میری جھونپڑی سے تھوڑے فاصلے پر لگے بانس کاٹنے لگے تقریباً آٹھ فٹ لمبے اور تین انچ موٹے اور ان کے ساتھ چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کاٹ کر جھونپڑی کے قریب آ گئے۔ حوالدار نے دو تین سپاہیوں کی مدد سے مجھے آرام سے اٹھا کر بٹھا دیا۔ ایک جوان میری پشت کی طرف بیٹھ گیا اور مجھے سہارا دیئے رکھا۔ سب نے منہ پر ہاتھ اور رومال رکھے ہوئے تھے۔ میرا نیم مردہ جسم بو چھوڑ گیا تھا۔ جب انہوں نے مجھے اٹھا کر بٹھایا تو کوئی استغفار پڑھ رہا تھا تو کوئی واہ سبحان اللہ کہہ رہا تھا۔ جب میری پشت کو دیکھتے تو کانوں کو ہاتھ لگاتے تھے۔

مجھے بعد میں بتایا گیا کہ تمہاری پشت کی طرف سے کھال ادھڑ چکی ہے، بنیان اور شرٹ تو مکمل گل چکی تھیں۔

دونوں بانسوں پر چھوٹی چھوٹی لکڑیاں رکھ کر ان کو بڑے بانسوں سے باندھ کر سٹریچر سا بنا لیا گیا اس کے اوپر بید اور گھاس ڈالا گیا اس کے اوپر دو تین کمبل ڈالے گئے اوپر پلاسٹک شیٹ ڈال کر اوپر ایک چادر بچھا دی گئی۔

حوالدار نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ چار جوان آگے آ جاؤ بالکل آرام سے اس کو اٹھا کر سٹریچر پر ڈالو۔ انتہائی نرم ہاتھوں سے انہوں اٹھا کر مجھے سٹریچر پر ڈالا میرا سامان بمعہ میرے بوٹ ایک بوری میں ڈال کر گاڑی میں رکھ لئے گئے۔ میرے اوپر ایک کمبل اور ایک پلاسٹک

شیٹ ڈالی گئی کیونکہ ہلکی بارش شروع ہو چکی تھی میرا اسٹریچر جیپ میں رکھ دیا گیا اور یہ قافلہ روانہ ہو گیا۔

دونوں گاڑیاں ایک ہسپتال میں جارکیں۔ خیمے لگا کر عارضی ہسپتال بنایا گیا تھا، چار طرف کانٹے دار تار لگائی گئی تھی۔ مجھے آرام سے اٹھا کر ایک خیمے میں لے گئے اور بستر پر ڈال دیا۔ وہاں ایک لیڈی ڈاکٹر اور ہسپتال کے عملے کے تین چار افراد موجود تھے۔ حوالدار نے ایک کاغذ پر کچھ لکھا اور لیڈی ڈاکٹر کو دے دیا اور میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ یہاں تمہارا ہر طرح سے خیال رکھا جائے گا، فکر نہ کرنا۔

وہ سب چلے گئے، ہسپتال کا عملہ اور لیڈی ڈاکٹر بھی مجھے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ میری شکل ڈراؤنی ہو چکی تھی، آنکھیں ہی شاید رہ گئی تھیں، جسم تو ڈھانچہ بن چکا تھا۔

لیڈی ڈاکٹر نے دو آدمیوں کو کہا کہ ویل چیئر بیڈ کے ساتھ لگا کر اس کو ویل چیئر پر بٹھاؤ چنانچہ انہوں نے مجھے ویل چیئر پر بٹھا دیا۔

لیڈی ڈاکٹر نے ایک نرسنگ سپاہی کو کہا کہ کینٹین سے ایک بالٹی میں نیم گرم پانی اور دو تولیے لے آؤ۔ ایک آدمی جو شاید ہسپتال کا سوپر تھا، اسے کہا کہ قینچی لے کر اس کی ساری وردی کاٹ دو اور اس سفید کپڑے سے اس کا تہبند باندھ دو۔ اس نے میری وردی کاٹ دی اور ایک کپڑے کا تہبند مجھے باندھ دیا۔ اب دوسرا آدمی پانی لے آیا۔ لیڈی ڈاکٹر نے کہا کہ سر سے لے کر پاؤں تک تولیہ بھگو کر بالکل آہستہ آہستہ اس کے جسم پر پھیرو۔

اس نے اسی طرح کیا۔ لیڈی ڈاکٹر نے دوبارہ کہا کہ اب خشک تولیہ لے کر اس کا جسم خشک کرو۔ جب یہ عمل کر چکے تو انہوں نے مجھے ایک اور تہبند باندھ دیا۔ پہلے والا گیلا ہو چکا تھا۔ اب مجھے بستر پر لٹا دیا گیا۔ لیڈی ڈاکٹر نے مجھے چیک کرنے کے بعد نرسنگ سپاہی کو کہا کہ

سب سے زیادہ وزنی چیز

قیامت کے دن مومن کے میزان میں جو سب سے زیادہ وزنی چیز رکھی جائے گی وہ اُس کا **حُسنِ اخلاق** ہوگا۔

☆ محمد زہیر۔ لاہور

کینٹین سے دو اونس دودھ نیم گرم لے آؤ، تھوڑی دیر بعد دودھ آ گیا۔ لیڈی ڈاکٹر نے ایک شیشی سے سفید رنگ کا سفوف چٹکی بھر دودھ میں ڈالا اور مجھے پلا دیا۔ میں نے لیڈی ڈاکٹر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا کہ اس سے تو میرا منہ بھی تر نہیں ہوا۔

بہر حال پہلے روز مجھے دن میں تین بار اتنا ہی دودھ دیا جاتا رہا، دوسرے دن مقدار دگنی کر دی گئی، تیسرے دن سہ گنا، صبح دوپہر شام دودھ دیا گیا۔ آٹھویں دن تک تین وقت کا ڈیڑھ سیر کے قریب دودھ دیا گیا۔ آٹھواں دن تھا جب میں خود اٹھ سکتا تھا۔ ابھی چلنے پھرنے کے قابل نہیں ہوا تھا۔ لیڈی ڈاکٹر میرے پاس آ کر بیٹھ گئی بہت خوش مزاج خاتون تھی، اس کی باتوں کا انداز اتنا میٹھا تھا کہ مریض کی آدھی بیماری تو اسی سے دور ہو جاتی تھی۔
اس میڈیکل کیمپ میں مریض تھے ہی کتنے، ایک میں تھا اور تین آدمی اور تھے۔ ایک تو سانپ کا ڈسا ہوا تھا، سانپ کوئی زیادہ زہریلا نہیں تھا اس لئے وہ بچ گیا تھا۔

لیڈی ڈاکٹر کا نام مجھے یاد نہیں آ رہا۔ مجھے بابو کہہ کر پکارتی تھی۔ جب میرے پاس میرے بیڈ پر بیٹھی تو میں بھی اٹھ بیٹھا۔

”ڈاکٹر صاحبہ! اس دودھ پر میرا گزارا کب تک ہو گا؟“ میں نے اس سے کہا۔ ”اب تو مجھے بھوک لگتی ہے، کھانے کے لئے بھی کچھ دو“۔

”بابو! تمہیں معلوم ہے کہ کتنے دن تم وہاں پڑے رہے ہو؟“ لیڈی ڈاکٹر نے مسکرا کر پوچھا۔

"اللہ ہی بہتر جانتا ہے، مجھے تو کچھ یاد نہیں"۔ میں نے کہا۔

اس نے جھونپڑی میں رہنے کا عرصہ بتایا تو میں بھی حیران رہ گیا۔

"تم دو مہینے اور آٹھ دن سے لاپتہ ہو"۔ اس نے میرے کاغذات سامنے رکھے اور کہا۔ "اس دوران اگر تم نے کچھ کھایا ہے تو تم ہی بتا سکتے ہو"۔

"ڈاکٹر! جھاڑیوں کے پتوں کے علاوہ میں نے کچھ بھی نہیں کھایا"۔ میں نے کہا۔ "یا پانی پیتا رہا تھا"۔

"تمہیں ٹائیفائیڈ بھی رہا ہے"۔ لیڈی ڈاکٹر نے مجھے بتایا۔ "جس سے تمہارے سر کے بال اسی فیصد جھڑ چکے ہیں لیکن ابھی تم جوان ہو یہ پھر اُگ آئیں گے۔ یہ تو تمہاری کوئی نیکی تمہارے کام آئی ہے اور یہ معجزہ ہی ہوا ہے کہ تم بچ گئے ہو۔ پرہیزی کھانا تمہیں اس لئے دیا جارہا ہے کہ تمہارا معدہ اور آنتیں آپس میں چپک گئی ہیں اگر ان گزشتہ ایام میں تم کو ایک نوالہ بھی دیا جاتا تو تمہاری ہلاکت کے لئے کافی ہوسکتا تھا"۔

میں یہ سن کر بڑا حیران ہوا اور اللہ کا شکر ادا کرنے لگا۔

"کل تمہیں صرف ایک چھٹانک وزنی چپاتی اور ایک چمچہ شوربہ دیا جائے گا"۔ لیڈی ڈاکٹر نے کہا۔ "پھر یہ مقدار آہستہ آہستہ بڑھائی جائے گی لیکن صبح حسب سابق تم کو دودھ ملے گا۔ دوپہر کھانے سے پہلے تمہیں بنیان اور پاجامہ مل جائے گا اور نیم گرم پانی سے غسل کرنا۔ ویسے بھی کل کرنل صاحب دورے پر آرہے ہیں"۔

دوسرے دن ہسپتال کے ورکر نے میری مدد کی اور میں نے غسل کیا۔ میں اپنے آپ کو کافی ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا لیکن پشت پر شدید چبھن اور خارش ہوتی جس پر روزانہ دوائی لگائی جاتی تھی۔

دوپہر کے بعد کرنل آگیا۔ میرے بیڈ کے پاس کافی دیر کھڑا رہا۔ کرنل انگریز تھا لیکن اردو بولتا اور سمجھتا تھا۔ میں نے کہا سر میرے گھر کوئی اطلاع بجھوائی گئی ہے تو اس نے جمعدار کی طرف اشارہ کیا۔ جمعدار نے کاغذات دیکھے اور مجھے بتایا کہ پہلے تو تمہارے لاپتہ ہونے کی اطلاع بجھوائی گئی تھی لیکن چند دن پہلے تمہاری دستیابی کی اطلاع بجھوادی گئی ہے۔ میں نے اُن کا شکریہ ادا کیا۔

کرنل نے جمعدار کو کہا کہ اسے کچھ رقم دے دو، جمعدار نے چودہ روپے مجھے دیئے جو آج کے دس ہزار روپے کے برابر تھے۔ اس دوران کھانے کی مقدار بڑھائی جاتی رہی۔ ایک ہفتہ بعد مجھے ایک عام صحت مند آدمی کی طرح کھانا ملنے لگا۔ اب میں خود چل پھر سکتا تھا۔ مجھے اجازت بھی دے دی گئی کہ خاردار تار کے اندر اندر چلتے پھرتے رہو۔ ساتھ ہی لیڈی ڈاکٹر نے کہا کہ کل میں تمہاری رپورٹ لاہور تمہارے سینٹر کو بھیج رہی ہوں اور تمہیں محاذ جنگ کی بجائے تمہارے سینٹر میں بھیجا جائے گا اور تمہاری ایک ماہ کی چھٹی کا بھی میں لکھ دوں گی۔

خدا جانے لیڈی ڈاکٹر کو مجھ سے اتنی ہمدردی تھی یا ہر مریض کے ساتھ وہ اسی طرح پیش آتی تھی۔

میں صحت یاب ہو چکا تھا اور ساتھ ہی لاہور سے میرے نام لیٹر بھی آگیا۔ جس میں ایک ماہ کی چھٹی کے بعد لاہور سینٹر میں رپورٹ کرنے کا کہا گیا۔ مجھے ہسپتال سے فارغ کر دیا گیا۔ وہاں موجود سب لوگوں نے میرے ساتھ جو سلوک کیا تھا میرا دل چاہتا تھا کہ میں یہیں ان لوگوں کے ساتھ ہی زندگی گزار دوں۔ ایسا ماحول تو شاید گھر میں بھی میسر نہ تھا۔ دوسرے دن میں نے تیاری شروع کر دی۔ سامان تو کوئی میرے پاس تھا نہیں مجھے ایک جوڑا شلوار قمیص کا دیا گیا جو مجھے نہیں معلوم کہاں سے لیا گیا تھا اور ایک جوڑا چپل دی گئی۔ مجھے بتایا گیا کہ یہاں سے پانچ میل دور "ڈیما پور" ریلوے سٹیشن

ہے، چمن سے چھوٹی ریل ''اڑھائی فٹ پٹری پر چلنے والی'' اسے نیرو گیج بھی کہتے تھے، شام چھ بجے یہاں سے دہلی کے لئے روانہ ہوتی ہے۔ فوجی ہونے کے ناطے میرا ٹکٹ فری تھا۔ میرا پاس بھی بن گیا۔ دوپہر کا کھانا کھا کر میں سب کو ملا۔ لیڈی ڈاکٹر کا بار بار شکریہ ادا کیا۔ میرے آنسو گر رہے تھے۔

''بابو! ہم نے تو اپنا فرض ادا کیا ہے''۔ لیڈی ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا۔

پھر میں وہاں سے رخصت ہو گیا۔ سٹیشن کا راستہ مجھے سمجھا دیا گیا۔ سفر تو زیادہ نہ تھا لیکن راستہ دشوار گزار تھا۔ جھاڑیوں وغیرہ سے گزر کر جانا تھا۔ شام چار بجے کے لگ بھگ میں ریلوے سٹیشن پہنچ گیا۔ چھوٹا سا سٹیشن تھا دور دور تک آبادی نظر نہیں آ رہی تھی۔ سٹیشن پر بھی کوئی آدمی نظر نہ آیا تو میں بکنگ آفس کی طرف چل پڑا۔ ٹکٹ لینے والی کھڑکی کے پاس ایک چوکیدار کھڑا تھا۔ اس سے گاڑی کے آنے کا وقت پوچھا تو اس نے بتایا کہ گاڑی کا وقت تو شام چھ بجے ہے لیکن لیٹ بھی ہو سکتی ہے۔

''ایک گھنٹہ بعد ٹکٹ آفس کھل جائے گا''۔ اس نے کہا۔ ''تب تم ٹکٹ لے لینا ویسے بھی یہاں کوئی رش تو ہے نہیں مقررہ وقت تک چند ہی مسافر ہوں گے''۔

میں وہاں سے اٹھ کر ایک شیڈ کے نیچے آ کر سیمنٹ کے بنے ہوئے بینچ پر بیٹھ گیا۔ کافی دیر بعد ریلوے پولیس کے دو سپاہی میرے سامنے سے گزرے تو میں نے آواز دے کر ان کو روک لیا اور بتایا کہ میں فوجی ہوں، جب گاڑی آئے تو میری مدد کرنا اور مجھے سیٹ دلوا دینا۔ اس دور میں فوجی کی عزت بہت زیادہ کی جاتی تھی۔ انہوں نے وعدہ کر لیا۔ میں اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔

میرے دائیں ہاتھ ایک چھوٹا سا کیبن بنا ہوا تھا جہاں سگریٹ اور دوسری چھوٹی چیزیں تھیں اور ایک بزرگ آدمی اندر بیٹھا تھا۔ میں جب سے فوج سے الگ ہوا تھا اور بیمار پڑا رہا تھا، میں نے سگریٹ چھوڑ دیئے تھے۔ اب سگریٹ دیکھ کر مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے ایک پیکٹ خرید لیا۔ سگریٹ لے کر واپس پلٹا تو کیبن کے پیچھے سے ایک نوجوان لڑکی میرے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ مجھے السلام علیکم کہا اور کہنے لگی بھائی صاحب آپ نے کہاں جانا ہے۔ میں نے سلام کا جواب دیا اور بے رخی سے جواب دیا کہ تمہیں اس سے کیا کہ میں نے کہاں جانا ہے۔

''ہم دو بہنیں ہیں''۔ اس نے کہا۔ ''دوران سفر ہمارا کوئی سہارا نہیں، ہم چاہتی ہیں کہ ہم آپ کے سہارے سفر کریں، ہمیں تحفظ کی ضرورت ہے''۔

''میں آپ کو ساتھ نہیں لے جا سکتا''۔ میں نے کہا۔ ''کیونکہ میں تو ایک فوجی ہوں''۔

''اسی لئے تو ہم آپ کا تحفظ چاہتی ہیں''۔ اس نے کہا۔ ''ورنہ کوئی نہ کوئی تو اللہ کا پیارا ہمیں مل ہی جائے گا''۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کی آواز رندھیا گئی اور اس کے آنسو گرنے لگے۔ میں خاموش کھڑا تھا اور وہ آنسو پونچھتے ہوئے واپس چل پڑی۔ میں وہیں کھڑا تھا۔ چند ہی منٹ بعد اس کی بڑی بہن میرے پاس آ کھڑی ہوئی۔

''دیکھ بابو! تجھے اللہ اور رسول کا واسطہ''۔ وہ ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی۔ ''ہمارے سر پر ہاتھ رکھ لو، ہمیں تحفظ مل جائے گا۔ ہمارا اس دنیا میں کوئی نہیں۔ سفر میں ہم آپ کو کوئی تکلیف نہیں دیں گی، ہم تمام عمر آپ کو دعائیں دیں گی''۔

میں سوچ میں پڑ گیا کہ اسے کیا جواب دیں۔

''مجھے خود پتہ نہیں کہ میری منزل کہاں ہے''۔ میں نے کہا۔ ''میں ایک فوجی ہوں اگر کوئی مجھ سے پوچھ لے کہ یہ کون ہیں تو میں کیا جواب دوں گا''۔

''تم ہمیں صرف دہلی تک لے جاؤ''۔ اس نے

ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔
"لیکن تم نے جانا کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔
"دہلی تمہارا کون ہے؟"
"ہمارا باپ ہندوستانی ہے"۔ اس نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ "بہت عرصہ قبل وہ جاپان آ گیا اور وہیں اس نے شادی کر لی۔ اُن کی کل اولاد ہم دو ہی بیٹیاں تھیں۔ ہمارے والدین کو جاپانیوں نے جاسوسی کے الزام میں گرفتار کرلیا تھا اور بعد میں دونوں کو قتل کر دیا۔ ہم جس طرح وہاں سے یہاں تک پہنچی ہیں یہ ایک الگ داستان ہے۔ ہمارے پاس بہت ساری رقم اور سونے کی چار اینٹیں ہیں جن کا وزن آدھ سیر سے زیادہ ہے۔ ہندوستان میں ہمارے اپنے مکان ہیں، بہت سے رشتہ دار بھی ہیں، ہمیں اُن تک پہنچا دو اور اس میں سے جتنی رقم اور سونا چاہو رکھ لو"۔
میں نے پوچھا کہ دہلی جانا ہے یا اس سے آگے تو انہوں نے بتایا کہ لاہور۔ پھر میں نے پوچھا کہ لاہور خاص یا ساتھ کسی گاؤں وغیرہ میں تو اس نے بتایا کہ ضلع جہلم کا ایک مشہور و معروف قصبہ ہے کلر کہار اس کے ساتھ ایک گاؤں ہے وہاں جانا ہے۔ میں پھر سوچ میں پڑ گیا کہ کیا یہ واقعی سچ بول رہی ہے یا ان کے پاس میرے بارے میں پوری معلومات ہیں اور مجھے دھوکہ دے رہی ہیں۔ ہوسکتا ہے یہ جاسوسی کے لئے میرے ساتھ روابط بڑھا رہی ہیں۔ ابھی میں ان ہی سوچوں میں گم تھا کہ اس نے بغل کے نیچے سے ایک پوٹلی نکال کر میری طرف پھینک دی اور خود میرے پاؤں پکڑ لئے اور کہا کہ یہ رقم اور سونا رکھ لو ہم میں سے جس سے چاہو شادی کر لینا۔
میں نے اُسے اوپر اٹھایا تو وہ رو رہی تھی، اس کی چھوٹی بہن بھی آ کر ساتھ کھڑی ہو گئی۔
میں نے رقم اور سونے والی پوٹلی اٹھا کر واپس کر دی اور کہا کہ اللہ تمہیں یہ سب کچھ نصیب کرے۔
اتنا ڈھیر سارا مال واپس کرنے پر نہ اُس وقت میں پشیمان تھا اور اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد۔ آج بھی مجھے اس کا کوئی دکھ نہیں بلکہ میں مطمئن ہوں کہ میں لالچ میں نہ آیا۔
بہرحال اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے ہوئے میں نے اُن کو ساتھ لے جانے کی ہامی بھر لی اور ان کو کہا کہ اگر راستے میں کوئی پوچھے تو تم بے دھڑک ہو کر بتا دینا کہ ہم اس کی بیویاں ہیں اور یہ کسی پر بالکل ظاہر نہ ہونے دینا کہ تم دونوں آپ میں بہنیں ہو۔ انہوں نے کہا کہ ایسا ہی ہوگا۔
گاڑی کے آنے کا وقت بھی ہو چکا تھا۔ سٹیشن پر ابھی بھی کوئی خاص رش نہ تھا۔ انہوں نے مجھے ٹکٹ کے لئے روپے دیئے اور میں نے جا کر اُن کے لئے دو ٹکٹ دہلی کے لئے خرید لئے اور اپنا پاس دکھا کر رسید حاصل کر لی۔ کافی انتظار کے بعد گاڑی آئی یہ اڑھائی فٹ چوڑی پٹڑی پر چلنے والی چھوٹی ریل تھی۔ رات کے ساڑھے سات بج چکے تھے، جب ریل گاڑی نے وہ سٹیشن چھوڑا۔
ہمیں ایک ساتھ ہی سیٹیں مل گئیں، ریلوے سپاہی نے بھی ہماری مدد کی۔ جہاں کہیں کسی سٹیشن پر اُن کو کوئی چیز ضرورت ہوتی تو میں اُن کو لا دیتا۔ پہلی رات گزر گئی لیکن ہم نے کوئی بات نہ کی۔ صبح میں اپنے لئے اور اُن کے لئے ناشتہ لے کر آیا۔ میں الگ کھانا چاہتا تھا لیکن انہوں نے اتنی ضد کی کہ میں مجبور ہو گیا اور اکٹھے ناشتہ کیا۔ بڑی بہن نے بات شروع کی اور اپنے والدین کے حالات بتائے اور بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ہم میں سے جس بہن سے شادی کرنا چاہو ہمیں کوئی عذر نہ ہوگا۔
انہیں کیا معلوم کہ گزشتہ چار سال سے میری منگیتر جو کہ میری پھوپھی کی بیٹی تھی، میرا انتظار کر رہی تھی۔ ہم اکٹھے کھیلے اور بڑے ہوئے تھے۔ عمر میں وہ مجھ سے ایک سال چھوٹی تھی۔ ہمیں ایک دوسرے سے بے حد پیار تھا،

ہم نے ہمیشہ ایک ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائی تھیں۔ فوج میں بھرتی ہونے کے لئے جب میں بہاولپور گیا تھا تو اُسے مل کر گیا تھا۔ جب بھی میں چھٹی آتا ہماری ملاقات علیحدگی میں ضرور ہوتی۔ عہد و پیمان کی تجدید ہوتی، ایک ساتھ جینے مرنے کا عہد ہوتا۔ ہماری شادی کب ہونی تھی اس کا مجھے کوئی علم نہ تھا۔ میرے والد تو اس کے لئے ہمہ وقت تیار تھے لیکن پھوپھی کی طرف سے دیر تھی۔ ویسے بھی دیہاتوں میں منگنیاں سالہا سال تک چلتی رہتی تھیں۔ میری ہمسفر دونوں بہنیں انتہا کی خوبصورت تھیں، مال دولت بھی تھا، زرعی اراضی کے علاوہ گاؤں میں مکان بھی تھے، ہر طرح سے انہوں نے مجھے قائل کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے جسے بچپن سے چاہا تھا اُسے نہ تو میں دھوکہ دے سکتا تھا اور نہ ہی چھوڑ سکتا تھا۔

اُن کی خواہش کو میں نے خاموشی سے رد کر دیا میں کچھ نہ بولا۔ وہ میری خاموشی کو شاید میری رضامندی سمجھ رہی تھیں۔ بہر حال میرا سفر تو خوش گوار ہو گیا تھا ساتھ ساتھ مجھے یہ بھی خوشی ہو رہی تھی کہ قدرت نے مجھے ان کے تحفظ کے لئے پسند فرما لیا ہے اور میں دل میں یہ دعائیں مانگ رہا تھا کہ میں خیریت سے ان کو ان کی منزل تک پہنچادوں۔

گاڑیاں بدلتے سفر کرتے چودہ دن بعد ہم جہلم پہنچے۔ دونوں بہنوں کی خوشیاں انتہا کو پہنچ چکی تھیں کہ وہ باخیریت اپنی منزل پر پہنچنے والی ہیں۔ وہ بار بار مجھ سے میرے گاؤں کا نام اور میرا نام پوچھتی رہیں اور میں بڑی خوش اسلوبی سے اُن کو ٹالتا رہا۔ انہوں نے مجھے بار بار کہا کہ بابو ایک ٹکڑا سونے کا اور کچھ رقم لے لو کسی وقت کام آئے گی۔ میرے مسلسل انکار پر وہ خاموش ہو جاتی تھیں۔ جہلم سے آگے ابھی ہم نے دو گاڑیاں اور بدلنی تھیں جب ہماری گاڑی کا آخری سٹیشن چند گھنٹے کی مسافت پر رہ گیا تو بڑی بہن نے ایک کاغذ پنسل نکالی اس پر کچھ لکھا اور میرے قریب ہوتے ہوئے میرا ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام کر بولی۔

''بابو! تم نے تو اپنا نام بھی نہیں بتایا، بہر حال یہ ہم دونوں بہنوں کے نام والدین اور دو چچاؤں اور گاؤں کا نام لکھا ہے، یہ اپنے پاس رکھو تم، جب چاہو ہمارے پاس آ سکتے ہو۔ ہو ہم حلفاً کہتی ہیں کہ ہم دونوں پورا ایک سال تمہارا انتظار کریں گی''۔

میرا اسٹیشن پہلے آنا تھا میرا گاؤں اُن کے گاؤں سے بیس بائیس مل پہلے آنا تھا۔ میرے اترنے میں چند ہی منٹ کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ میں اٹھا میرے پاس سامان ہی کیا تھا کھجور کے پتوں کا بنا ہوا ایک تھیلا تھا جو میں نے جہلم سے لے کر والد کے لئے کھانے کی چند اشیاء خرید کر اس میں رکھی تھیں اٹھایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

''اچھا بھئی زندگی میں کوئی وقت آیا تو پھر ملیں گے''۔ میں نے ان کو مخاطب کر کے کہا۔ ''میرا اسٹیشن قریب آ گیا ہے''۔

دونوں نے انتہائی حیرت اور غمگین نظروں سے مجھے دیکھا۔ دونوں یک دم اٹھ کھڑی ہوئیں اور بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگ گئیں۔ میں نے اُن کو حوصلہ دیا۔ بہت وقت گزر گیا ہے شاید اس بات پر کوئی یقین نہ کرے دونوں بہنیں مجھ سے بغلگیر ہو کر زور زور سے رونے لگیں اور منتیں کرنے لگیں کہ ہمارے گھر تک چلو پھر واپس آ جانا۔ میرا اسٹیشن بالکل قریب آ گیا تھا اور اُن سے جان چھڑانی مشکل ہو رہی تھی۔

''آخری سٹیشن پر اتر کر تانگہ یا کوئی گاڑی لے لینا''۔ آخر میں نے اُن سے کہا۔ ''ویسے بھی دن کا زیادہ حصہ باقی ہے تم آسانی سے گھر پہنچ سکتی ہو۔ تمہیں کوئی خطرہ نہیں علاقہ بھی پُر رونق ہے اور میں جلد تمہارے پاس آؤں گا''۔ اتنے میں گاڑی رکنے لگی چھوٹا سٹیشن تھا چند منٹ گاڑی رکنی تھی۔ بڑی مشکل سے میں نے اپنی جان

چھڑائی اور ایک الوداعی نظر اُن پر ڈالی اور گاڑی رکی تو میں نیچے اتر آیا۔ مسافر چند ہی تھے جو اتر آئے دونوں گاڑی کے دروازے میں کھڑی ہاتھ ہلا رہی تھیں۔ اتنے میں گاڑی نے وسل دی اور چل پڑی، میں اپنی منزل کی طرف چل پڑا۔

بغیر اطلاع کے اچانک جب میں اپنے گاؤں میں داخل ہوا تو ہر ملنے والا آدمی حیرت سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میرے لاپتہ ہونے کی خبر سے تو گاؤں کا ہر فرد آگاہ تھا لیکن میری دستیابی کی اطلاع جیسا کہ میرے والد نے مجھے بتایا میرے آنے سے دو روز پہلے ملی تھی۔

جب میں گھر پہنچا تو تھوڑی دیر میں ہی آدھا گاؤں بچے، جوان، بوڑھے اور خواتین پہنچ گئیں اور میرے والد کو مبارک بادیں دے رہے تھے۔

میرا والد اپنی اور ایک ہندو کی دُکان سے بتاشے اور کھانے جو اُس دور کا مشہور تحفہ سمجھا جاتا تھا، دو ٹوکرے اٹھا لایا اور لوگوں میں تقسیم کرنے شروع کر دیئے۔ شام تک ہمارے سارے رشتہ دار آ گئے تھے لیکن میری نظریں جنہیں ڈھونڈ رہی تھیں وہ مجھے نظر نہیں آ رہے تھے۔ وہ تھی میری پھوپھی اور اس کا خاوند۔ کسی نے میرے لئے پانی گرم کیا، والد صاحب اندر سے کپڑے اٹھا لائے، مجھے کہا کہ نہا لو۔ میں نے نہا کر کپڑے بدلے شام کو لوگ آہستہ آہستہ اپنے گھروں کو چلے گئے۔ کھانا کھانے کے بعد رات کو دوبارہ محفل جم گئی۔ لوگ مجھ سے مجھ پر بیتنے والی کہانی سن رہے تھے اور اس پر ساتھ ساتھ مختلف تبصرے کر رہے تھے۔ جب میں نے بتایا کہ کچھ کھائے بغیر میں صرف پانی پر 78 دن اکیلا جنگل میں پڑا رہا تو لوگوں نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

کافی دیر تک لوگ بیٹھے رہے اور پھر آہستہ آہستہ لوگ اٹھ کر چلے گئے لوگوں کے چلے جانے کے بعد میں نے والد صاحب سے پوچھا کہ پھوپھی اور اس کا خاوند نہیں آئے؟

''تمہاری پھوپھی ویسے بھی منگنی توڑنے کے بہانے ڈھونڈ رہی تھی''۔ والد صاحب نے بتایا۔ ''تمہارے لاپتہ ہونے کی خبر سنتے ہی اس نے منگنی توڑ دی تھی۔ اندرون خانہ وہ بیٹی کا رشتہ اپنے خاوند کے بھانجے کو دے چکی تھی اور یہ خبر مجھ تک پہنچ چکی تھی اور بعد میں جب میں نے تمہاری پھوپھی کو اپنے گھر بلا کر بات کی تو اس نے صاف جواب دے دیا تھا اور دو ماہ قبل اس نے اپنی بیٹی کا نکاح بھی کر دیا ہے اور سنا ہے کہ رخصتی بھی ہونے والی ہے''۔

میں اس طرح خاموش تھا کہ جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ مجھے بار بار وہ ملاقاتیں یاد آتی جن میں ہم نے ساتھ مرنے جینے کی قسمیں کھائی تھیں اور ایک ساتھ یہ وعدہ بھی کیا تھا کہ اگر ہم میں سے کسی پر جبراً کوئی حکم ٹھونسا گیا تو ہم اپنی جان تک دے دیں گے۔

''بیٹا! فکر نہ کرو، رشتے بہت ہیں''۔ مجھے سوچوں کے سمندر میں غرق دیکھ کر میرے والد نے میرے کندھے پر تھپکی دیتے ہوئے کہا۔ ''تم اگر چاہو تو تمہاری اسی چھٹی میں تمہاری شادی کرا سکتا ہوں۔ تمہاری منگیتر اپنے نکاح کے بعد بھی کئی بار مجھے ملی ہے۔ اس نے رو رو کر برا حال کیا ہوا ہے کہہ رہی تھی کہ میرے والد نے میرا نکاح زبردستی پڑھوایا ہے۔ مجھے دھونس دھاندلی اور پھر پیار سے نکاح پر راضی کرنے کی کوشش کی۔ پرسوں سے اسے جب اطلاع ملی ہے کہ محمد خان زندہ ہے اور واپس آ گیا ہے تو اس نے کھانا پینا چھوڑ دیا ہے، یہ رات کو ایک عورت نے مجھے بتایا ہے''۔

والد کی یہ باتیں سن کر بھی میں اپنی منگیتر کو ہی قصوروار گردان رہا تھا۔ والد مجھے سونے کا کہہ کر اپنے بستر پر چلے گئے۔ میں اپنے کمرے میں چلا گیا، اپنی چارپائی کے پاس کھڑے ہو کر میں نے منہ آسمان کی طرف کیا اور

اپنے رب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''اے اللہ تُو گواہ رہنا میں زندگی بھر اپنی سابقہ منگیتر سے نہ ہی بولوں گا اور نہ ہی زندگی بھر شادی کروں گا''۔

میری چھٹی کے ابھی کچھ دن باقی تھے، ایک شام مجھے ایک عورت کے ذریعے پیغام ملا جو میری منگیتر نے بھیجا تھا کہ آج رات میں فلاں جگہ آؤں گی، تم بھی آ جانا۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا لیکن میں ذہنی طور پر بہت پریشان تھا اور اپنے رب سے عہد بھی کر چکا تھا کہ نہیں ملوں گا۔ رات کانٹوں پر گزر گئی، دوسرے دن پھر وہی عورت آ گئی۔ میں گھر میں اکیلا ہی تھا، اس نے مجھے بتایا کہ تمہاری منگیتر نے پیغام بھیجا ہے کہ اگر آج تم نہ آئے تو صبح میری زندگی کا آخری دن ہوگا۔ رات کو بھی میں آگ کے دریا سے گزر کر آئی ہوں لیکن تم اپنے آپ کو پتہ نہیں کیا سمجھتے ہو۔ مجھ پر جو گزر رہی ہے وہ مجھے ہی پتہ ہے۔ میں نے پھر بھی کوئی جواب نہ دیا۔

دن گزر گیا، شام ہوئی اور پھر رات آ گئی۔ میں دکھوں کی سولی پر جھول رہا تھا۔ کوئی سمجھ نہیں آتی تھی کہ کیا کروں۔

والد صاحب دکان رات دیر سے بند کر کے گھر آتے تھے گاؤں کے بزرگ رات گئے تک بیٹھے رہتے اور گپیں لگاتے رہتے۔ میں بھی کافی دیر تک دُکان پر بیٹھا رہا پھر اٹھ کر گھر آ گیا۔ میں آج بھی منگیتر سے ملاقات کروں یا نہ کروں؟ اسی پریشانی میں مَیں گھر جا کر چارپائی پر لیٹ گیا۔ گیٹ اور حویلی تو ہماری تھی نہیں، نہ ہی دیہات میں مکانوں کے گرد فصیلوں کا رواج تھا اور دروازے بھی نہ ہونے کے برابر تھے۔

اندر کمرے میں لالٹین جل رہی تھی، میں اپنے خیالوں میں مگن لیٹا ہوا تھا، ایسے محسوس ہوا کہ کوئی اندر داخل ہوا ہے۔ میں یکدم چارپائی پر بیٹھ گیا۔

''خانو!'' مجھے آواز آئی اور میری منگیتر میرے ساتھ لپٹ گئی وہ رو رہی تھی۔ میرے بھی آنسو نکل آئے، میں نے مشکل سے اسے پیچھے ہٹایا وہ مجھے چھوڑ نہیں رہی تھی۔

''خانو! میں صرف دو باتیں کرنے کے لئے تمہارے پاس آئی ہوں''۔ اس نے اپنا دوپٹہ اتار کر میرے قدموں میں ڈال دیا اور کہا۔ ''میرا کوئی قصور نہیں پھر بھی مجھے معاف کر دینا۔ خانو! یاد رکھنا، اگر میں تمہاری نہیں بن سکی تو تم سے وعدہ ہے کہ میں ہونے والے خاوند کی بیوی تو بن جاؤں گی لیکن اسے روحانی طور پر قبول نہیں کروں گی۔ میرے ماں باپ نے میرے ساتھ جو سلوک کیا ہے اگر تمہیں بتاؤں تو تمہارے رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ اب بھی تمہارے لئے موقع ہے اگر تم چاہو تو میں تمہارے ساتھ جہاں چاہو جانے کو تیار ہوں''۔

میں بت بنا اس کی باتیں سن رہا تھا، سچائی اس کے چہرے سے عیاں ہو رہی تھی۔ میں کچھ بھی بول نہ سکا۔ تمام الفاظ اور شکوے شکایتیں میرے اندر دبے رہے۔

وہ یہ کہہ کر واپس پلٹی کہ جو قربانی تم چاہو میں دینے کو تیار ہوں اور تمہارا انتظار کروں گی۔

اس کے دو دن بعد میری چھٹی ختم ہوگئی۔ میرا دل گھر سے بھی اچاٹ ہو گیا تھا اور ڈیوٹی پر جانے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ میرا والد میری کیفیت جان چکا تھا، اگلی رات والد نے مجھے اپنے پاس بٹھا کر بے شمار نصیحتیں کیں لیکن یہ سب باتیں میرے سر سے گزر گئی تھیں۔ میں تو یوں محسوس کر رہا تھا کہ میرا جسم روح سے خالی ہو گیا ہے اور پھر میں بادل نخواستہ واپس لاہور اپنے سینٹر میں پہنچ گیا۔

اب میری پوزیشن پہلے والی نہیں تھی۔ ہر وقت کھویا کھویا رہتا۔ وہاں مجھے آٹھ پنجاب رجمنٹ میں بھیج دیا گیا۔ مجھے وہاں ہی اطلاع ملی کہ میری منگیتر کی شادی ہو گئی ہے۔ مجھے اب اس سے کیا غرض کہ شادی ہو یا نہ ہو۔

تحریکِ پاکستان زوروں پر تھی۔ جلسے جلوس شروع ہو چکے تھے میرا تبادلہ ڈیرہ نواب شاہ کر دیا گیا۔ وہاں میری جو ڈیوٹی تھی اور جو کچھ وہاں واقعہ پیش آیا اور ایک غنڈہ میرے ہاتھوں قتل ہوا یہ ایک الگ داستان ہے، وہ میری بے وقوفی تھی یا دلیری جب وہ کہانی سناؤں گا تو پھر انصاف پڑھنے والے کریں گے۔

میں وہاں چھ ماہ رہا پاکستان بن گیا اور میرا دل نوکری سے اچاٹ ہو گیا، میں نے نوکری ختم کرنے کی درخواست دے دی۔ ویسے بھی نفری زیادہ تھی حکومت کے وسائل کم تھے اور لوگوں کو فارغ کر رہے تھے، میں بھی نوکری سے فارغ ہو کر گھر آ گیا۔

میں نے اپنی نوکری سے فراغت کی اطلاع والد کو کر دی تھی۔ انہوں نے کسی ردِعمل کا اظہار نہ کیا بلکہ کہا کہ بیٹا میں نے تو تمہیں پہلے بھی منع کیا تھا۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے، ہمارا کھانے والا ہے کون۔ بہرحال میں اب زیادہ وقت گھر میں چارپائی پر پڑا رہتا یا باہر دور کھیتوں میں چلا جاتا۔ والد کو کسی نے مشورہ دیا کہ اسے کسی کام پر لگاؤ یا اس کی شادی کر دو۔ والد نے مجھ سے شادی کی بات کی تو میں نے صاف انکار کر دیا۔

والد کے ایک دوست قریبی شہر میں رہتے تھے انہوں نے والد کو مشورہ دیا کہ اسے میرے پاس شہر بھیج دو وہاں تحصیلدار صاحب کے ڈیرے پر چھوٹا موٹا کام کر دیا کرے گا، تنخواہ بھی ملے گی کھانے کو بھی، اس سے وہاں اس کا دل بھی لگا رہے گا۔ چنانچہ بادل نخواستہ میں شہر چلا گیا۔ شہر میں ہی مجھے اطلاع ملی کہ میری سابقہ منگیتر بیمار ہے اور پھر پتہ چلا کہ اُس کے ہاں بیٹا ہوا ہے، ساتھ ہی یہ بھی پتہ چلا کہ بیٹا ایک ہی دن زندہ رہ کر فوت ہو گیا، بہت ہی کمزور تھا۔ اس کے دو دن بعد گاؤں سے ایک آدمی میرے پاس آیا اور مجھے اطلاع دی کہ تمہارا والد بیمار ہے اور اس نے کہا ہے کہ محمد خان کو جلد بلا کر لے آؤ۔ اس لئے تم جلدی تیار ہو جاؤ اور میرے ساتھ چلو۔ میں اپنے دوسرے ساتھی کو بتا کر گھر چلا گیا۔ گھر پہنچا تو والد خیر و عافیت سے گھر میں موجود تھے۔ مجھے اپنے پاس بٹھا لیا۔

''بیٹا! تم کو جھوٹ بول کر بلایا ہے''۔ انہوں نے کہا۔ ''غصہ نہ کرنا، بات یہ ہے کہ رات کو تمہاری پھوپھی، اُس کا خاوند اور تین چار آدمی اپنی برادری کے میرے پاس گھر آئے اور میری منت سماجت کرنے لگے اور کہا کہ ہم نے منگنی توڑ کر جو غلطی کی ہے اس کی سزا ہم بھگت رہے ہیں۔ انہوں نے میرے پاؤں تک کو ہاتھ لگائے اور کہا کہ ایک دفعہ محمد خان کو بلوا دو، کئی روز سے ہماری بیٹی کا یہی ورد وظیفہ بن گیا ہے۔ وہ سخت بیمار ہے اور چارپائی سے لگ چکی ہے، سب کے سامنے اس نے کہا ہے کہ ایک دفعہ محمد خان کو بلوا دو...... بیٹا شاید وہ زندہ نہ رہے تم چلو، ایک بار اس کو مل لو''۔

میرا دل بھی پسیج گیا، والد صاحب اٹھے اور میں بھی ساتھ چل پڑا۔ اس کی بیماری کی وجہ سے کافی لوگ وہاں موجود تھے۔ اس کا خاوند والدہ، والد اور دیگر رشتہ دار تھے۔ جونہی میں اندر داخل ہوا تو گویا اس میں روح پھونک دی گئی ہو، کمزوری اور بیماری سے وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکی تھی، چارپائی پر سے اٹھنے کی کوشش کی اور ایک ہاتھ میری طرف بڑھایا، میں نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا اور سہارا دے کر اُسے بٹھایا، اس نے مجھے اپنے ساتھ بٹھا لیا اور میرا پکڑا ہوا ہاتھ چومنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے آنسو نکلنے لگے اور بلک بلک کر رونے لگی، مجھ سے بھی برداشت نہ ہو سکا، میرے بھی آنسو نکل آئے۔ اس کی ماں اس کے قریب بیٹھ گئی اور اس کی ڈھارس بندھائی حوصلہ دیا۔

''خانو!'' وہ میری طرف دیکھ کر اور رک رک کر کہنے لگی۔ ''تمہیں اس لئے بلایا ہے کہ چند باتیں کرنی

آخری سلام

مشرقی پاکستان کے میدانِ جنگ سے

میجر آفتاب احمد

1958ء اور 1971ء کے مارشل لاء کو پاکستان کے دولخت ہونے کا سبب، پاک فوج کی عوام سے دوری کا باعث اور اس کی صفوں میں کردار کے بحران کا محرک گردانتے ہوئے انہوں نے اپنے حلف کے تقاضوں کے عین مطابق ملک میں ایک اور افقی اور عمودی انتشار کے نکتہ آغاز جنرل ضیاء الحق کے تیسرے مارشل لاء کے خلاف مسلح افواج کے اندر سے ہی مزاحمت کی عدیم المثال روایت ڈالنے کی جرأت رندانہ کی۔ اس ناقابل یقین، انوکھے اور منفرد "جرمِ وفا" میں وہ حبس دوام کے مستحق ٹھہرے۔ ادھر جمہوریت کی بحالی کے بعد ضمیر کی آواز بلند رکھنے کے جرم اِنکار میں حاکمِ وقت بینظیر بھٹو نے بھی انہیں تین سال بنا مقدمہ سندھ کی جیلوں میں اسیر کیے رکھا۔

ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ میں نے اپنے باپ کی پگ کی لاج رکھ لی ہے جو اس نے رخصتی والے دن میرے پاؤں پر رکھی تھی اور میں نے اٹھا کر باپ کے سر پر رکھ دی تھی۔ دوسرا تمہارے ساتھ کیا ہوا قول بھی نبھا دیا ہے۔ تم صرف ایک بار مجھے معاف کر دو"۔ وہ رک رک کر یہ سب کچھ کہہ رہی تھی۔ اس کے آنسو تھم نہیں رہے تھے۔ حاضرین پر سکوت تھا اور تقریباً سب کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"خانو! مجھے معاف کر دو گے تو میری روح آسانی سے نکل جائے گی"۔ اس نے پھر کہا۔ "ورنہ پتہ نہیں میں کتنا عرصہ ایڑھیاں رگڑتی رہوں گی"۔ پھر اس کی آواز رندھیا گئی اور اس کا سانس پھول گیا اور بے بسی سے آنسو بہانے لگی۔

ضبط کے باوجود بھی میرے آنسو نکل آئے۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ پر قابو پایا۔ دل موم کی طرح پگھلا جا رہا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر سینہ پھٹا جا رہا تھا۔ جی چاہتا تھا دھاڑیں مار مار کر روؤں مگر فوجی ٹریننگ نے میرے اندر نظم و ضبط پیدا کر دیا تھا۔

"تمہارا کوئی قصور نہیں شاداں!" میں نے اس کے چہرے پر الوداعی نگاہ ڈالی اور کہا۔ "میں نے تمہیں معاف کیا اور اللہ بھی معاف کرے"۔ یہ کہہ کر میں اٹھ کھڑا ہوا۔

میرے الفاظ نے اس پر جیسے ٹھنڈی پھوار برسا دی تھی۔ اس نے آسودگی سے آنکھیں موند لیں اور میں اپنے گھر آ گیا۔

دوسرے دن اطلاع آئی کہ شاداں اللہ کو پیاری ہو گئی ہے۔ وہ تو ابدی نیند سو گئی اور میں تڑپنے کے لئے زندہ ہوں۔ 78 دن موت و حیات کی کشمکش میں رہنے والی اذیت بھول چکا ہوں لیکن شاداں سے جدائی کی اذیت اتنے سال گزرنے کے باوجود بھی زندہ ہے اور قبر میں اترنے تک زندہ رہے گی۔

***

عالمی حکمرانی کا خطرناک صیہونی منصوبہ

نوٹ: "موساد کی اندرونی کہانی" کے عنوان سے میاں محمد ابراہیم طاہر صاحب نے جو تفصیل دی ہے وہ واقعی قابل تعریف کوشش ہے۔ یہودی بنیادی طور پر بدکردار۔ سازشی اور منافق قسم کے لوگ ہیں۔ اپنے مقصد کے لیے اگر انہیں خون کا دریا بھی عبور کرنا پڑے تو کبھی نہیں ہچکچاتے۔ اسی طرح موساد دنیا کی ایک خطرناک ترین خفیہ ایجنسی ہے جس کے ہاتھوں پر بہت سے بے گناہ لوگوں کا خون ہے۔ سازش۔ سراغرسانی۔ اور خفیہ کارروائیوں میں موساد کا کوئی ثانی نہیں۔ موساد کی خفیہ کارروائیاں طشتِ از بام کرنے کے لیے محترم میاں محمد ابراہیم طاہر صاحب واقعی مبارکباد کے مستحق ہیں۔ موساد کی ناپاک۔ غیرانسانی۔ بے رحم اور غیرمہذب کارروائیوں سے متاثر ہو کر یہودیت کا پس منظر قارئین کے سامنے لانا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ جو پیش کیا جا رہا ہے۔

balochsk@yahoo.com

☆ سکندر خان بلوچ

اسرائیل اور فلسطین

مشرقِ وسطیٰ عالم اسلام کا دل ہے اور اس خطے میں اسرائیل کا قیام عالم اسلام کے دل میں چھرا گھونپنے کے مترادف ہے۔ جب سے اسرائیل قائم ہوا ہے عربوں کے ساتھ چار بڑی جنگیں لڑ چکا ہے اور ہر جنگ میں نہ صرف عربوں کو شکست دی بلکہ ان کے اہم علاقوں پر قبضہ بھی کر لیا۔ فلسطینیوں کے ساتھ تو اسرائیل اپنے یوم پیدائش سے ہی مسلسل حالتِ جنگ میں ہے۔ ہر سال دو سال بعد کسی نہ کسی بہانے فلسطینیوں پر حملہ کرتا ہے۔ کوئی عالمی طاقت اسے روکتی ہے اور نہ وہ کسی عالمی طاقت کی پروا کرتا ہے۔ جب بھی کوئی بڑی طاقت اسے روکنے کی کوشش کرتی ہے تو اسرائیل کا فقط ایک ہی جواب ہوتا ہے۔ Hell with such powers یعنی جہنم میں جائیں یہ طاقتیں۔ اپنی وحشیانہ درندگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس وقت تک جنگ بندی پر آمادہ نہیں ہوتا جب

تک مجبور و بے سہارا فلسطینی مکمل طور پر گھٹنے نہ ٹیک دیں۔ دنیا جہاں میں انسانی حقوق کی علمبر دار تنظیمیں موجود ہیں۔ اردگرد عرب ممالک بھی موجود ہیں لیکن کسی میں آگے بڑھ کر اسرائیل کو روکنے کی ہمت نہیں۔ اور تو اور کسی طاقت میں اسرائیل کو ظالم کہنے کی بھی جرأت نہیں۔ فلسطینیوں کا المیہ یہ ہے کہ ان کی کوئی باقاعدہ ریاست نہیں نہ ہی کوئی فوج ہے۔ اردگرد کے عرب ممالک بھی اسرائیل کے خوف سے فلسطینیوں کو پناہ دینے کے لئے تیار نہیں۔ لہٰذا غریب، نہتے اور مظلوم فلسطینی وحشی اور طاقتور اسرائیل کا مقابلہ کرنے کی پوزیشن میں ہی نہیں۔ ہر جنگ میں ہزاروں کے حساب سے فلسطینی مارے جاتے ہیں جن میں اکثریت بے گناہ خواتین اور بچوں کی ہوتی ہے۔ ان کی املاک تباہ کردی جاتی ہیں۔ رعونت اور بربریت کی انتہا کہ فلسطینی علاقوں میں ایمبولینسوں، ہسپتالوں، سکولوں بلکہ اقوام متحدہ کے جھنڈے تلے پناہ لینے والے مجبور لوگوں کو بھی معاف نہیں کیا جاتا۔ وہ مظلوم بھی وحشیانہ بمباری کا نشانہ بنتے ہیں۔ سابقہ جنگ میں بھی یہی کچھ ہوا ہے۔

یہاں ایک اور امر بھی بڑا تکلیف دہ ہے اور وہ ہیں فلسطینیوں کی طرف سے مدافعتی قوتوں ''حماس اور الفتح'' کا قیام لیکن یہ دونوں طاقتیں دشمن سے لڑنے کی بجائے اکثر آپس میں ہی دست و گریباں رہتی ہیں۔ غزہ کے علاقے میں جہاں 2014ء کی جنگ لڑی گئی ''حماس'' کے دائرہ اختیار میں ہے۔ حماس کے پاس کوئی باقاعدہ فوج نہیں نہ اس میں کسی قسم کی مدافعتی طاقت ہے۔ لے دے کر کچھ گنز اور راکٹس ہیں جو خفیہ طور پر ایران یا کچھ اور مسلم ممالک فراہم کرتے ہیں۔ ہر اسرائیلی جنگ کے موقع پر حماس کے لوگ اسرائیل پر راکٹ پھینکتے ہیں لیکن یہ راکٹس اتنے غیر مؤثر اور بے موقعہ ہوتے ہیں کہ سینکڑوں راکٹس سے کوئی ایک آدھ اسرائیلی ہی مرتا ہے۔ فلسطینیوں کی بدقسمتی یہ ہے کہ ''حماس'' ان کی واحد نمائندہ جماعت بن چکی ہے۔ جب بھی بین الاقوامی طور پر جنگ بندی کی کوشش ہوتی ہے ''حماس'' کچھ نہ کچھ شرائط کا بہانہ بنا کر جنگ بندی سے انکار کر دیتی ہے حالانکہ اسے بخوبی علم ہے کہ وہ اسرائیل کی بربریت کو کسی طرح بھی نہیں روک سکتی۔ ''حماس'' کی طرف سے جنگ بندی پر انکار سے اسرائیل مکمل طور پر فائدہ اٹھاتا ہے۔ وہ یوں کہ وہ بجائے ظالم کہلانے کے مظلومیت کا روپ دھار لیتا ہے کہ مجرم اسرائیل نہیں بلکہ حماس ہے، بہ دیگر الفاظ فلسطینی ہیں جو راکٹ پھینک کر معصوم اسرائیلیوں کو مار رہے ہیں۔ اسے بنیاد بنا کر صیہونی میڈیا اور پریس اسرائیلیوں کو مظلوم اور فلسطینیوں کو ظالم اور دہشت گرد قرار دیتے ہیں اور طاقتور صیہونی پریس دنیا کی آنکھوں پر اس چالاکی سے پٹی باندھتی ہے کہ وہ اسرائیل ہی کو حق پر سمجھتے ہیں۔

اس کی ایک مثال 2014 کی جنگ میں اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل بان کی مون کی اسرائیل آمد تھی۔ اس نے کسی مسلمان ملک میں جانے کی زحمت گوارا نہ کی بلکہ صرف اسرائیلی وزیراعظم نتن یا ہو سے ہی بریفنگ لی۔ اسرائیل ہی کو مظلوم اور بے گناہ قرار دیا اور بغیر جنگ بند کرائے واپس چلا گیا۔ ''حماس'' کے انکار سے اسرائیل کو دوسرا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کھل کر اپنی وحشیانہ کارروائی جاری رکھتا ہے۔ اگر فلسطینیوں پر اسرائیلی حملوں کا غیر جانبدارانہ تجزیہ کیا جائے تو ''حماس'' فلسطینیوں کی حفاظت کی بجائے ان کی تباہی کا سبب بنتی ہے۔ وہ بالکل Matador والا کردار ادا کرتی ہے۔ کچھ مغربی مفکرین کا خیال ہے کہ 'جس طرح داعش یہودیوں کی پیدا کردہ انتہا پسند فورس ہے اسی طرح حماس کی پشت پر بھی یہودی ہی ہیں بلکہ یہودیوں ہی کی پیدا کردہ جماعت ہے جس کا واحد مقصد اسرائیلی مقاصد کی تکمیل ہے۔ معلوم نہیں یہ

الزام درست ہے یا غلط لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ "حماس" کی ہر حرکت کا فائدہ اسرائیل ہی اٹھاتا ہے۔

امریکی بے بسی

یہاں یہ سوال بھی سامنے آتا ہے کہ امریکہ سمیت دنیا کی تمام بڑی طاقتیں اسرائیل کے ناز و نخرے برداشت کرنے پر کیوں مجبور ہیں؟ یہ ایک گہری سازش کا نتیجہ ہے جس کی کچھ تفصیل نیچے دی جارہی ہے۔ امریکہ اس وقت دنیا کی واحد سپر پاور ہے لیکن اسرائیل کی مرضی کے بغیر ہل بھی نہیں سکتا۔ اسرائیلی طاقت کا اندازہ ان دو مثالوں سے واضح ہوتا ہے۔ اول یہ کہ عرب اسرائیل جنگوں میں اسرائیل کا جتنا بھی نقصان ہوتا ہے وہ امریکہ کو ہر صورت فوری طور پر پورا کرنا پڑتا ہے اور مزید امداد بھی دینی پڑتی ہے جو 2014 کی جنگ میں بھی کیا گیا۔ اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ امریکی کانگریس، امریکی بینکس اور امریکی معیشت پر یہودی قابض ہیں۔ لہٰذا امریکہ میں کوئی صدر ان کی مرضی کے بغیر اقتدار میں آسکتا ہے اور نہ اقتدار میں رہ سکتا ہے۔ دوسرا یہ کہ سیاسی طور پر بھی امریکہ اسرائیل کے سامنے بے بس ہے۔ اس کی ایک مثال جنوری 2009 میں اس وقت سامنے آئی جب اسرائیل نے نہتے فلسطینیوں پر حملہ کیا اور ایک ہزار سے زائد بے گناہ لوگ مار دیئے۔ امریکی سیکریٹری خارجہ کو نڈالیزا رائس نے سیکورٹی کونسل میں جنگ بندی پر ایک قرارداد پیش کی جس پر کچھ دیر بعد ووٹنگ ہونا تھی۔ اتنی دیر میں اسرائیلی وزیر اعظم مسٹر اولمرٹ کو اس قرارداد کا علم ہوا۔ اس نے فوری طور پر صدر بش کو فون کیا۔ اُسے بتایا گیا کہ صدر بش اس وقت ایک بہت بڑے مجمعے کے سامنے تقریر کر رہا ہے۔ اولمرٹ نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا کہ بش کو بتایا جائے کہ فوری طور پر تقریر چھوڑ کر اس کی بات سنے۔ لہٰذا بش کو تقریر چھوڑ کر اولمرٹ کی بات سننا پڑی جس میں بش کو بتایا گیا کہ جنگ بندی کی قرارداد پر ووٹنگ نہیں ہونی چاہیے۔ مقررہ وقت پر 15 ممبران میں سے 14 نے اس قرارداد کے حق میں ووٹ دیا لیکن امریکہ نے اپنی ہی پیش کردہ قرارداد میں حصہ نہ لیا اور یوں یہ قرارداد غیر مؤثر ہوگئی۔

یہودیت کا تاریخی پس منظر

اب ایک دفعہ پھر اوپر دیئے گئے سوال پر غور کریں کہ دنیا اسرائیل کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر کیوں مجبور ہے اور یہ گہری سازش ہے کیا؟ دراصل یہودی ہزاروں سالوں سے اقوام عالم پر صیہونی حکمرانی کے لئے کوشاں تھے جس میں اب وہ مکمل طور پر کامیاب ہو چکے ہیں اور اسے Super Government of the World By Jews کا نام دیا گیا ہے۔ اس سازش کی ابتدا حضرت سلیمان علیہ السلام کے دور حکومت میں شروع ہوئی جب یہودیوں کو یہ باور کرایا گیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی سب سے "پسندیدہ اور برتر مخلوق" ہیں اور اللہ تعالیٰ ہی کا حکم ہے کہ دنیا پر حکمرانی کے صرف وہی حقدار ہیں۔ یہودیوں کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ جب یہ دنیا اپنے اختتام کے نزدیک پہنچے گی تو حضرت داؤد علیہ السلام یہودیوں کے بادشاہ کے طور پر دوبارہ اس دنیا میں تشریف لائیں گے اور پوری دنیا پر صیہونی حکومت قائم ہوگی۔ حیران کن بات یہ ہے کہ یہی عقیدہ عیسائیوں میں بھی ہے اور مسلمانوں میں بھی۔ عیسائیوں کے عقیدے کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام دوبارہ اس دنیا میں تشریف لائیں گے اور مسلمانوں کے مطابق حضرت امام مہدی علیہ السلام تشریف لائیں گے۔

ہندوازم اور یہودیت دنیا کے دو قدیم ترین مذاہب میں سے ہیں۔ گو مذہبی طور پر دونوں میں زمین

آسمان کا فرق ہے لیکن سیاسی اور ثقافتی طور پر دونوں کے خیالات اور طریقہ واردات کافی ملتے جلتے ہیں۔ یہودی اپنے آپ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد کہتے ہیں اور شروع میں یہ موجودہ اسرائیل اور فلسطین کے علاقے میں آباد تھے جسے اس دور میں کنعان کہا جاتا تھا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کا تعلق بھی اسی قبیلے سے تھا۔ جب حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹے حضرت یوسف علیہ السلام مصر میں گورنر بنے تو کنعان میں قحط پیدا ہوا اور یہ لوگ مصر ہجرت کر گئے۔ وہاں یہ اپنی عادات کی وجہ سے فرعون کے ظلم و بربریت کا نشانہ بنے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام انہیں وہاں سے نکال کر صحرائے سینا لے آئے جہاں یہ چالیس سال تک بھٹکتے رہے۔ پھر دوبارہ کنعان کے علاقے میں آ کر ''اسرائیل اور یہودہ'' کے نام سے دو طاقتور یہودی حکومتیں قائم کیں اور یہ لوگ اولاد اسرائیل یا قرآن کریم کے مطابق بنی اسرائیل کہلائے۔ امتداد زمانہ کے ہاتھوں جب ان کی سلطنتیں تباہ ہوئیں تو ایک دفعہ پھر یہ ہجرت پر مجبور ہوئے اور مختلف ممالک میں پھیل گئے۔

عیسائیت سے نفرت

اسی دوران جب عیسائیت پھیلنی شروع ہوئی تو یہ لوگ عیسائیت کے سخت خلاف تھے بلکہ اس سے شدید نفرت کرتے تھے جو آج تک قائم ہے۔ یہودی علماء نے فتویٰ دیا تھا کہ:۔ Fundamentally Judaism is against Christianit جس کا ذکر یہودیوں کی بہت ہی اہم کتاب The Protocols of the Learned Elders of Zoin میں بھی موجود ہے۔ یہودیت اور عیسائیت کی نفرت اتنی شدید تھی کہ جب صلیبی جنگوں کے دوران یروشلم عیسائیوں نے فتح کیا تو انہوں نے بہت سے یہودیوں کو ان کی مذہبی عبادت گاہوں میں بند کر کے آگ لگا دی تھی۔ بعد میں یورپ اور روس میں بھی یہودیوں کے بیان کے مطابق انہیں بے دریغ قتل کیا گیا۔ یہودیوں کو جب بھی موقعہ ملا انہوں نے بھی عیسائیوں سے خوب بدلہ لیا۔ یہودیوں نے جب مصر سے ہجرت کی تھی جسے عموماً Exodus کا نام دیا جاتا ہے۔ یہودی اس دن کو باقاعدہ ایک تہوار کے طور پر مناتے رہیں جسے غالباً Yum Kapur کہتے ہیں۔ ایسے ہی ایک تہوار پر یہودیوں نے بہت سے عیسائی بچوں کو پکڑ کر ذبح کیا اور ان کے خون سے تہوار منایا۔ عیسائی علاقوں کے کنوؤں میں زہر پھینک دیا اور طاعون پھیلا دیا۔ (بحوالہ Epilogue of the Protocols) یہودیوں کی پوری دنیا میں موجودہ تعداد تقریباً ایک کروڑ سینتیس 1,37,00,000 لاکھ ہے جبکہ یہودیوں کی اپنی تفصیل کے مطابق یہ تعداد آج بیس کروڑ سے زیادہ ہوتی اگر انہیں مختلف ممالک میں مارا نہ جاتا تو۔ اس میں ایک مثال ہٹلر کے ''ہولوکاسٹ'' کی بھی ہے۔ دراصل اس قتل و غارت کی ایک اہم وجہ یہ بھی تھی کہ یہودی جہاں کہیں بھی گئے سازشوں کے ایسے ایسے جال بچھائے اور جہاں بھی موقع ملا عیسائیوں پر اس قدر ظلم کئے کہ وہ بدلہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ حیران کن بات یہ ہے کہ انہیں سب سے زیادہ سہولتیں مسلمانوں کی طرف سے ملیں۔ یہاں یہ بات بھی حیران کن ہے کہ مسلمان اور یہودی ایک ہی پیغمبر کی اولاد اور سگے کزنز ہیں۔ اسلام اور یہودیت دونوں قریب ترین مذاہب ہیں۔ اسلام میں بہت سے یہودی شعار مشترک ہیں۔ حضور کریمؐ کی نبوت کا پہلا گواہ بھی یہودی عالم ہرقل تھا۔ مدینہ منورہ میں حضور کریمؐ اور صحابہ کرام کے یہودیوں کے ساتھ بہت اچھے تعلقات تھے۔ لیکن پھر بھی آج یہ سب سے زیادہ مسلمانوں کے ہی خلاف ہیں۔ جبکہ عیسائیت اور ہندو ازم یہودیت کے

الٹ ہیں لیکن اُن سے اُن کی دوستی ہے۔

عالمی حکمرانی کا خواب

اب آتے ہیں ایک دفعہ پھر یہودیوں کے اصل منصوبے یعنی" عالمی حکمرانی" کی طرف۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ یہ سوچ تو حضرت سلیمان علیہ السلام کے دور میں پیدا ہوئی لیکن اس پر عمل سرزمین اسرائیل سے نکلنے کے وقت سے شروع ہوا۔ اس کے چار اہم اصول یہ تھے۔ اول: دنیا کے تمام وسائل کی بنیاد سونا ہے لہٰذا دنیا کے تمام سونے پر قبضہ کر کے دنیا کو اپنے سامنے جھکنے پر مجبور کر دیا جائے چاہے اس کے لئے خون کے دریا ہی کیوں نہ عبور کرنے پڑیں۔ دوم: دنیا کو گمراہ کر کے اپنی باتیں منوائی جائیں۔ سوم: چونکہ یہودی دنیا کی منتخب شدہ مخلوق ہیں اس لئے ان کی زندگی مقدس ہے۔ ہر غیر یہودی یہودیوں کا غلام ہے اور اس کی زندگی کی حیثیت ایک جانور جتنی بھی نہیں۔ چہارم: غیر یہودیوں پر ہر قسم کا ظلم عین عبادت ہے۔ یہودی جہاں کہیں بھی گئے اپنے ان اصولوں پر ڈٹے رہے۔ ان کا نعرہ تھا کہ" دنیا کے تمام یہودی ایک ہیں اور ہر یہودی تمام یہودیوں کا نمائندہ ہے" یہ ایک ایسی سپرٹ تھی جو آج تک قائم ہے۔ یہ لوگ جہاں کہیں بھی جا کر آباد ہوئے گروپس کی شکل میں آباد ہوئے۔ سب سے پہلے اپنے مدارس قائم کئے اور اپنے تمام یہودی بچوں کے لئے تعلیم لازمی قرار دی تو یوں یہ علم و ہنر میں اپنے اردگرد کے تمام لوگوں سے ممتاز رہے۔ جہاں بھی جاتے تجارت پر مکمل طور پر قبضہ کرتے۔ طب اور دیگر سائنسی علوم میں خاصے شہرت یافتہ تھے۔ اس سے انہیں اردگرد کی تمام بڑی فیملیز تک نہ صرف رسائی ملتی بلکہ اثر و رسوخ بھی قائم ہو جاتا۔ پھر ایک ایسا وقت بھی آیا کہ یورپ کی تمام اہم فیملیز بشمول شاہی فیملیز کے لئے یہ لوگ ناگزیر ہو گئے کیونکہ یہ لوگ سود پر رقم مہیا کرتے تھے اور رقم ہمیشہ امراء کی مجبوری رہی ہے۔ اس سے ایک طرف تو غیر یہودیوں کی تجارت پر یہ لوگ حاوی ہو گئے اور دوسرے تمام بڑے چھوٹے نواب، جاگیردار حتیٰ کہ عام لوگ ان کے مقروض ہونا شروع ہو گئے۔ ظاہر ہے جو کوئی مقروض ہوگا وہ قرض دینے والوں کا اثر و رسوخ بھی قبول کرے گا۔ اس طرح یہ لوگ انتظامی اور مالی امور میں اس حد تک ماہر ہوئے کہ یورپ کے تمام بڑے جاگیرداروں اور شاہی خاندانوں نے اپنی جاگیروں اور مالی امور کی دیکھ بھال ان کے حوالے کر دی اور یوں یہ آہستہ آہستہ یورپ کی تمام دولت خصوصاً سونے کے ذخائر پر قابض ہو گئے۔ اسی تجربے کی بنیاد پر پھر ان لوگوں نے بینک قائم کئے جہاں دنیا کا سونا جمع کیا۔ اگلے قدم کے طور پر سونا اپنے پاس جمع کر کے اس کی جگہ کاغذی کرنسی پھیلا دی۔

اصل منصوبہ

انیسویں صدی میں جب اہم تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں تو یہ لوگ بہت متحرک تھے۔ ان لوگوں نے اپنی ایک "جیوش کانگریس" قائم کی جس کا ان کے علاوہ کسی کو علم نہ تھا۔ یہ کانگریس پوری دنیا پر نظر رکھتی اور حالات کے مطابق تمام فیصلے کر کے اپنے مفادات کا تحفظ کرتی اور اپنا ایجنڈا آگے بڑھاتی۔ اس مقصد کے لئے تمام دنیا کے یہودیوں کو ہدایات جاری کی جاتیں۔ مقصد براری کے لئے مختلف قسم کی سازشی تھیوریز پر عمل کیا گیا۔ یہودیوں کا دنیا پر قبضہ کرنے کا خفیہ منصوبہ ویسے تو قبل مسیح سے جاری تھا لیکن 1903 میں روس میں سامنے آیا جو ایک کتابی صورت میں تھا۔ جس کا نام تھا" The Protocols of the Learned Elders of Zion" یہ کتاب روسی زبان میں تھی اور اس کا انگلش ترجمہ Victor E Mardson نے کیا۔ Dr Danial Keren

نے کچھ اضافی تشریحات لکھیں اور 1905 میں یہ کتاب یورپ اور امریکہ میں پھیلائی گئی جو ہر یہودی کے پاس پہنچی۔ ہر یہودی اس پر عمل کرنے کا پابند تھا۔ یہ کتاب انٹر نیٹ پر بھی موجود ہے۔ بحوالہ

URL:www.nizkor.org/ftp.cgi?documents/ protocols/ protocols.zions>

اس کتاب کے مطابق یہودیوں کو اپنی عالمی حکومت جسے وہ of the World by Jews Super Government کا نام دیتے ہیں۔ قائم کرنے کے لئے 24 رہنما اصول دیئے گئے ہیں۔ تفصیل یہاں ممکن نہیں لیکن چند اہم اصول حسب ذیل ہیں:۔

1۔ تمام دنیا کے سونے پر قبضہ کر کے دنیا کی معیشت کو کنٹرول کرنا، بینکنگ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اب بینکنگ کے ذریعے تمام اہم انڈسٹری اور تجارت پر یہ لوگ قابض ہیں۔

2۔ نوجوان نسل کی اخلاقیات پر حملہ کر کے انہیں ان کے مذہب۔ معاشرتی روایات اور اخلاقیات کو تباہ کیا جائے۔ ایسے لوگ بہت آسانی سے یہودی پروپیگنڈے کا شکار ہوتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے یہودی لڑکیوں نے اہم کردار ادا کیا۔ پھر پورنوگرافی کی انڈسٹری معرض وجود میں لائی گئی جس میں باپ بیٹی، ماں بیٹا اور بہن بھائی جیسے مقدس رشتے پامال کئے گئے۔ نتیجتاً مغرب میں Homosexuality اور Lisbianism کی تحریکیں شروع ہوئیں اور اب بہت سے ممالک میں مردوں کی آپس میں اور خواتین کی آپس میں شادیاں قانونی طور پر جائز ہیں۔ یہ عین یہودی منصوبے کے مطابق ہے۔

3۔ دنیا کے اہم راہنماؤں کو یہودی لڑکیوں کے ذریعے غلام بنایا جائے۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ 1995 میں امریکی صدر بل کلنٹن اور مونیکا لیونسکی کا سکینڈل سامنے آیا تھا اور یہ خاتون یہودن تھی۔ اس کے علاوہ بھی بل کلنٹن کے یہودی لڑکیوں سے معاشقے تھے اور ان لڑکیوں کے ذریعے اسرائیل نے امریکہ سے بہت سی رعایات حاصل کیں۔ یہی حالت اور بھی بہت سے عالمی لیڈروں کی ہے۔ عرب دنیا میں بہت سے امراء اور حکمرانوں کی بیویاں یہودی یا عیسائی ہیں جن کی معرفت یہ بلیک میل ہوتے ہیں۔ جس طرح ہمارے تمام مغل حکمرانوں نے ہندو لڑکیوں سے شادیاں کیں یہی حالت اب عربوں کی ہے۔ اور کیا کہیں کہ فلسطین کے مشہور راہنما جناب یاسر عرفات کی اہلیہ عیسائی تھی جس نے سلو پوائزننگ سے یاسر عرفات کو ٹھکانے لگادیا۔

4۔ جنگیں یہودیوں کے لئے پکے فصل کی مانند ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ دنیا میں زیادہ سے زیادہ جنگیں ہوں اور اپنی سازشوں سے اس پر عمل بھی کراتے جیسے دو عالمی جنگیں۔ اس سے انہیں کئی فائدے ہوتے ہیں۔ پہلا فائدہ تو یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ عیسائی یا مسلمان مرتے ہیں جس سے وہ خوش ہوتے ہیں۔ دوسرا دفاعی انڈسٹری پر یہودیوں کا کنٹرول ہے۔ لہٰذا ان کے ہتھیار بکتے ہیں۔ اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ جنگوں کے لئے سود پر سرمایہ فراہم کرتے ہیں اور ہر جنگ کے بعد ان کے بنک بھر جاتے ہیں۔

5۔ یہ لوگ جمہوریت کو فروغ دینے کے لئے مختلف اقوام کو مجبور کرتے ہیں تاکہ جمہوریت کے نام پر عوام میں نفاق پیدا کیا جائے۔ جتنی زیادہ جمہوری پارٹیاں ہوں گی اتنا ہی آسانی سے قوم کو آپس میں لڑایا جا سکتا ہے۔ اور قوم اتنا ہی انتشار اور تذبذب کا شکار ہوگی۔ پھر ان پارٹیوں میں اپنے لوگ داخل کر کے اپنے مقاصد حاصل کئے جاتے ہیں۔ یہ بالواسطہ حکمرانی کا دوسرا انداز ہے۔

6۔ چھٹا اور سب سے اہم منصوبہ اقوام کے نظام تعلیم پر قبضہ ہے۔ اس میں اپنی مرضی کا سلیبس ترتیب کروانا اور سلیبس میں ایسے ایسے مضامین شامل کرانا جو ان لوگوں کے ذہنوں کو پراگندہ کریں اور یہودیوں کے لئے اپنا مقصد حاصل کرنا آسان ہو جائے۔ یہ محض چند ایک نکات ہیں۔

یہودی سانپ

پوری دنیا پر قبضہ ایک سانپ کے سمبل سے ظاہر کیا گیا ہے۔ سانپ کی آگے بڑھنے کی تفصیل بڑی خوفناک ہے۔ یہ سانپ کئی مراحل میں آگے بڑھا ہے۔ اس کی ابتدا یونان سے شروع ہوتی ہے جہاں سے یہودیت نے دنیا پر اپنا قبضہ جمانا شروع کیا۔ یہ 429 قبل مسیح کا زمانہ تھا اور یونان میں Periclese کی حکومت تھی۔ دوسرے مرحلے میں اس سانپ نے روم کو قبضے میں لیا۔ یہ 69 قبل مسیح کا زمانہ تھا اور شاہ اگسٹس کا دور حکومت تھا۔ تیسرا مرحلہ اندلس سے 1552 عیسوی میں شروع ہوا اور وہاں اس وقت چارلس پنجم کی حکمرانی تھی۔ چوتھا مرحلہ پیرس سے 1790ء میں لوئیس سولہ کے دور میں شروع ہوا۔ پانچواں مرحلہ 1814 میں لندن میں شروع ہوا۔ چھٹا مرحلہ برلن میں فرنکو پرشین (Franco Prussian) جنگ کے بعد شروع ہوا۔ ساتواں مرحلہ پیٹرز برگ روس سے 1881 میں شروع ہوا اور اب یہ سانپ مستقل طور پر آگے بڑھ رہا ہے۔ اس کا آخری مرحلہ استنبول ہوگا اور یہ پوری دنیا پر مکمل یہودی قبضہ ہوگا۔ یہ ساری تفصیل Sergius Nilus نامی شخص نے The Protocols کتاب کے خاتمے پر دی ہے لیکن یاد رہے کہ یہ کتاب 1905 میں چھپی تھی اور اس وقت سے اب تک یہودیت بہت آگے بڑھ چکی ہے۔ یہودیوں کے اپنے منصوبے کے مطابق ضروری نہیں کہ ہر جگہ یہودی حکمران ہوں بلکہ عوام میں ہی سے ایسے حکمران سامنے لائے جائیں جو یہودیوں کے سامنے سر تسلیم خم کریں۔ ویسے بھی جب دنیا کا تمام سونا یہودیوں کے پاس موجود ہو۔ بینکس اور پیپر کرنسی۔ سیکورٹی بانڈز اور سٹاک ایکسچینج وغیرہ کے بھی وہی مالک ہوں۔ دنیا کی ڈیفنس اور دیگر اہم انڈسٹریز بھی انہی کی مرضی کے مطابق چلائی جائیں۔ اقوام عالم کے تعلیمی نظام بھی انہی کی دسترس میں ہوں تو بھلا دنیا کا کون حکمران سرتابی کی جرأت کرسکتا ہے؟ 1905 میں ہونے والی یہ پیشین گوئی اب تک سو فیصد سچ ثابت ہو چکی ہے۔

تیسری دنیا

یہ 2005 کا ذکر ہے کہ میں انگلینڈ گیا اور Southampton میں ایک عزیز کے ہاں قیام کیا۔ وہاں میری ملاقات ایک بھارتی سکھ میجر سے ہوئی جو 1984 میں گولڈن ٹمپل پر حملے کے بعد بھارت سے بھاگ گیا تھا۔ گپ شپ کے دوران مشرقی پاکستان میں جنگ کے حوالے سے ہماری کچھ مشترکہ یادیں سامنے آئیں تو ہماری واقفیت کسی حد تک دوستی میں تبدیل ہو گئی۔ حیران کن بات ہے کہ فوجی میدان جنگ کے علاوہ آپس میں بہترین دوست ثابت ہوتے ہیں۔ یہی کچھ ہمارے ساتھ ہوا۔ میجر صاحب مجھے اپنے گوردوارہ لے گئے جسے دیکھنے کا مجھے بھی بہت شوق تھا۔ وہاں گوردوارہ کے اندر ایک علیحدہ دفتر تھا جو حقیقتاً "تحریک خالصتان" کا دفتر تھا۔ وہاں کافی لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ جب سب لوگ چلے گئے تو میجر صاحب نے کسی خفیہ خانے سے مجھے ایک کتابچہ نکال کر دیا۔ اس کا ٹائٹل کور پھٹا ہوا تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ یہ کتابچہ بہت سیکرٹ ہے اور پوری مغربی دنیا میں اس کا رکھنا جرم ہے۔ میجر صاحب نے مجھے یہ کتابچہ ایک رسالے کے اندر رکھ کر دیا کہ وہیں پڑھ لیا جائے اور

کسی کو پتہ نہ چلے۔ جونہی میں نے اس کا سرسری سا جائزہ لیا تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ یہ تیسری دنیا اور مسلم امہ کو غلام بنانے کا یہودی منصوبہ تھا۔ اس منصوبے کی ساری تفصیل تو یہاں ممکن نہیں لیکن چند اہم نکات حسب ذیل ہیں۔ یاد رہے کہ تمام مسلمان ممالک تیسری دنیا میں ہی آتے ہیں۔ ذرا ان نکات پر نظر ڈالیں۔

تیسری دنیا کے ممالک میں جمہوریت کے نام پر زیادہ سے زیادہ سیاسی پارٹیاں تشکیل دے کر عوام کو آپس میں لڑایا جائے تا کہ استحکام پیدا نہ ہو۔ اوسط درجے کے لیڈرز کی مدد کر کے اقتدار میں لائے جائیں جو وژن سے مکمل طور پر عاری ہوں اور یہودی گماشتوں کے بتائے ہوئے اصولوں سے انحراف کی جرأت نہ رکھتے ہوں۔ ان ممالک کو قرض اور خصوصاً IMF کے قرض کے ذریعے مستقل طور پر مقروض رکھا جائے اور یہ قرض بھی ان منصوبوں کے لئے دیا جائے جو ہمارے حق میں ہوں۔ اس قرض پر دوہرا سود وصول کر کے ملکی خزانہ خالی رکھا جائے تا کہ یہ لوگ کسی قسم کی سرتابی کا سوچ ہی نہ سکیں۔ ان لیڈروں کو زیادہ سے زیادہ کرپشن کرنے پر آمادہ کیا جائے اور کرپشن کا پیسہ حفاظت اور سیکریسی کے نام پر یہودی بینکس میں جمع کیا جائے۔ اس پیسے کو کسی معقول بہانے سے ضبط بھی کیا جا سکتا ہے (جیسا کہ ایران کے ساتھ ہوا)

تیسری دنیا کے لیڈروں کو مسلسل عیاشی، امیرانہ ٹھاٹ باٹھ اور امیرانہ طرز حکمرانی کی طرف راغب کیا جائے۔ حکمرانوں سے اپنی عیاشیاں اور کرپشن بحال رکھنے کے لئے زیادہ سے زیادہ ٹیکسز لگوائے جائیں تا کہ حکمرانوں کے خلاف عوام میں مسلسل بے چینی اور نفرت بڑھے۔ اس طرح ہم اپنی مرضی کے حکمران بدل سکتے ہیں۔ ان حکمرانوں کو زیادہ سے زیادہ کک بیکس دے کر اپنا غلام بنائے رکھا جائے۔ اس طرح یہ لوگ بھی اپنی انڈسٹری کو ترقی نہیں کرنے دیں گے بلکہ ہمیشہ ہمارے محتاج رہیں گے اور ہم گھٹیا چیزیں دوہری قیمت پر انہیں دے سکتے ہیں جس سے ہماری انڈسٹری ترقی کرے گی۔

ان حکمرانوں کو زیادہ سے زیادہ بیرونی ممالک کے دورے کرائے جائیں جہاں شراب اور یہودی لڑکیوں کے ذریعے ہم ان سے ہر مطلب نکلوا سکتے ہیں اور سب سے خطرناک منصوبہ تھا کہ تیسری دنیا کے ذہین نوجوانوں کو زیادہ سے زیادہ سکالرشپ دے کر مغربی ممالک کی چندھیا دینے والی روشنیوں میں بلایا جائے۔ وہاں ان کی برین واشنگ کی جائے۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد انہیں معقول مشاہرے دے کر اپنے منصوبوں میں ضم کر لیا جائے تا کہ یہ واپس جانے کا نہ سوچیں۔ مزید یہ کہ انہیں مغربی آزادی اور سیکس کا اس قدر عادی بنا دیا جائے کہ یہ لوگ اپنے اپنے ممالک کے کام کے نہ رہیں اور نہ ہی وہاں جانے کا سوچیں۔ یہ لوگ ہماری بہترین خدمت کر سکتے ہیں۔

معذرت سے یہاں دو مثالیں پیش خدمت ہیں اول: آج سے کچھ سال پہلے ہمارے کچھ وزراء کرام امریکہ کسی اہم دورے پر تشریف لے گئے۔ وہاں وہ کسی بھارتی نژاد رقاصہ کے پاس تشریف لے گئے اور کئی ہزار ڈالرز بطور ٹپس دے آئے۔ یہ موضوع کچھ عرصہ اخبارات کی زینت بھی بنتا رہا۔ دوسرا واقعہ ایک بہت ہی اہم شخصیت کا ہے جو اسی طرح غیر ملک کے دورے پر تشریف لے گئے اور وہاں انہیں خوبصورت لڑکیاں بطور Massagers مہیا کی گئیں۔ یہ اہم شخصیت انہیں ادائیگی کئے بغیر پاکستان واپس آ گئی۔ وہاں اخبارات میں شور اٹھا تو ہمارے سفارتخانے کو کافی بڑی رقم ڈالرز میں ادا کرنی پڑی۔ شرمندگی چھپانے کے لئے پاکستان میں یہ خبر چھپی کہ یہ لڑکیاں بطور گائیڈز انگیج کی گئی تھیں حالانکہ سرکاری دورے کے موقعہ پر تمام گائیڈز میزبان

حکومت کی طرف سے مہیا کئے جاتے ہیں۔ جہاں تک بیرونی ممالک کے دوروں کا سوال ہے تو یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ تمام دنیا میں سب سے زیادہ بیرونی ممالک کے دورے ہمارے رہنما کرتے ہیں۔ بہر حال اگر یہودیوں کے منصوبہ کو سامنے رکھ کر سوچا جائے تو سب کچھ واضح ہو جاتا ہے۔

مسلم امہ

اوپر دی گئی تفصیل کے علاوہ مسلمان دنیا کے لئے کچھ مزید ہدایات بھی تھیں جس میں پاکستان بھی شامل تھا۔ مسلمان دنیا کو قابو کرنے کے لئے اسلام اور علماء کا نسخہ استعمال کرنے کا منصوبہ تھا۔ یہودیوں کے خیال میں اگر مسلمان دنیا کو قابو نہ کیا گیا تو وہ یہودیت کے بہت بڑے دشمن ثابت ہو سکتے ہیں اور یوں وہ یہودیت کو بہت زیادہ نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ یہودی تا حال مدینہ منورہ میں مسلمانوں کی ہجرت، یہودی قبائل کا خاتمہ اور مسلمانوں کی جنگی صلاحیت نہیں بھولے۔ مسلمانوں کے لئے مندرجہ ذیل نکات پر عمل کرنے کی ہدایت تھی۔

اول: مسلمانوں میں اسلامی تعلیم کو عام کیا جائے۔ زیادہ سے زیادہ اسلامی مدارس کھولے جائیں اور ایسے علماء اور مذہبی پیشوا سامنے لائے جائیں جو مسلمانوں میں فرقہ واریت، فرقہ وارانہ نفرت اور باہمی عدم برداشت پیدا کریں جس سے مسلمانوں میں انتشار اور باہمی نفرت پروان چڑھے۔ دوم: جہاد کے نام پر ایسے فرقے پیدا کئے جائیں جو غیر مسلموں کی بجائے اپنے ہی لوگوں کو ختم کریں۔ اس سے مسلمانوں میں باہمی نفاق، باہمی نفرت اور قتل و غارت بڑھے گی اور جتنی زیادہ قتل غارت ہو گی یہ لوگ اتنے ہی زیادہ ہمارے غلام ہوں گے۔ سوم: اور سب سے اہم مسلمانوں کو ظاہری اسلامی تعلیم میں اس حد تک مگن کر دیا جائے کہ وہ دنیاوی تعلیم خصوصاً سائنس اور سائنسی تحقیق کا قطعاً نہ سوچیں۔ جب تک یہ لوگ سائنس اور سائنسی تحقیق سے دور رہیں گے یہ لوگ پس ماندہ رہیں گے اور جتنا زیادہ پس ماندہ ہوں گے اتنے ہی زیادہ ہمارے غلام ہونگے۔ کیونکہ ہر چیز کے لئے انکا انحصار ہمارے رحم و کرم پر ہوگا۔ ان کے سکولوں کے سلیبس میں سائنس اور دیگر کار آمد مضامین نکال کر اسلام کے نام پر ایسے ایسے مضامین شامل کئے جائیں جن سے یہ لوگ ترقی نہ کر سکیں اور ایک دوسرے کی گردنیں کاٹیں۔ اس مقصد کے لئے مختلف اسلامی فرقوں کے مدارس اور علماء کو زیادہ سے زیادہ امداد دی جائے۔ ان میں سے کچھ لوگ آسانی سے ہمارا مقصد حاصل کر سکتے ہیں۔ کیا ہمیں یاد نہیں کہ جب ہلاکو خان بغداد تباہ کرنے پہنچا تو ہمارے علماء کرام مناظرہ کر رہے تھے کہ حضور کریم مسواک کس طرح فرماتے تھے۔

معزز قارئین! اس وقت تو یہ منصوبہ مجھے بالکل بلف معلوم ہوا لیکن آج حقائق میرے سامنے ہیں۔ یہ منصوبہ مکمل طور پر کامیاب ہے۔ آج تمام مسلمان ممالک ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ فرقہ واریت اور عدم برداشت سے ایک دوسرے کے گلے کاٹے جا رہے ہیں۔ جہاد کے ذریعے مسلمان ہی مسلمانوں کا خون بہا رہے ہیں۔ ترکی کے ایک اخبار کے مطابق روزانہ سینکڑوں مسلمان قتل ہو رہے ہیں اور 90 فیصد قاتل مسلمان ہیں۔ آج مسلم دنیا میں کوئی سائنسی تحقیق موجود نہیں نہ ہی کوئی عالمی معیار کی یونیورسٹی ہے۔ اپنی نا اہلی کا نتیجہ ہم فلسطین میں دیکھ رہے ہیں۔ ہمارے لاکھوں کی تعداد میں اسلامی مدارس اور ان مدارس کے فارغ التحصیل علماء مل کر بھی فلسطینیوں کو اسرائیلیوں کے حملوں سے نہیں بچا سکتے۔ یہودی دنیا میں تحقیق اور ایجادات کے حوالے سے اب تک 110 سائنس دان نوبل انعام حاصل کر چکے ہیں جب کہ ڈیڑھ ارب مسلمانوں میں اب تک صرف

10 افراد کو نوبل انعام ملا جن میں سے 6 افراد کو "امن" کی بنیاد پر یہ انعام دیا گیا بدیگر الفاظ یہودی غلامی قبول کرنے کے بدلے یہ انعام ملا۔ سائنسی تحقیق میں صرف ایک انعام ڈاکٹر عبدالسلام کو ملا جسے ہم پاکستانی تصور ہی نہیں کرتے۔ ہم نے اپنے ماضی کے عظیم سائنسدانوں کی تحقیق کی درخشندہ روایات نبھانے کیوں دفن کر دی ہیں۔ اس سے زیادہ بھلا امہ کی بدقسمتی کیا ہوسکتی ہے؟ اس لئے یہ کہنا بجا ہوگا کہ یہودی مظالم اپنی جگہ لیکن ہمیں سوچنا ہوگا کہ یہودی ہم پر کس قدر حاوی ہو چکے ہیں اور اسکا ذمہ دار کون ہے؟

ایک پاکستانی محقق کے الفاظ میں" ایک کروڑ چالیس لاکھ یہودیوں کے مقابلے میں ڈیڑھ ارب مسلمان سیاسی۔ اقتصادی اور علمی طور پر کمزور تر ہو رہے ہیں۔ دنیا کے 57 اسلامی ممالک میں صرف 5 سو یونیورسٹیاں ہیں جبکہ صرف امریکہ میں 5758 اور بھارت میں 8460 یونیورسٹیاں کام کر رہی ہیں۔ عیسائیوں میں شرح خواندگی 90 فیصد مسلمانوں میں 40 فیصد ہے۔ 35 بڑی ملٹی نیشنل کمپنیاں بھی یہودیوں کے کنٹرول میں ہیں"

یہودیت پر ایک تحقیقی مقالہ

آج سے چند سال پہلے یہودیت پر مجھے ایک فکر انگیز تحقیقی مقالہ ملا جس نے میری آنکھیں کھول دیں۔ یہ مقالہ تا حال میرے پاس موجود ہے جس قاری کو چاہیے لے سکتا ہے۔ عنوان ہے: " Why are Jews Persecuted " یہ تحقیقی مقالہ Jayne Gardener نے لکھا ہے۔ یہ دراصل یہودی تاریخ اور یہودیوں کی سازشوں کا اعمال نامہ ہے۔ محقق نے پہلے تو اپنے ان جذبات کا اظہار کیا ہے جو اس نے یہودیوں کے متعلق بچپن سے پال رکھے تھے۔ اس کی نظر میں یہودی بہت معصوم، مظلوم اور دنیا کے ستائے ہوئے لوگ تھے لیکن جب Jayne نے یہودی تاریخ پر تحقیق کی تو وہ حیران ہوا کہ یہودی دنیا کے سب سے زیادہ ظالم، سازشی، بے رحم اور منافق لوگ ہیں۔ اسے معلوم ہوا کہ یہودیت کا مطلب لالچ، چوری، جھوٹ، منافقت، ہیرا پھیری، سازشی جوڑ توڑ اور بے رحمی کی حد تک سود خوری ہے۔ ان کی پوری تاریخ سے کوئی اچھائی نہیں ملتی۔ مقالہ نویس کی تحقیق کے مطابق چند اہم نکات حسب ذیل ہیں:

1۔ مجھے علم نہیں تھا کہ یہودیوں کا رویہ اتنا قابل نفرت ہے کہ انہیں دنیا کے 79 ممالک سے زبردستی نکالا گیا اور بعض ممالک سے تو انہیں ایک سے زیادہ دفعہ نکالا گیا۔

2۔ مجھے علم نہیں تھا کہ "یہودی ہولوکاسٹ" کے متعلق جو یہودیوں نے کہانیاں گھڑ رکھی تھیں سراسر فراڈ تھیں۔

3۔ میں نے بچپن میں ہولوکاسٹ کے متعلق جو کتابیں پڑھیں اور جو فلمیں دیکھیں یہودیوں پر ہونے والے ظلم کے متعلق بیٹھ کر رویا کرتا تھا لیکن اب حقائق جان کر معلوم ہوا ہے کہ یہ بہت بڑا فراڈ تھا اور اس کا مقصد اسرائیلی ریاست کے قیام کے متعلق دنیا کی ہمدردیاں حاصل کرنا تھیں۔ ساتھ ہی اس فراڈ سے جرمنی اور سوئٹزر لینڈ سے اربوں ڈالرز ظلم کے نام پر زبردستی تاوان وصول کرنا تھے۔ اربوں ڈالرز جرمنی سے وصول کئے اور 1.25 ارب سوئٹزر لینڈ سے۔

4۔ بچپن میں یہودی مظلومیت پر Anni Franks کی مشہور ڈائری پڑھ کر میں دھاڑیں مار کر روتا تھا اب مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ بھی ایک قسم کا جھوٹ کا پلندہ تھا اور یہ بھی مکمل طور پر یا جزوی طور پر Anni Franks نے نہیں لکھی تھی۔

5۔ مجھے یہ بھی پڑھ کر دکھ ہوا کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد جو نازی جرمنوں پر یہودیوں پر مظالم کے الزام لگا کر "نیورمبرگ" میں مقدمہ چلایا گیا اور جنگی جرائم کا الزام لگا کر بہت سے جرمنوں کو پھانسی دی گئی یہ بھی فراڈ تھا۔ کیونکہ کنفیشن جرمنوں پر جسمانی اور ذہنی ظلم سے حاصل کیے گئے اور مزید ظلم یہ کہ مدعی بھی یہودی خود تھے اور منصف بھی خود اور سزا دینے والے بھی خود۔

6۔ مجھے یہ جان کر بڑا صدمہ ہوا کہ 1967 کی عرب اسرائیل جنگ میں اسرائیلیوں نے امریکی جنگی جہاز USS Liberty پر جان بوجھ کر بمباری کی جس سے 134 امریکی جوان موت کے منہ میں چلے گئے اور بہت سے زخمی ہوئے۔ امریکہ کی تفتیش میں مزید اضافہ کرتے ہوئے آسانی سے بیان دے دیا کہ یہ بمباری صرف غلط فہمی کا نتیجہ تھی جس کی بچ جانے والے ملاحوں نے پُرزور الفاظ میں تردید کی۔ انہیں کورٹ مارشل کی دھمکیاں دے کر ہمیشہ کے لئے خاموش کیا گیا اور یہ اہم خبر یہودی میڈیا نے دبا دی۔

7۔ مجھے یہ بھی جان کر حیرت ہوئی کہ گو امریکہ اسرائیل کا اہم ساتھی ہے لیکن اسرائیل امریکہ کی جاسوسی سے بھی باز نہیں آتا جیسا کہ اسرائیلی جاسوس Jonathon Pollard کا واقعہ ہے۔ جس نے امریکہ کے اہم ایٹمی راز چرائے۔

8۔ اسرائیل اپنے آپ کو مشرق وسطیٰ کی واحد جمہوریت قرار دیتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ جمہوریت صرف یہودیوں کے لئے ہے۔ غیر یہودیوں کو تو اسرائیل انسان ہی نہیں سمجھتا۔ مظلوم اور نہتے فلسطینیوں پر اسرائیلی ڈیفنس فورسز اور غزہ کے علاقے میں بسنے والے یہودیوں کی طرف سے مسلسل غیر انسانی مظالم کئے جا رہے ہیں۔ دیکھ کر ہی روح کانپ جاتی ہے۔ میں بے گناہ فلسطینی بچوں کی بیدردی سے جلی ہوئی لاشیں دیکھ کر کانپ اٹھتا ہوں جن کا واحد قصور یہ ہے کہ وہ فلسطینی ہیں۔

9۔ یہودیوں نے جو گھناؤنا کردار ہم جنس پرستی، خواتین کی جنسی آزادی۔ پورنوگرافی اور اسقاطِ حمل میں ادا کیا ہے وہ تکلیف دہ اور قابل مذمت ہے۔

10۔ مجھے یہ جان کر بھی شدید صدمہ ہوا کہ یہودیوں نے منظم جرائم، غلاموں کی تجارت۔ تحریک شہری حقوق اور کمیونزم کے استحکام اور پھیلاؤ میں اہم کردار ادا کیا جس میں لاکھوں انسان لقمہ اجل بنے اور مزید لاکھوں ظلم وستم کا نشانہ بنے۔

11۔ مجھے یہ جان کر بھی دکھ ہوا کہ عیسائیت کے خلاف زوردار تحریک کی پشت پر بھی یہودی ہیں جو عیسائیت کے ہر نشان کو مٹانا چاہتے ہیں۔ ان لوگوں نے اپنے پبلک سکولوں سے عیسائیت کا ہر نشان ختم کر دیا ہے حتیٰ کہ کرسمس کا تہوار تک اپنے تعلیمی کلینڈر سے خارج کر دیا ہے۔

12۔ مجھے یہ جان کر بھی دکھ ہوا کہ تاریخی شہر بابل میں لکھی جانے والی اپنی ہی مقدس کتاب تلمود (یہودیوں کے مذہبی فقہ کی کتاب جو بابل میں لکھی گئی تھی) اور غیر یہودیوں کے خلاف پرزور نفرت انگیز مہم چلائی گئی۔ یہ لوگ یہودیوں کی زندگی کو تو مقدس قرار دیتے ہیں اور غیر یہودیوں کو باڑے کے جانور قرار دیتے ہیں جن پر ظلم کرنا، انہیں قتل کرنا اور ان کے سامان پر زبردستی قبضہ کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں۔

13۔ مجھے یہ جان کر بھی دکھ ہوا کہ یہودی دنیا کی کل آبادی کا محض 2 فیصد ہیں لیکن ان لوگوں نے پوری دنیا کی دولت، میڈیا، پریس اور تعلیمی اداروں پر اجارہ داری قائم کر رکھی ہے۔

14۔ مجھے یہ بھی پتہ چلا کہ سیاسی حقوق کے نام پر منظم تحریک بھی انہی لوگوں کی کارستانی ہے تاکہ ہر اس

شخص کے خلاف کاروائی کر کے خاموش کر دیا جائے جو ان کے جرائم یا جھوٹ سے پردہ اٹھانے کی کوشش کرے۔ ان لوگوں نے جرمنی کے عظیم تاریخ دان David Irving & Rudolf یا ان جیسے دیگر اصحاب کو اریسٹ کروا کے جیل بھجوا دیا۔ سخت سزائیں دلوائیں کیونکہ انہوں نے یہودیوں کے کچھ خاص تاریخی جھوٹ پر تحقیق کرنے کی کوشش کی تھی۔ اسی طرح ان تمام ناقدین کو جو ہولوکاسٹ سمیت ان کے دیگر جھوٹ پر یقین نہیں رکھتے انہیں یہ دھونس، دھاندلی اور سخت سزا کا خوف دلا کر چپ کرا دیتے ہیں۔ یہ اتنے وحشی اور ظالم ہیں کہ کوئی بھی ان کے سامنے کھڑا ہونے یا ان کے مکرو فریب سے پردہ اٹھانے کی جرأت نہیں کرتا۔

15۔ عراق جنگ کی پشت پر اسرائیل ہی کے یہودی ہیں جنہوں نے امریکہ میں مقیم اپنی یہودی لابی کے ذریعے صدر بش سے یہ جنگ شروع کرائی اور یہ امر یقینی بنایا کہ یہودیوں کے لڑنے کی بجائے امریکی لڑیں اور جانیں قربان کریں کیونکہ یہودیوں کی جانیں مقدس ہیں لیکن اس جنگ کا تمام تر فائدہ اسرائیل سمیٹے گا۔

16۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ اسرائیلی یہودی ہی ہیں جو کانگریس اور سینٹ کی معرفت امریکی حکومت اور کٹ پتلی صدر کو کنٹرول کرتے ہیں۔ دنیا کے سب سے طاقتور ملک امریکہ کی خارجہ پالیسی خصوصاً مشرق وسطیٰ کے حوالے سے اسرائیلی ہی کنٹرول کرتے ہیں۔

17۔ ان لوگوں کا امریکی ٹیلی وژن اور ہالی وڈ فلموں پر اس قدر کنٹرول ہے کہ یہ لوگ کھلم کھلا عیسائیت اور عیسائی اقدار کا مذاق اڑاتے ہیں اور ہماری خاندانی روایات کی تضحیک کرتے ہیں۔

18۔ جب سے مجھے اپنی تحقیق کے ذریعے یہودیوں کی اصلیت کا علم ہوا ہے، میں ان پر ہونے والے مظالم کی سوچ سے توبہ تائب ہوں لیکن میں یہ بات سمجھنے سے قاصر ہوں کہ یہ لوگ جس ملک یا جس بھی سوسائٹی میں رہتے ہیں وہاں دروغ گوئی، دھوکہ بازی، منافقت اور سازشوں سے کیوں باز نہیں آتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے تاریخ سے کوئی سبق نہیں سیکھا۔ حالانکہ اس امر کو رد نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی منافقت بالآخر ظاہر تو ہو گی۔

جیسے جیسے لوگوں کے سامنے ان کے جھوٹ آشکارا ہو رہے ہیں ان کے خلاف نفرت بڑھ رہی ہے جیسا کہ سابق سوویت یونین یا مشرقی یورپ میں ہوا ہے۔ محقق کے خیال میں موویز، پرنٹ میڈیا اور ٹیلیویژن پر تو ان کی مکمل اجارہ داری ہے لیکن انٹرنیٹ تا حال ان کے جال سے باہر ہے اور انٹرنیٹ پر سامنے آنے والی تحقیق ہی ان کے زوال کا باعث بنے گی۔

معزز قارئین! اوپر دیا گیا تبصرہ یہودی تاریخ اور یہودیوں کی کارستانی کا آئینہ ہے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ 429 قبل مسیح سے شروع ہونے والا یہودی سانپ اس وقت پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے چکا ہے۔ تمام دنیا کی 80 فیصد دولت، دنیا کی معیشت کو ریگولیٹ کرنے والے اہم بینکس، ہیوی آرمز اور الیکٹرانک انڈسٹری، پوری دنیا کے تعلیمی نظام، اہم ممالک اور اہم سیاسی شخصیات پر بالواسطہ طور پر یہ کنٹرول حاصل کر چکے ہیں۔ دنیا کا کوئی اہم ملک ان کی حکم عدولی نہیں کر سکتا۔ تیسری دنیا کی معیشت بھی ان ہی کے قبضے میں ہے۔ تیسری دنیا کے لیڈروں کو بھی یہ خرید چکے ہے۔ مسلم امہ کو اسلام کے ذریعے زیر کرنے کی مہم بھی شروع ہو چکی ہے جس کی جھلک ہمیں فلسطین، کشمیر اور بوسنیا میں نظر آ رہی ہے۔ دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو سوچنے، سمجھنے اور عمل کرنے کی جرأت عطا فرمائے اور یہودیوں کے شر سے بچائے۔ آمین!

ISI
آئی ایس آئی

جس کا نام سنتے ہی دشمن خوف سے تھرا اٹھتا ہے۔

وطنِ عزیز کے اُس قومی ادارے کا دل افروز قصہ جس سے منسلک زیرک و دلیر پاکستانی ملک دشمن قوتوں کے پوشیدہ و عیاں عزائم خاک میں ملانے کی خاطر دن رات متحرک رہتے ہیں۔

☆انتخاب: ڈاکٹر عبداللہ چغتائی

یہ 26 جون 1979ء کی بات ہے، کہوٹہ لیبارٹریز کی حفاظت پر مامور آئی ایس آئی کے جوانوں نے علاقے میں دو غیر ملکیوں کو کار میں اِدھر اُدھر حرکت کرتے دیکھا۔ وہ اپنے کیمروں سے اردگرد کے مناظر کی تصاویر کھینچ رہے تھے۔ یہ دیکھ کر جوانوں کی چھٹی حس جاگ پڑی۔ کہوٹہ لیبارٹریز میں پاکستانی سائنسدان و انجینئر رازدارانہ طور پر ایٹم بم بنانے کی کوششوں میں محو تھے۔ اس بم کی تیاری سے قومی دفاع انتہائی مضبوط ہو جاتا اور دشمن جرأت نہ کرتا کہ پاکستان کو میلی نظر سے دیکھ سکے۔ یہ انتہائی حساس معاملہ تھا۔ بھارت اور اسرائیل کے علاوہ مغربی استعمار کی خفیہ ایجنسیاں بھی پاکستانی ایٹم بم کو تردد کی نگاہ سے دیکھ رہی تھیں۔ ان کی یہی سعی تھی کہ ایک اسلامی ملک ایٹمی طاقت نہ بننے پائے۔ آئی ایس آئی کے جوان اس سارے پس منظر سے بخوبی واقف تھے۔ سو انہوں نے دفاعِ وطن سے متعلق حساس ترین مقام پر دو غیر ملکیوں کو منڈلاتے دیکھا تو چوکنا ہو گئے۔ انہوں نے موقع پاتے ہی انہیں جا پکڑا اور پوچھ گچھ کرنے لگے۔

پوچھ گچھ کے نتیجے میں یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ ایک غیر ملکی، لیو گورریس فرانس کا سفیر تھا۔ دوسرا فرانسیسی سفارت خانے کا فرسٹ آفیسر نکلا۔ بعدازاں تفتیش سے انکشاف ہوا کہ دونوں فرانسیسی امریکی خفیہ ایجنسی سی آئی کے ایجنٹ تھے۔ سی آئی اے نے ان کی خدمات اس لئے حاصل کی تھیں تاکہ کہوٹہ لیبارٹریز کے بارے میں زیادہ سے زیادہ تصویری معلومات حاصل کر سکے۔ یوں آئی ایس آئی کے جوانوں نے حاضر دماغی اور دلیری سے کام لیتے ہوئے دشمن کا منصوبہ خاک میں ملا دیا۔

دشمن کے عزائم اور سرگرمیوں سے باخبر ہونے اور

اپنا دفاع مضبوط بنانے کے لئے از رُوئے قرآن و سنت دشمنوں کی جاسوسی و سراغ رسانی کرنا جائز ہے۔ درحقیقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار مکہ اور دیگر مخالف عرب قبائل کے مذموم منصوبوں و چالوں سے واقف ہونے کی خاطر بڑے مربوط انٹیلی جنس نظام کی بنیاد رکھی۔ ابتداً یہ کام عام مخبروں سے لیا جاتا تھا۔ بعدازاں مدینہ منورہ میں سراغ رسانی کا باقاعدہ شعبہ قائم کیا گیا جس کے پہلے سربراہ حضرت عمر بن خطابؓ بنائے گئے۔ تاریخ اسلام سے عیاں ہے کہ پہلے مسلمان جاسوس خلیفہ اوّل، حضرت ابوبکر صدیقؓ کے صاحبزادے حضرت عبداللہؓ تھے۔ ہجرت مدینہ سے قبل نبی کریم اور خلیفہ اوّلؓ نے تین دن غارِ ثور میں قیام فرمایا تھا۔ اس زمانے میں حضرت عبداللہؓ لڑکپن کی عمر میں تھے۔ پہلے ہی روز رسول اللہؐ نے حضرت عبداللہؓ کو ہدایت دی کہ دن بھر کفار مکہ کے ساتھ اٹھو بیٹھو اور جو باتیں سنو، وہ شام کو آ کر بتاؤ۔ اسی قسم کی جاسوسی حضرت ابوبکر صدیقؓ کی صاحبزادی حضرت اسماءؓ نے کفار خواتین کی گفتگو سن کر انجام دی۔ انہیں دنیائے اسلام کی پہلی مسلم جاسوس خاتون ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے غلام، عامر بھی کفار کی سن گن لیتے رہے۔ یوں ان تین مخبروں کی مدد سے حضور اکرم کو جو معلومات ملیں، ان کے ذریعے آپؐ نہ صرف دشمن کے منصوبوں اور چالوں سے باخبر رہے بلکہ انہیں ناکام بھی بنادیا۔

مدینہ منورہ میں مقیم ہونے کے بعد حضور اکرمؐ اور صحابہ کرام نے اپنے دفاع اور دشمنوں کے عزائم سے باخبر ہونے کی خاطر سب سے زیادہ شعبہ انٹیلی جنس ہی سے مدد لی۔ یوں دشمنوں کی چالوں کا توڑ کر کے مسلمان اپنے آپ کو مضبوط بناتے چلے گئے۔ آخر وہ تاریخی وقت آ پہنچا جب پورے عرب میں اسلام کا نور پھیل گیا۔ سنت نبویؐ پر عمل کرتے ہوئے آنے والی اسلامی حکومتوں نے بھی منظم و مربوط انٹیلی جنس یونٹ قائم کئے۔ درحقیقت وہ ہر اسلامی مملکت کی دفاعی جنگ میں فوج کے کان، آنکھ اور بازو بن گئے۔ سراغ رسانوں، جاسوسوں اور مخبروں پہ مشتمل یہ وسیع نیٹ ورک دشمنوں کو غالب نہ آنے دیتے۔ رفتہ رفتہ جب یہی شعبہ جاسوسی کمزور ہوئے، تو یہ امر بھی اسلامی سلطنتوں کے زوال کا اہم سبب بن گیا۔

انیسویں صدی میں جب انگریزوں نے اسلامی ہندوستان میں قدم جمائے تو وہ تعداد میں بہت کم تھے۔ اسی لئے انہیں اپنے انٹیلی جنس یونٹوں میں مقامی باشندے بھرتی کرنے پڑے۔ انگریزی استعمار نے البتہ یہ جدت اپنائی کہ اس کے ہندو اور مسلم ایجنٹ عموماً اپنے اپنے مذہبی گروہوں ہی میں جاسوسی کرتے۔ ہندوستان میں اپنا اقتدار مستحکم کرنے کے لئے انگریزوں نے بڑا جامع انٹیلی جنس نیٹ ورک تشکیل دیا۔ اسی باعث ملک میں آزادی کے کئی منصوبے مثلاً ''تحریک ریشمی رومال'' کامیاب نہیں ہو سکے۔ بیسویں صدی تک ''آئی بی'' (آل انڈیا انٹیلی جنس بیورو) برطانوی ہند حکومت کی بنیادی خفیہ ایجنسی بن گئی۔ اس کا انتظام پولیس افسروں کے ہاتھوں میں تھا۔ اس ایجنسی کے سویلین مخبر و جاسوس قصبات اور دیہات تک پھیلے ہوئے تھے۔ آئی بی کی ذمے داری تھی کہ وہ حریت پسندوں پر نظر رکھے تاکہ وہ انگریز استعمار کے خلاف منصوبے نہ بنا سکیں۔ برطانوی ہند حکومت نے ''ایم آئی'' (ملٹری انٹیلی جنس) بھی بنا رکھی تھی مگر اس خفیہ ایجنسی کا دائرہ کار صرف فوج تک محدود تھا۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران ہندوستان میں انٹیلی جنس سرگرمیاں بہت بڑھ گئیں۔ جرمن اور جاپانی خفیہ ایجنسیوں کی چالوں کا مقابلہ کرنے کی خاطر انگریزوں نے مزید خفیہ ادارے قائم کئے جن میں ''ایس او ای'' (اسپیشل آپریشن ایگزیکٹو) نمایاں ہے۔ اسی خفیہ ایجنسی

کے ہندوستانی و برطانوی ایجنٹوں نے برما میں جاپانیوں کے خلاف ٹھوس کارروائیاں کیں اور انہیں وہاں مستحکم نہیں ہونے دیا۔

اگست 1947ء میں ہندوستان دو مملکتوں، بھارت اور پاکستان، میں تقسیم ہوگیا۔ تب برطانوی ہند حکومت کی ملکیت ہر شے کا بھی بٹوارہ ہوا۔ بھارتی فوج یوں فائدے میں رہی کہ اسے دہلی میں افواج برطانوی ہند کا جما جمایا ہیڈ کوارٹر مل گیا۔ وہیں ایم آئی سمیت دیگر خفیہ ایجنسیوں کا انفراسٹرکچر بھی مربوط حالت میں تھا۔ یوں نوزائیدہ بھارتی حکومت کو اپنا انٹیلی جنس نظام کھڑا کرنے کے لئے زیادہ تگ و دو نہیں کرنی پڑی۔ دوسری طرف حکومت پاکستان کو نئے سرے سے اپنا انٹیلی جنس شعبہ تعمیر کرنا پڑا۔ تب ملکی وسائل ہی کم نہ تھے، بلکہ تجربہ کار ماہرین جاسوسی کا بھی فقدان تھا۔ بہر حال حکومت برطانوی ہند کی آئی بی میں شامل جو مسلمان افسر و ماہرین پاکستان آئے، انہی پر مشتمل پاکستانی ''آئی بی'' کی بنیاد رکھی گئی، یہ وطنِ عزیز کی پہلی انٹیلی جنس ایجنسی تھی۔

بدقسمتی سے جنگ کشمیر 1947ء میں آئی بی دشمن کے خلاف مؤثر کردار ادا نہیں کر سکی۔ چنانچہ بھارتی مقبوضہ کشمیر پر قبضہ کرنے میں کامیاب رہے۔ اس ناکامی کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ پاکستانی آئی بی کے افسر و کارکن اندرون ملک انٹیلی جنس معاملات کا تجربہ رکھتے تھے۔ جب غیر ملکی سرزمین پر انہیں سراغ رسانی کی حساس و نفیس ترین سرگرمیاں انجام دینا پڑیں تو ناتجربہ کاری کے باعث وہ ان کو صحیح طرح نہ نبھاہ سکے۔ سو پاکستانی عسکری و سیاسی قیادت نے فیصلہ کیا کہ دشمن کے مذموم منصوبے ناکام بنانے کی خاطر نئے خفیہ ادارے قائم کئے جائیں۔

قیام پاکستان کے وقت خاک سے نیا ڈھانچا بنانا پڑا۔ شعبہ جاسوسی سے متعلق صرف ایک تربیتی ادارہ ''اسکول آف ملٹری انٹیلی جنس'' پاکستانی سیکورٹی فورسز کے حصے میں آیا۔ یہ تب تک کراچی سے مری منتقل ہو چکا تھا۔ اس کے پہلے پاکستانی کمانڈر، کیپٹن اختر عالم مقرر ہوئے۔ دسمبر 1947ء میں انٹیلی جنس کا وسیع تجربہ رکھنے والے مسلم فوجی افسر، میجر محمد ظہیر الدین کو اس کا سربراہ بنایا گیا۔

اسی اسکول میں پاکستانی انٹیلی جنس اداروں میں اپنے فرائض انجام دینے والے اولیں افسروں اور ماہرین نے جاسوسی و سراغ رسانی کی تربیت پائی اور دفاع وطن کو مستحکم کرنے میں اپنا کردار ادا کیا۔ جیسا کہ پہلے بتایا گیا۔ ابتداً پاک افواج بے سروسامانی کی حالت میں تھیں۔ سو دفاع کا سارا ڈھانچا اور انفراسٹرکچر نئے طور پہ تخلیق کرنا پڑا۔ اسی لئے پہلے پہل ملٹری انٹیلی جنس سے متعلق معاملات شعبہ ایم او (ملٹری آپریشنز) کو سونپ دیئے گئے جس کی قیادت بریگیڈیئر محمد شیر خان کر رہے تھے۔

تجربہ کار افرادی قوت کی شدید کمی تھی۔ صورتِ حال کی گھمبیرتا کا اندازہ یوں لگایئے کہ آزادی کے وقت پاک فوج میں صرف ایک میجر جنرل، دو بریگیڈیئر اور 53 کرنل موجود تھے۔ آخر سکول آف ملٹری انٹیلی جنس سے تربیت پانے والے ماہرین کا پہلا دستہ نکلا تو مارچ 1948ء میں ''ایم آئی'' (ملٹری انٹیلی جنس) کی بنیاد رکھی گئی۔ اس کے پہلے سربراہ مایہ ناز مسلم فوجی افسر، کرنل محمد عبداللطیف خان بنائے گئے۔ یوں ان کی انتھک رہنمائی میں ہماری ایم آئی کا بے مثال سفر شروع ہوا۔ اس کے بعد جلد ہی ایک اور شاندار خفیہ ادارے، انٹر سروسز انٹیلی جنس کا قیام عمل میں آیا جو آج بحیثیت ''آئی ایس آئی'' جانا جاتا ہے۔ وہ خفیہ ادارہ جس کا نام سنتے ہی دشمن خوف سے تھرا اٹھتا ہے۔

پاکستانی سپوتوں کی قربانیاں

صد افسوس کہ کم از کم دنیائے انٹرنیٹ پہ ان نامور پاکستانی انٹیلی جنس اداروں کے قیام کا سہرا ایک غیر ملکی

فوجی افسر، والٹر کاؤتھورن کے سر باندھ دیا گیا۔ سچ یہ ہے آئی بی، ایم آئی اور ایس آئی ایس..... ان تینوں خفیہ اداروں کے نوزائیدہ پودے پاکستانی افسروں و جوانوں نے ہی محنت و مشقت سے پروان چڑھائے اور اپنا لہو دے کر انہیں توانا و مضبوط درخت بنایا۔ یہ کہنا کہ کسی غیر ملکی فوجی افسر نے قومی انٹیلی جنس اداروں کی بنیادیں رکھیں۔ درحقیقت اوّلین پاکستانی سپوتوں کی قربانیاں اور محنت رائیگاں کرنے کے مترادف ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ آئی ایس آئی کے قیام کی تجویز بانی پاکستان، قائداعظم محمد علی جناح کے ذہنِ رسا کی تخلیق ہو۔ قائد دفاع وطن کو جتنی زیادہ اہمیت دیتے تھے، وہ ان کی تقاریر کے اقتباسات سے عیاں ہے چنانچہ ہوسکتا ہے کہ کسی روشن لمحے انہیں خیال آیا، ایسا ادارہ قائم کیا جائے جو تینوں مسلح افواج (بری، فضائی اور بحری) کے انٹیلی جنس معاملات کو باہم مربوط و منضبط کردے۔

بہرحال پاکستانی مؤرخین نے لکھا ہے کہ اوائل 1948ء میں پاک فوج کے کمانڈر، جنرل ڈگلس گریسی اور وزیر دفاع، سکندر مرزا نے والٹر کاؤتھورن کو ہدایت دی کہ وہ آئی ایس آئی قائم کرنے کی خاطر مطلوبہ اقدامات کرلیں۔ والٹر کاؤتھورن (1895ء-1970ء) برطانوی نہیں آسٹریلوی شہری تھے۔ پہلی جنگ عظیم کے وقت برطانوی فوج میں شامل ہوئے۔ بعدازاں برطانوی ہندفوج کی 16 پنجاب رجمنٹ میں چلے آئے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران مقامی ایم آئی کے چیف رہے۔ جیمز بانڈ کے خالق برطانوی ادیب، آئن فلیمنگ کا بھائی، پیٹر فلیمنگ ان کے ماتحت کام کرتا رہا۔ وہ ایک ماہر جاسوس تھا۔ ہندوستان کا بٹوارا ہوا تو کاؤتھورن نے پاک فوج میں شمولیت اختیار کرلی۔ دراصل ان کے بیشتر دوست مسلم فوجی افسر تھے۔ جب وہ پاکستان چلے گئے تو انہوں نے بھی اس نوزائیدہ ملک کو اپنا نیا وطن بنالیا۔

1948ء میں آپ کو ڈپٹی چیف آف سٹاف مقرر کیا گیا۔ اسی عہدے کی مناسبت سے کاؤتھورن کو یہ ذمے داری سونپی گئی کہ آئی ایس آئی قائم کرنے کی خاطر وہ تمام مطلوبہ کارروائی کرلیں۔ وہ بعدازاں دسمبر 1951ء میں آسٹریلیا چلے گئے تاکہ وہاں کے انٹیلی جنس اداروں سے منسلک ہوسکیں۔ مگر عملی طور پر آئی ایس آئی کو بطور ادارہ کھڑا کرنے کی ذمے داری کرنل شاہد حامد کو سونپی گئی۔ تب کرنل صاحب پاکستان نیشنل گارڈز کے کمانڈر کی حیثیت سے کام کررہے تھے۔ انہیں نئی ذمے داری ملی تو فوراً نئے محاذ پہ جت گئے۔

کراچی میں عبداللہ ہارون روڈ اور غلام حسین ہدایت اللہ روڈ کے سنگم پہ، زینب مارکیٹ کے سامنے ایک پرانی، چھوٹی سی یک منزلہ عمارت واقع تھی۔ اسی عمارت میں آئی ایس آئی کا پہلا ہیڈ کوارٹر قائم ہوا۔ (وہاں اب نئی تعمیر شدہ عمارت میں ایک نجی کمپنی کا دفتر کھل چکا)۔

14 جولائی 1948ء کو عمارت میں انٹیلی جنس کا متعلقہ کام باقاعدہ طور پر شروع ہوا۔ وطنِ عزیز کے اس اہم ادارہ جاسوسی کا آغاز جن نامساعد حالات میں ہوا، ان کا تذکرہ عیاں کرتا ہے کہ تب انسانی جوش وولولے اور جذبہ حب الوطنی کی بدولت، عجب کرشمے ظہور پذیر ہوئے۔ وسائل اور عملے کی شدید کمی تھی، مگر کرنل شاہد اور ان کے مٹھی بھر ساتھی دل برداشتہ نہیں ہوئے۔ انہوں نے لکڑی کے کریٹوں کو بطور میز کرسی استعمال کیا۔ اپنے پلے سے دفتری استعمال کی اشیاء خریدنا معمول تھا۔ دراصل ان پہ بس یہی دھن سوار تھی کہ نوزائیدہ ادارے کو مستحکم کرکے مملکت کا دفاع زیادہ سے زیادہ مضبوط بنادیا جائے۔ تنکا تنکا جمع ہوا آئی ایس آئی میں پہلے پہل صرف تینوں افواج سے منسلک افسر و جوان شامل کیے گئے۔ بعدازاں سویلین عملہ بھی بھرتی کیا جانے لگا۔ ان میں بیشتر افراد پولیس سے لیے جاتے۔ آئی بی کے دو ڈائریکٹروں، سید

کاظم رضا اور غلام محمد نے آئی ایس آئی کے اولین
ارکان کو انٹیلی جنس کے اسرار و رموز سکھانے میں بڑی
جانفشانی دکھائی۔ یوں تنکا تنکا جمع کر کے ایسا قوی لٹھ تیار
کیا جانے لگا جسے دشمن کے سر پہ مارا جاسکے۔ کرنل شاہد
حامد کی ذمے داری تھی کہ وہ ایجنسی کی سرگرمیوں کی
رپورٹ مسلح افواج کے سربراہوں کو ارسال کریں۔ ان
کے نائب (جنرل سٹاف آفیسر) میجر صاحب زادہ
یعقوب علی خان تھے جو بعد میں لیفٹیننٹ جنرل بنے اور
وزیر خارجہ پاکستان رہے۔

آئی ایس آئی کی بنیادیں مضبوط کرنے میں میجر محمد
ظہیر الدین نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ جولائی 1948ء ہی
میں انہیں ملٹری سکول آف انٹیلی جنس سے آئی ایس آئی
منتقل کر دیا گیا۔ وہ سراغ رسانی کے معاملات میں
مہارت تامہ رکھتے تھے۔ ایجنسی کے اولین افسروں نے
بھی ان کے تجربے سے خوب فائدہ اٹھایا۔ افسوس کہ
ظہیر الدین کا انجام کچھ اچھا نہیں ہوا۔ ہوا یہ کہ 1950ء
میں انہیں ترقی دے کر ایم آئی کا سربراہ بنا دیا گیا۔ مارچ
1950ء میں راولپنڈی سازش کیس سامنے آ گیا۔ یہ
سازش پولیس افسروں نے دریافت کی تھی۔ اسی لئے ڈی
جی ایم آئی، ظہیر الدین کو سازش پکڑنے میں ناکامی پر
شدید تنقید کا نشانہ بنانا پڑا۔ (انہیں اپنے چیف آف جنرل
سٹاف، میجر جنرل محمد اکبر خان پہ نظر رکھنا تھی کیونکہ اس
زمانے میں ایم آئی انہی کے ماتحت تھی)۔ نتیجتاً کمانڈر
پاک فوج، جنرل ایوب خان نے انہیں برخاست کر دیا۔
اس اقدام سے ظہیر الدین بہت زیادہ افسردہ و دل گرفتہ
ہوئے۔

ایوب خان کے دور میں کرنل شاہد حامد نے دو برس
تک ڈی جی آئی ایس آئی کی ذمے داری نبھائی۔ چونکہ
وہ میدان جنگ میں آنے کے خواہشمند تھے، سو جون
1951ء میں انہیں بریگیڈیئر بنا کر 100 بریگیڈ (پشاور)

> ''صرف مدبر حکمران اور دانشمند جرنیل ہی فوج کے
> شامل ذہین ترین افراد سے جاسوسی و سراغ رسانی کا
> کام لیتے ہیں۔ سو کامیابی و کامرانی بھی انہی کا مقدر
> بنتی ہے۔'' (مشہور چینی جرنیل و فلسفی سن زی)

کی کمان سونپ دی گئی۔ ڈی جی کا عہدہ پھر شوریدہ سر
سیاسی حالات کے باعث طویل عرصہ خالی رہا۔ اکتوبر
1958ء میں جنرل ایوب خان نے اقتدار سنبھالا تو
انہوں نے بریگیڈیئر ریاض حسین کو آئی ایس آئی کا
سربراہ مقرر کیا۔ دنیائے انٹرنیٹ کے مشہور انسائیکلو پیڈیا،
وکی پیڈیا میں نہ جانے کس نے یہ ذرفطنی چھوڑ دی کہ میجر
جنرل کاؤتھورن 1951ء تا 1959ء آئی ایس آئی کے
ڈی جی رہے۔ اس واسطے انجان لوگ انہی کو اس قومی
ادارے کا خالق سمجھنے لگے ہیں۔

شروع میں آئی ایس آئی دشمن کی سراغ رسانی
کرنے اور اس کے منصوبے خاک میں ملانے پہ مامور
تھی۔ ایوب خان پہلے حکمران ہیں جنہوں نے اس انٹیلی
جنس ادارے کو سیاست میں بھی گھسیٹ لیا۔ ان کی
ہدایت پر ایجنسی کا عملہ حزب اختلاف کی سرگرمیوں پہ نظر
رکھنے لگا۔ انہوں نے اس قومی ادارے کو اپنا اقتدار مستحکم
کرنے کی خاطر بطور آلہ بھی استعمال کیا۔ اس روش سے
بہرحال ادارے کی پیشہ ورانہ ہیئت و ساخت کو نقصان
پہنچا۔ دنیا کی دس بہترین خفیہ ایجنسیوں میں سے ایک
آئی ایس آئی نے جہاد افغانستان کے دوران عالمی شہرت
پائی۔ اسی کے عملی تعاون نے ہزارہا افغان مجاہدین کو اس
قابل بنایا کہ وہ سوویت سپر پاور سے نہ صرف ٹکر لیں بلکہ
اسے پارہ پارہ کر ڈالیں۔ 1989ء میں نوجوان کشمیری
نسل نے تحریک آزادی کا آغاز کیا تو انہیں بھی پاکستان
انٹیلی جنس ایجنسی کی کچھ نہ کچھ مدد حاصل رہی۔ رفتہ رفتہ
آئی ایس آئی بہ لحاظ نفری اور وسائل پاکستان کا سب سے

بڑا انٹیلی جنس ادارہ بن گئی۔ اس کا شمار دنیا کی دس بہترین خفیہ ایجنسیوں میں ہونے لگا۔ مگر اسی اعزاز نے عملے کے کاندھوں پہ پاکستان ہی نہیں دفاع امت اسلمہ کا عظیم بار بھی ڈال دیا۔

ہوا یہ کہ سوویت یونین کی شکست سے آئی ایس آئی کے حوصلے بلند ہو گئے۔ تب بعض کی نگاہیں دنیا کے ان مسلم علاقوں کی سمت اٹھنے لگیں جہاں اغیار نے قبضہ کر رکھا تھا یا وہاں آباد مسلمان ظلم وستم کا شکار تھے۔ سو سوچا گیا کہ ان مسلم علاقوں میں بھی آزادی کی تحریکیں شروع ہونی چاہئیں تاکہ وہاں آباد مسلمان پنجۂ استبداد سے چھٹکارا پا سکیں۔ اس سلسلے میں کچھ عملی اقدامات بھی اٹھائے گئے۔ مگر اس روش سے عالمی طاقتوں کے مفادات کو ضرب لگی، سو ان کی انٹیلی جنس ایجنسیوں نے سب سے طاقتور اسلامی خفیہ ادارے، آئی ایس آئی کے خلاف پوشیدہ و عیاں جنگ چھیڑ دی۔ اسرائیل اور بھارت نے ان قوتوں کا بہ وجوہ بھرپور ساتھ دیا۔ آج عالم یہ ہے کہ خصوصاً بھارتی و اسرائیلی حکومتیں آئی ایس آئی کو بدنام کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتیں۔ مثلاً کچھ عرصہ قبل ایک پاکستانی میڈیا گروپ نے اپنے صحافی پہ حملے کا الزام دھوم دھڑکے سے آئی ایس آئی پر لگایا۔ جلد ہی بھی انڈین چینل یہ الزام بطور "بریکنگ نیوز" نشر کرنے لگے۔ بھارتی مبصروں اور اینکر پرسنوں کی سرتوڑ کوشش رہی کہ پاکستانی انٹیلی جنس ادارے پہ الزامات کا طومار باندھ دیں۔ انہوں نے جھوٹ کو بار بار دہرایا تاکہ عوام اسے سچ سمجھنے لگیں۔ تاہم اس پروپیگنڈے کا عملی اثر نہ پڑا۔

ایک بڑی غلط فہمی

پچھلے ایک عشرے سے غیر ملکی اور ملکی پروپیگنڈے کے باعث پاکستانی عوام میں آئی ایس آئی سے متعلق ایک بہت بڑی غلط فہمی جنم لے چکی۔ یہ کہ جاسوسی فلموں کے مانند اس انٹیلی جنس ادارے کے ماہرین بھی خطرناک و عجیب وغریب ہتھیاروں سے لیس ہوتے ہیں۔ وہ بھیس بدلنے کے ماہر ہیں، پلک جھپکنے میں لوگوں کو اغوا کرتے یا قتل کر ڈالتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آئی ایس آئی کا جسم نہیں دماغ سے تعلق ہے۔ ادارے کے ماہرین کا بنیادی کام یہ ہے کہ بیرون واندرون ملک سبھی پاکستان دشمن عناصر پہ نظر رکھیں، ان کے خفیہ منصوبے آشکارا کریں اور انہیں ناکام بنائیں۔ گویا یہ اعلیٰ پیمانے پہ ذہنی صلاحیتیں استعمال اور تحقیق وتفتیش کرنے والا ایلیٹ ادارہ ہے۔ ادارے سے منسلک ماہرین کا یہ کام نہیں کہ وہ لوگوں پہ گولیاں چلاتے پھریں۔

بالفرض کسی کو گرفتار کرنا، یا کہیں حملہ آور ہونا ہے، تو آئی ایس آئی یہ کام پولیس، رینجرز یا فوج کے ذریعے انجام دیتی ہے۔ اس کے افسروں حتیٰ کہ عام مخبروں کو بھی یہ اختیار حاصل نہیں کہ وہ بغیر وارنٹ کسی کو بھی دھر لیں۔ وہ کبھی "خواہ مخواہ" کسی کو نہیں اٹھاتے، جیسا کہ اکثر قومی انٹیلی جنس اداروں پہ یہ الزام لگتا ہے۔ اسے "ہرفن مولا" مت سمجھئے مزید برآں پاکستانیوں کا ایک طبقہ آئی ایس آئی کو تمام ملکی خرابیوں کی جڑ سمجھنے لگا ہے۔ اس طبقے کو بھی سمجھنا چاہئے کہ یہ خفیہ ادارہ "ہرفن مولا" نہیں کہ حکومتی کرپشن یا امن وامان سے متعلق مسائل حل کر دے۔ آئی ایس آئی صرف متعلقہ اداروں کو باخبر کرتی ہے کہ فلاں شخص، گروہ یا جماعت ملک دشمن سرگرمیوں یا کرپشن میں ملوث ہیں یا فلاں جگہ بم دھماکہ ہونے کا امکان ہے۔ اب کارروائی کرنا متعلقہ وفاقی وصوبائی سکیورٹی اداروں کی ذمے داری ہے۔ اگر وہی اپنا فرض بجالانے میں کوتاہی کریں، تو آئی ایس آئی کو کیسے قصوروار ٹھہرایا جا سکتا ہے؟

یہ یاد رکھنا بھی ضروری ہے کہ پاک افواج اور ہمارے انٹیلی جنس ادارے سیاچن کے برف پوش

پہاڑوں سے لے کر سندھ کے صحراؤں اور بلوچستان کی آب و گیاہ وادیوں تک مادر وطن کا دفاع کر رہے ہیں۔ دشمنوں نے چہار جانب سے پاکستان پہ یلغار کر رکھی ہے اور انہیں یہاں دور حاضر کے میر جعفروں اور میر صادقوں کا تعاون بھی حاصل ہے۔

جھوٹے الزامات کی یلغار

ہمارے یہ دشمن صرف پاک افواج اور قومی انٹیلی جنس اداروں ہی کو اپنے مذموم عزائم کی راہ میں رکاوٹ سمجھتے ہیں۔ اسی لئے ان کی بھرپور سعی ہے کہ ان منظم و منضبط پاکستانی اداروں کو ہر ممکن طریقے سے نقصان پہنچایا جائے۔ مدعا یہ ہے کہ افواجِ پاکستان اور دفاعی اداروں سے وابستہ پاکستانیوں کا جوش و ولولہ سرد پڑے اور ہمتیں جواب دے جائیں۔ ایسے نازک حالات میں اگر پاکستان کا ہی کوئی طبقہ افواج و انٹیلی جنس اداروں پہ بے محابہ تنقید کرنے لگے تو قدرتاً ان پہ مزید دباؤ پڑ جاتا ہے۔ کئی ماہرین کا کہنا ہے کہ پاکستان دشمن طاقتوں نے پاکستانی میڈیا سے منسلک بعض گروہوں اور صحافیوں کو خرید لیا ہے۔ سو ان کا یہ وطیرہ بن چکا کہ اٹھتے بیٹھتے پاک افواج خصوصاً آئی ایس آئی پہ جھوٹے الزام تھوپے جائیں۔ مقصد یہ کہ پاکستانی عوام میں ان کے خلاف نفرت پیدا ہو سکے۔

منہ توڑ جواب

حیرت انگیز اور امید افزا امر یہ ہے کہ انتہائی طاقتور پاکستان دشمن قوتیں مسلسل کارروائیوں کے باوجود افواجِ پاک اور ہمارے انٹیلی جنس اداروں کو کمزور نہیں کر پائیں۔ انہیں آج بھی منہ توڑ جواب مل رہا ہے۔ بے سروسامانی سے آغاز کرنے والی آئی ایس آئی خصوصاً ایک مضبوط ادارے میں ڈھل چکی۔ وسائل مہیا ہو جانے کے باوصف ادارے سے منسلک ماہرین کے جوش و جذبے اور جذبہ حب الوطنی میں کوئی کمی نہیں آئی۔ آج ہر فوجی اور سویلین اس انٹیلی جنس ادارے سے منسلک ہونے کو اعزاز کی بات سمجھتا ہے۔ آئی ایس آئی پہ ایک الزام یہ لگتا ہے کہ ماضی میں ایجنسی نے سیاسی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیا جو اس کے دائرہ کار میں شامل نہیں۔ تاہم بعض اوقات گھمبیر حالات انٹیلی جنس اداروں کو مجبور کر دیتے ہیں کہ تحفظ وطن کی خاطر وہ سیاسی معاملات میں دخیل ہو جائیں۔ مثال کے طور پہ 1980ء تا 1990ء پاکستان قومی و عالمی سطح پہ زبردست ہلچل کا شکار رہا۔ افغانستان پہ روسی حملہ، کے جی بی، را اور خاد کے پاکستانی شہروں میں بم حملے، بھارتی فوج کی تاریخ میں سب سے بڑی جنگی مشق (براس ٹیک)، مقبوضہ کشمیر میں جنگ آزادی کا آغاز، اندرون ملک نسلی، لسانی و مذہبی فساد...... ان واقعات نے خود بخود آئی ایس آئی کا دائرہ کار وسیع کر ڈالا۔

18 جنوری 2012ء کو ایبٹ آباد کمیشن کے سامنے بیان دیتے ہوئے آئی ایس آئی کے سابق سربراہ نے کہا تھا۔ ''دشمن آئی ایس آئی کو دہشت گرد تنظیم کا درجہ دلوانا چاہتے ہیں مگر ہم ان کی تنقید کو تعریف و توصیف اور اپنی کامیابیوں کا انعام سمجھتے ہیں''۔

حقیقتاً آئی ایس آئی کو اس سے بہتر خراجِ عقیدت نہیں مل سکتا کہ دشمن بھی اس پاکستانی انٹیلی جنس ادارے کے کارناموں کو سراہنے پہ مجبور ہیں۔ ادارے سے منسلک اہلِ وطن سے غلطیاں بھی ہوئی ہوں گی مگر یہ بھی یاد رہے کہ وہ جانیں ہتھیلی پر رکھ کر ''غیر مرئی'' محاذِ جنگ میں دشمنانِ وطن سے نبرد آزما ہوتے اور خاموشی سے، چپ چاپ شہید ہو جاتے ہیں۔ ان گمنام شہداء اور مجاہدوں کو اپنی دعاؤں میں ضرور یاد رکھئے۔

(بہ شکریہ روزنامہ ''قدرت'')

ضعیف اور موضوع روایات

تحقیق مزید

کسی ضعیف حدیث پر عقیدے کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی۔ ہم تو آیاتِ قرآنیہ اور احادیث صحیحہ کے ساتھ وعظ و نصیحت اور دعوت و تبلیغ کے پابند ہیں لہٰذا جھوٹی روایات بیان کر کے خود کو جہنم کا ایندھن نہیں بنانا چاہئے

نوٹ: یہ اس سلسلے کا آخری مضمون ہے۔ آئندہ اس سے متعلق کوئی مضمون شائع نہیں کیا جائے گا۔ (مدیر)

مجاہد ادیب شیخ

ماہنامہ "حکایت" شمارہ جنوری 2015ء میں شہزاد احمد صاحب کا ایک تنقیدی مضمون نومبر 2014ء میں چھپنے والے میرے ایک مضمون "موضوع اور ضعیف روایات اور ان کی حقیقت" کے جواب میں شائع ہوا ہے۔ مضمون کا آغاز علمی ہے لیکن آگے چل کر یہ لاعلمی کا مرقع نظر آتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مضمون جذبات خصوصاً غصے کے زیر اثر لکھا گیا ہے اسی لئے بعض جگہ انہوں نے شائستگی کا دامن بھی چھوڑ دیا ہے اور میری نیت پر بھی حملہ کیا ہے حالانکہ دلوں کا حال تو اللہ بہتر جانتا ہے۔ اگر وہ ٹھنڈے دل سے غور کر کے قلم اٹھاتے تو ان کے بہت سے اعتراضات ویسے ہی ختم ہو جاتے پھر بھی ہم ان کی تنقید کا خیر مقدم کرتے ہیں اور ان کے اعتراضات کا جواب دینے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ ان کی غلط فہمی دور ہو سکے۔

سب سے پہلے تو یہ وضاحت ضروری ہے کہ یہ میری ذاتی تحقیق ہرگز نہیں جیسا کہ شہزاد صاحب سمجھے اور اپنی توپوں کا رخ میری طرف کر دیا جن صاحبان کی تحقیق ہے ان کے نام اور کتابوں کے نام آخر میں وضاحت کے ساتھ درج تھے جنہیں شہزاد صاحب نے غصے میں دیکھنے کی شاید زحمت ہی نہیں کی کچھ کوتاہی میری بھی ہے کہ میں ان کا تعارف مضمون کی طوالت کے خوف سے نہیں دے سکا۔ میرا خیال تھا کہ محدثین کی رائے اس سلسلے میں کافی ہو گی پھر اکثر جگہ مؤلف و محقق نے ضعیف یا موضوع ہونے کی عقلی یا نقلی وجہ بھی دی تھی۔ یعنی اس پر مع حوالہ قدیم محدثین اور محققین کی رائے سے مدد لے کر اس پر کوئی فیصلہ دیا تھا۔ میرا مضمون دراصل ایک عربی کتاب

کے اردو ترجمے کی تلخیص تھا جو اس نیت سے لکھا گیا کہ عوام حق و باطل میں تمیز کر کے اپنے عقائد درست کر سکیں اور موضوع احادیث سے پیدا ہونے والے انتشار اور فسادِ عقائد سے بچ سکیں کیونکہ ایسی قیمتی اور نایاب کتب تک رسائی عموماً عام لوگوں کی نہیں ہوتی۔ مذکورہ کتاب کا نام ''اسنی المطالب وی احادیث مختلفۃ المراتب'' ہے اور مصنف کا نام ہے الشیخ محمد بن السید درویش الحوت البیروتی۔ مصنف کا مختصر تعارف درج ذیل ہے۔

الامام المحدث، الولی الکامل، التقی، الفاضل، بقیۃ السلف الصالح، الاستاذ الجلیل ابو عبداللہ الشیخ محمد بن السید درویش الحوت اپنے وقت کے چوٹی کے علماء میں سے تھے تعلیم و تدریس میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ حافظ قرآن اور علوم نقلیہ اور عقلیہ کے ماہر اور علم زاہد کے جامع تھے۔ اپنے فضل و کمال کی وجہ سے عوام میں انتہائی احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ اعمالِ خیر میں سعی اور جہد مسلسل کی وجہ سے لوگ ان سے بہت محبت کرتے تھے۔ نہایت عالی ہمت اور حقوق انسانی کے علمبردار تھے اور مکارم اخلاق کی دولت سے متصف ہونے کے ساتھ ساتھ کلمۂ حق کہنے میں لا یخافون فی اللہ لومۃ لائم کے مصداق تھے لوگوں سے مستغنی رہنے کے لئے تجارت کیا کرتے تھے۔ مسلکاً شافعی اور مشرباً صوفی تھے۔ شام کے مشہور شہر بیروت میں 1209ھ میں پیدا ہوئے اور بیروت میں ہی اپنی تعلیم کی ابتدا کی آپ کے اولین استاد بیروت کے مفتی اعظم شیخ عبداللطیف فتح اللہ اور علامہ محمد الاسکندری تھے اس کے بعد طلب علم کے لئے دمشق کا سفر کیا اور وہاں دوسرے علماء کے علاوہ شیخ محمد بن عابدین بھی جو کہ علامہ ابن عابدین کے نام سے مشہور ہیں اور فتاویٰ شامیہ کے مصنف ہیں، سے اکتساب فیض کیا۔ دمشق سے بیروت واپسی کے بعد تقریباً پانچ سال تک قرآن و حدیث اور فقہ کے مطالعہ میں منہمک رہے اس کے بعد بیروت کی الجامع الکبیر میں درسِ فقہ دینا شروع کیا جس کے بعد آپ کے علوم کا سورج اپنی بلندیوں کو چھونے لگا۔ انہوں نے دین اسلام سے متعلق متعدد کتب لکھیں جن میں سے ایک عمدہ تالیف زیر نظر کتاب اسنی المطالب ہے۔ اردو دان قارئین کے لئے اس کتاب کا ترجمہ علامہ ابوالاحسان عبدالرؤف مفتی میانوی مدیر جامعہ ربانیہ بھلوال نے ''اقری المکاذب'' کے نام سے کیا جو فاضل جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی ہیں جنہوں نے وقت کے جید علماء سے اکتساب فیض کیا اور عرصۂ دراز سے تعلیم و تدریس اور تصنیف و تالیف میں مشغول ہیں زیر بحث کتاب کے علاوہ ان کی ایک شاہکار کتاب ''تفسیری افسانے'' کے نام سے بھی منظر عام پر آ چکی ہے جس میں انہوں نے بعض تفاسیر میں شامل جھوٹی اسرائیلی روایات اور قصوں کی نشاندہی کی ہے جو قرآن و حدیث کی واضح تعلیمات کی نفی کرتی ہیں اور جن کی وجہ سے قرآن و سنت میں تضاد محسوس ہوتا ہے جو کہ محال ہے۔

مجھے نہ تو کوئی دعوئ علم ہے نہ ہی میں نے ذاتی عقل استعمال کر کے کوئی رائے دی تھی جن لوگوں کی رائے پر اعتماد کر کے مضمون لکھا تھا۔ وہ کوئی عام لوگ نہیں ہیں اس کی وضاحت امید ہے ہوگئی ہوگی۔ باقی ان کی رائے میں بھی غلطی ہوسکتی ہے کیونکہ وہ بھی انسان ہیں اور معصوم عن الخطا ہرگز نہیں ممکن ہے کہ زیر نظر کتاب یا اس کے مآخذات میں کسی روایت کو ظنِ غالب کی وجہ سے موضوع و من گھڑت قرار دیا گیا ہو اور وہ حقیقت میں ایسی نہ ہو جیسا کہ امام سیوطی وغیرہ نے امام ابن جوزی کی طرف سے بعض موضوع قرار دی جانے والی روایات کے بارے میں نشاندہی کی ہے کہ وہ موضوع نہیں ہیں لیکن اس کے باوجود کسی ضعیف اور کمزور روایت کو موضوع قرار دیا جانا جب کہ اس کے موضوع ہونے کی

تو ہی امکان موجود ہو، اتنا بڑا معاملہ نہیں جتنا کہ کسی موضوع روایت کو درست قرار دے کر نبی معصوم کی طرف منسوب کر کے اس پر عقیدہ و عمل کی بنیاد رکھ لینا ہے کیونکہ معیار نبوت گرانے سے بہتر ہے کہ راوی کی ثقاہت کو مجروح قرار دے دیا جائے اسی لئے اگر مؤلف نے کسی عالم کی رائے کی مخالفت کی ہے تو اس سے اس کا مقصود اس کی تحقیر یا تنقیص نہیں کیونکہ عموماً انہوں نے راویوں کے ساتھ حسنِ ظن رکھتے ہوئے یہ روایتیں بیان کر دی ہیں کہ ان میں سچ جھوٹ کا احتمال ہے یا انہوں نے یہ روایتیں بطور انکار و تنبیہ بیان کیں اور بعد کے لوگوں نے ان کا ذکر بجائے انکار کے بطور اثبات کر دیا اور یہ کہنا کہ مؤلف کی حیثیت فلاں عالم کے مقابلے میں کیا ہے جو یہ ان کے قول کو رد کر رہا ہے تو یہ کہنا درست نہیں کیونکہ معرفتِ حق نہ تو کسی شخصیت کے ساتھ خاص ہے نہ کسی زمانے یا نسل کے ساتھ اور نہ ہی علمی تحقیق کا دروازہ بند ہو گیا ہے۔ (اسنی المطالب صفحہ 20)

اکثریت ہمیشہ حق کی دلیل نہیں ہوتی کیونکہ قرآن مجید میں ہے کہ اگر تم اکثریت کے پیچھے چلو گے تو گمراہ ہو جاؤ گے (الانعام: 117)۔ دنیا میں بھی ہمیشہ اقلیت ہی صحیح دین پر رہی ہے اور رہے گی اکثریت تو اکثر بے عقل، گمراہ اور نفس پرست ہوتی ہے۔ شکر ہے شہزاد صاحب نے بعض روایات کو موضوع تسلیم کیا ہے اور فرمایا ہے کہ ان کا اکابرین امت میں سے کوئی قائل نہیں ممکن ہے ایسا ہی ہو لیکن ہم خطباء مقررین اور واعظین سے اکثر وہی موضوع روایات عام طور پر سنتے رہتے ہیں اور وہ اپنی کتب میں بھی اپنے مؤقف کو ثابت کرنے کے لئے موضوع اور منکر روایات کو درج کرتے ہوئے بھی نہیں چوکتے چاہے وہ الموضوعات کبیر (گھڑی ہوئی روایات کی بڑی کتاب) میں درج ہوں اسی لئے مجھے یہ مضمون ... دینے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ کوئی بھی روایت اگر درست طریقے سے حدیث رسولؐ ثابت ہو جائے تو اسے تسلیم کرنے میں ہمیں ذرا سا بھی تامل نہیں ہوگا نہ ہی ہم میں کوئی ایسی انا ہے کہ قبول حق سے روک سکے۔ ہر اہل علم پر واضح ہے کہ روافض نے سیدنا علیؓ اور اہل بیت کے فضائل میں تقریباً تین لاکھ حدیثیں گھڑیں یہی وجہ ہے کہ امام دار الہجرہ امام مالکؒ عراق کے بارے میں جو کہ روافض کا اکثریتی علاقہ تھا فرماتے تھے کہ عراق دار الضرب ہے یعنی عراق حدیثیں ڈھالنے کی فیکٹری ہے کہ جہاں سکوں کی طرح احادیث ڈھالی جاتی ہیں۔ غدیر خم والی روایت ہو یا نادِ علی مظہر العجائب والی روایت۔ اسی طرح قیامت کے دن ندا والی روایت کہ فاطمہ بنت محمد گزر رہی ہیں نگاہیں پست کر لو یا یہ کہ ایک دن نبی کریم کا سیدنا حسینؓ کو سینے سے لگا کر رونا اور فرمانا کہ میری امت اسے قتل کر دے گی اور اس جیسی بے شمار روایات رفض کی فیکٹری کا شاہکار ہیں۔ پھر روافض نے سیدنا علیؓ کے فضائل و مناقب میں حدیثیں گھڑنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس سے تجاوز کرتے ہوئے خلفاء ثلاثہ اور دیگر صحابہ کرام کے بارے میں انتہائی غلیظ روایتیں گھڑیں اور انہیں فاسق غاصب بلکہ مرتد تک کہہ دیا اور سیدنا امیر معاویہؓ کو تو خاص نشانہ بناتے ہوئے بہت سی روایات گھڑیں جیسے جب معاویہ کو میرے منبر پر خطبہ دیتے دیکھو تو قتل کر دو (اللآلی المصنوعہ جلد 1 صفحہ 220)۔ یہ تو چند نمونے ہیں اسی پر اکتفا کرتا ہوں کیونکہ تفصیل کا موقع نہیں اور سمجھنے والے اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان میں اور کیا کچھ ہوگا۔

میرے مضمون کا نشانہ صرف موضوع روایات ہی نہ تھیں بلکہ اس میں ضعیف، منکر، باطل، بے اصل، بے سند روایات کا محاکمہ بھی کیا گیا تھا۔ اس کی نشاندہی مضمون میں بھی تھی اور عنوان میں بھی موضوع کے ساتھ ضعیف کا لفظ اسی وجہ سے تھا۔ قارئین کی سہولت کے لئے میں یہاں فنِ حدیث کی اہم اصطلاحات کی بھی وضاحت

یا ہوں جو عموماً فنِ حدیث میں استعمال ہوتی ہیں میں سے کچھ کا ذکر شہزاد صاحب نے بھی کیا ہے تا کہ جو اعتراضات شہزاد صاحب نے کئے ہیں ان کے جوابات سمجھنے میں دقت نہ ہو اور علم ہو جائے کہ انہوں نے غلط فہمی کا ازالہ کیا ہے یا اس میں اضافہ کیا ہے۔

حدیث:۔ حضور نبی کریمؐ کے قول فعل یا تقریر یعنی وہ کام جو حضورؐ کے سامنے ہوا اور انہوں نے سکوت فرما کر اس کی تائید کی حدیث کہلاتے ہیں۔ حضورؐ سے براہ راست استعارے کی وجہ سے صحابہؓ کے قول و فعل کو بھی اس میں شامل کیا جاتا ہے اور اسے خبر و اثر کہتے ہیں۔

خبر متواتر:۔ وہ حدیث ہے جس کے روایت کرنے والے ہر زمانہ میں کثیر تعداد میں ہوں۔

خبر واحد:۔ وہ حدیث ہے جس کے راوی اس قدر کثیر نہ ہوں۔ اس کی آگے مزید کئی قسمیں ہیں۔

مرفوع:۔ وہ حدیث ہے جس میں رسول اکرمؐ کے قول و فعل یا تقریر کا ذکر ہوا ہو اس کی سند نبی کریم تک پہنچ جائے۔

موقوف:۔ وہ حدیث ہے جس میں کسی صحابی کے قول و فعل یا تقریر کا ذکر ہو اور اس کی سند صحابی تک پہنچ کر ختم ہو جائے۔

مشہور:۔ وہ حدیث ہے جس کے راوی ہر زمانے میں تین سے کم کہیں نہ ہوں۔

غریب:۔ وہ حدیث ہے جس کا راوی کہیں نہ کہیں ایک ہو۔

صحیح:۔ جس حدیث کی سند عادل راویوں کے ساتھ مکمل ہو۔ اسماء الرجال، احادیث کے راویوں کے حالات کی کتب اور ان کے نام۔

حسن:۔ جس حدیث کے راویوں کی ترتیب آگے پیچھے ہو لیکن سند مکمل ہو۔

مقطوع:۔ اگر کسی روایت کی سند کسی تابعی تک پہنچ کر ختم ہو جائے تو اسے مقطوع کہتے ہیں۔

موضوع:۔ جس روایت کے کسی راوی کے بارے میں یہ ثابت ہو جائے کہ وہ جان بوجھ کر جھوٹ بولتا ہے اس کی روایت کو موضوع کہتے ہیں۔

متروک:۔ اگر کوئی راوی جھوٹ میں مشہور ہو گیا ہو اگرچہ حدیث میں اس سے جھوٹ بولنا ثابت نہ ہو اس راوی اور اس کی روایت کو متروک (چھوڑ دیا گیا) کہتے ہیں۔

درایت:۔ کسی روایت کو خلاف عقل و نقل ہونے کی بناء پر رد کرنا چاہے راوی کوئی بھی کیوں نہ ہو۔

سند:۔ روایت کے راویوں کا سلسلہ جس کے ذریعے حضور تک روایت پہنچائی جائے، اس کی جمع اسناد ہے۔

متصل:۔ اگر راوی حدیث سے نبی کریمؐ تک سند پہنچ جائے اسے متصل کہتے ہیں۔

مردود:۔ اگر راوی معتبر ہے لیکن روایت ایسی نقل کر رہا ہے جو دیگر معتبر راویوں کے خلاف ہے تو اسے مردود کہتے ہیں۔

عادل:۔ ایسا راوی جو فسق بدعت اور اعمال بد سے دور ہو اس پر جھوٹ کی تہمت نہ ہو اور عموماً سچا ہو۔

مبہم:۔ اگر راوی کا نام یا اس کی ذات کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو کہ وہ ثقہ ہے یا غیر ثقہ تو اسے مبہم کہتے ہیں۔ اس کی روایت قطعاً قابل قبول نہیں ہوتی۔

(ثقہ: معتبر، غیر ثقہ۔ غیر معتبر)

منقطع:۔ اگر درمیان سند سے ایک راوی گر جائے یا گرا دیا جائے تو اسے منقطع کہتے ہیں۔ سند متصل نہ ہونے کی وجہ سے ایسی روایت محدثین کے نزدیک قطعاً قابل قبول نہیں ہوتی۔

مجہول:۔ روایت کے درمیان سند میں کوئی ایسا راوی جس کا حال معلوم ہی نہ وہ اسی روایت اور راوی کو

مجہول کہتے ہیں، یہ غیر معتبر ہو گی۔
رافضی:۔ خلفائے ثلاثہ کو برا کہنے والا۔ جرح:۔ کسی راوی یا روایت پر تنقید۔ تعدیل:۔ کسی راوی یا روایت کی درستگی کو ثابت کرنا۔
مرسل:۔ اگر روایت کی سند میں سے صحابی کا نام غائب کر دیا جائے یعنی تابعی یہ کہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا فرمایا یا ایسا کیا اور صحابی کا ذکر ہی نہ ہو جس سے سنا ہو تو ایسی روایت کو مرسل کہتے ہیں اور یہ محدثین کے نزدیک قابل قبول نہیں۔
کذاب:۔ ایسا راوی جس کا حدیث کے معاملے میں جھوٹ بولنا ثابت ہو۔
منکر:۔ وہ حدیث ہے جس کا راوی باوجود ضعیف ہونے کے جماعت ثقات کے مخالف روایت کرے۔ یہ غیر معتبر ہوتی ہے۔
مدرج:۔ وہ حدیث ہے جس میں کسی جگہ راوی اپنا کلام کسی نبی پاکؐ کے کلام کے ساتھ ملا کر درج کر دے یہ بھی غیر معتبر ہو جاتی ہے۔
تدلیس:۔ وہ روایت جس کی سند سے کوئی راوی غائب کر دیا جائے ایسا راوی عموماً ضعیف ہوتا ہے اور اس کے ضعف کی وجہ سے اسے غائب کیا جاتا ہے تاکہ روایت معتبر لگے ایسی روایات محدثین کے نزدیک ہرگز قابل قبول نہیں ہیں۔
ضعیف:۔ وہ حدیث جس کے راوی میں حدیث صحیح و حسن کی شرائط نہ پائی جائیں۔
(ماخوذ از خیر الاصول فی حدیث رسول از علامہ خیر محمد صاحب جالندھری اور مذہبی داستانیں حصہ سوم از علامہ حبیب الرحمٰن کاندھلویؒ)
شہزاد صاحب کے کچھ اعتراضات کے جوابات تو تمہید میں آ چکے ہیں اب ان کے باقی اعتراضات کو دیکھتے ہیں۔

یہ درست ہے کہ فضائل اعمال میں ضعیف حدیث پر عمل کی اجازت دی گئی ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ کسی ضعیف حدیث پر عقیدے کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی اور ہم آیات قرآنیہ اور احادیث صحیحہ کے ساتھ وعظ و نصیحت اور دعوت و تبلیغ کے پابند ہیں۔ صحیحین کی روایات تنقید سے بالاتر ہیں کیونکہ پہلے محدثین کرام بخاری و مسلم کی ان روایات پر جرح کرتے رہے ہیں جو ان کی نظر میں خلافِ عقل یا اصولِ شرعیہ کے خلاف تھیں ان میں سے کوئی بھی اس کا قائل نہ تھا کہ بخاری و مسلم کی ہر روایت پر ایمان لانا ضروریات دین میں داخل ہے اور ان پر تنقید گناہ ہے اور سند کے معتبر ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ روایت بھی صحیح ہو بعض اوقات سند معتبر ہوتی ہے لیکن دیگر وجوہات کی بناء پر روایت غلط ہوتی ہے۔ کسی محدث کا کسی روایت کو صحیح کہنا اس امر کی دلیل نہیں ہوتا کیونکہ یہ ان کا اجتہادی فیصلہ ہوتا ہے کہ وہ اسے صحیح قرار دے رہے ہوں یا غلط ممکن ہے دیگر آئمہ کا اجتہاد ان کے برعکس ہو یہ فیصلے ظنی ہیں اور قطعی شے تو صرف کتاب اللہ ہے۔
(مذہبی داستانیں اور ان کی حقیقت، از علامہ حبیب الرحمٰن صدیقی کاندھلوی حصہ دوم صفحہ 20-21۔)
سیدہ فاطمہؓ کے بارے میں روایت کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔
''حضرت ابو ایوب انصاریؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریمؐ نے فرمایا جب قیامت کا دن ہو گا تو عرش کے درمیان سے ایک منادی ندا کرے گا اے جمع ہونے والو! اپنی نگاہیں نیچی کر لو تاکہ فاطمہؓ بنت محمدؐ پل صراط سے گزر جائیں۔ وہ بجلی کی طرح ستر ہزار حوروں کے ساتھ گزریں گی۔ (اللآلی المصنوعہ فی احادیث موضوعہ ج 1 صفحہ 403 میزان الاعتدال ج 1 صفحہ 533)
ابو الفضل جلال الدین عبدالرحمٰن بن کمال سیوطیؒ لکھتے ہیں اس کے راوی محمد بن یونس الکریمی حسین ان

حسن الاشعر، قیس بن الربیع اور طریف بن سلیمان ہیں جو یہ روایت ایک دوسرے سے نقل کر رہے ہیں۔ چاروں متروک ہیں (اللآلی المصنوعہ جلد 1 صفحہ 403)

سیوطیؒ نے سب سے آخری راوی اصبغ بن نباتہ کا ذکر نہیں کیا جو سب سے بڑا کاذب ہے۔ باقی چار میں سے بھی قیس بن الربیع کے سوا تینوں کذاب اور حدیثیں گھڑنے والے دجال کے طور پر مشہور ہیں جبکہ قیس بن الربیع سچے تھے مگر بڑھاپے میں دماغ میں تغیر پیدا ہو گیا تھا اور روایت میں خلط ملط کر جاتے تھے۔

(مذہبی داستانیں حصہ دوم صفحہ 210)

اس روایت کے بغیر بھی زہراؓ کی فضیلت مسلمہ ہے۔

مذکورہ روایت کی بنیاد پر ثابت کی جانے والی فضیلت درحقیقت دیگر ازواج اور بنات کی ذم ہے جسے شہزاد صاحب سمجھ نہیں سکے اور اس سے سیدھا مطلب یہی نکلتا تھا جو میں نے بیان کیا۔ یہ کوئی شیطانی مطلب نہیں بلکہ اسے درایت اور جرح کہتے ہیں اور یہ مطلب میں نے نہیں نکالا بلکہ آئمہ جرح و تعدیل نے نکالا ہے۔ البتہ شہزاد صاحب نے اس کے حق میں جو دلائل دیئے ہیں وہ یقیناً باطل اور فاسد ہیں کیونکہ صدیق اکبر کو صدیق کہنے کا یہ مطلب نہیں کہ دیگر صحابہ کرام معاذ اللہ جھوٹے ہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ سچے تو سارے صحابہ ہیں لیکن ہر حال میں سچائی ابوبکرؓ کی فطرت ثانیہ بن چکی ہے جیسے قرآن مجید میں ابراہیمؑ کو صدیق کہا گیا اس سے دیگر انبیاء کا معاذ اللہ جھوٹا ہونا لازم نہیں آتا۔ اسی طرح عثمانؓ کو غنی کا لقب حد درجہ سخاوت پر ملا اس کا مطلب یہ نہیں کہ دیگر صحابہ بخیل تھے۔ جیسا کہ شہزاد صاحب نے مطلب نکالا وہ بھی سخی تھے مگر عثمانؓ سے کم۔ اسی طرح سیدنا علیؓ شجاعت میں بڑھ کر تھے اسی لئے اسد اللہ کہلائے اس کا مطلب ہے کہ دیگر صحابہ بھی بہادر تھے مگر ایک حد تک نہ کہ اس سے بزدلی کا مطلب نکلتا ہے۔ یہ ویسے ہی ہے جیسے سیدنا خالدؓ بن ولید کو سیف اللہ (اللہ کی تلوار) کا لقب بھی حد سے زیادہ بہادری پر ملا۔ اسی طرح عشرہ مبشرہ کا حال ہے کہ ان کو اعلیٰ کردار و عمل پر دنیا میں ہی جنت کی بشارت دی گئی تو یہ ان کی عزت افزائی تھی جو کہ کئی اور مواقع پر دیگر صحابہ کو بھی دی گئی جیسے بدری صحابہ کو۔ بیعت رضوان والے صحابہ کو اس سے دیگر کا معاذ اللہ جہنمی ہونا ثابت نہیں ہوتا نہ ہی اس کا یہ مطلب نکلتا ہے جو شہزاد صاحب نے نکالا۔ اب یہ ہمیں معلوم نہیں کہ ایسے شیطانی مطالب ان کے ذہن میں کس نے ڈالے۔

سیدہ عائشہ صدیقہؓ کی معراج سے متعلق روایت کی تفصیل یہ ہے۔

طبری نے اپنی تفسیر میں ایک روایت سیدہ عائشہؓ کی جانب منسوب کر کے نقل کی ہے کہ ہم سے ابن حمید نے بیان کیا ان سے سلمہ نے وہ محمد سے نقل کرتے ہیں محمد کہتے ہیں کہ مجھ سے ابوبکر کی اولاد میں سے کسی نے بیان کیا کہ عائشہ کہا کرتی تھیں کہ حضور کا جسم غائب نہیں ہوا تھا بلکہ معراج آپ کو آپ کی روح کے ذریعے ہوئی۔

سید سلیمان ندویؒ لکھتے ہیں کہ اس روایت کے سلسلہ میں محمد بن اسحٰق اور سیدہ عائشہؓ کے درمیان ایک راوی یعنی خاندان ابوبکرؓ کے ایک شخص کا نام مذکور نہیں اس لئے یہ روایت پایۂ صحت سے فروتر ہے (سیرت النبی ج 3 صفحہ 433) مزید امام ذہبی، بخاری، نسائی، علی بن المدینی اور یحییٰ بن معین ان تمام راویوں کو ضعیف قرار دیتے ہیں (مذہبی داستانیں حصہ اوّل صفحہ 169) روحانی معراج کا کوئی بھی منکر نہیں ہاں ایک طبقہ جسمانی معراج کا منکر ضرور ہے جو اپنی تاثیر میں یہ روایت پیش کرتا ہے جس کی حیثیت واضح ہو چکی ذرا سوچیں کہ شہزاد صاحب کا اس روایت پر اصرار نبی کی شان بڑھانا ہے کہ گھٹانا۔

معراج سے متعلق سیدہ عائشہؓ کی اس روایت کے

بنیادی، ناقل محمد بن جریر طبری ہیں جو تاریخ وتفسیر کے امام ہیں، انہوں نے اپنی کتب میں واقعات کو اس تناظر میں پیش کیا ہے کہ اسلام کی ان عظیم شخصیات کے دامن داغ دار ہو گئے ہیں جن کی قربانیوں اور بے لوثی کی گواہی قرآن وحدیث نے دی ہے۔ شیعہ سنی دونوں کی کتب میں ان کی روایتیں موجود ہیں مگر ان کا اپنا رجحان اوّل الذکر کی طرف زیادہ تھا کیونکہ انہوں نے ان کے کئی مخصوص مسائل کی تائید میں کتابیں لکھی ہیں۔ یہ درست ہے کہ انہوں نے اپنی تاریخ الامم والملوک میں صحابہ کے کارنامے بھی بیان کئے ہیں مگر مستشرقین کی طرح ان کے خلاف زیادہ لکھا ہے تاکہ خود کو غیر جانبدار اور قابل قبول بنایا جا سکے (مستشرقین وہ غیر مسلم علماء ہوتے ہیں جو اسلام، پیغمبر اسلام، قرآن اور صحابہؓ کے بارے میں لکھتے ہیں جس میں بظاہر تعریف ہوتی ہے لیکن دراصل وہ خفیہ طور پر غلط بیانی کر کے اپنا مقصد حاصل کرتے ہیں)

ابن حجر لسان المیزان میں لکھتے ہیں۔ امام احمد بن علی السلیمانی (321ھ تا 413ھ) نے صاف فرما دیا تھا کہ ابن جریر رافضیوں کی حمایت میں روایت کرتے ہیں صحاح سے باہر بھی اہل سنت جامعین حدیث کی کسی کتاب میں ان کی روایت سے کوئی حدیث نہیں ملتی حالانکہ ابن جریر کی ولادت 224ھ کی ہے۔ امام بخاریؒ کی وفات 256ھ کے وقت ابن جریر کی عمر 32 سال تھی۔ امام مسلمؒ کی وفات 261ھ کے وقت سے ابن جریر 37 برس کے تھے۔ امام ابو داؤدؒ کی وفات 275ھ کے وقت ابن جریر 51 سال کے تھے۔ ابن ماجہؒ کی وفات 273ھ کے وقت 49 برس کے تھے۔ امام ترمذی کی وفات 279ھ کے وقت 55 برس کے اور امام نسائی کی وفات 303ھ کے وقت 79 برس کے تھے۔ اسی طرح دارمی کی وفات 255ھ کے وقت 31 برس کے تھے لیکن سنن دارمی اور سنن دارقطنی کے ساتھ ساتھ مستدرک حاکم میں بھی ان کی کوئی روایت نہیں۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ سارے محدثین نے ان کا بائیکاٹ کیوں کر رکھا تھا۔ معجم الادباء میں ہے کہ جب ابن جریر فوت ہوئے تو عوام کے خوف سے ان کو رات کو چپ چاپ دفن کیا گیا۔ بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ ابو جعفر محمد بن جریر طبری ایک ہی زمانہ میں دو تھے۔ دونوں کا نام کنیت وطن اور ولدیت ایک تھی اور دونوں عالم اور مصنف ومؤلف تھے۔ ان میں فرق صرف دادا کا تھا ایک کے دادا کا نام رستم تھا اور دوسرے کا یزید۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ابن جریر دو تین نہیں بلکہ ایک ہی تھے۔ اسلام سے قبل ان کے دادا کا نام رستم تھا اور بعد از قبول اسلام یزید (تنقیح القال، شیخ عبداللہ المامقانی)۔ اسی معراج کی روایت میں ایک راوی محمد بن اسحٰق ہے جو یہودیوں سے روایات لیتا اور شاعروں سے اشعار لکھوا کر صحابہ کی طرف منسوب کر دیتا۔ تقدیر کا منکر تھا اس نے سیرت النبی لکھی جسے اہل مدینہ نے رد کر دیا۔ ہشام بن عروہ اور امام مالکؒ وغیرہ اسے کذاب کہتے ہیں۔ (امام زہری وطبری تصور کا دوسرا رخ از علامہ تمنا عمادی، مذہبی داستانیں اور ان کی حقیقت، علامہ حبیب الرحمٰن کاندھلوی صدیقی)

حدیث قرطاس کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

ابن شہاب زہری روایت کرتے ہیں کہ ''آنحضرتؐ نے اپنی وفات سے چار پانچ یوم پیشتر حاضرین سے کہا کہ کاغذ دوات لاؤ کہ ہم تم کو ایسی چیز لکھوا دیں کہ تم لوگ میرے بعد ہرگز گمراہ نہ ہو۔ اس پر حضرت عمرؓ نے کہا کہ رسولؐ پر درد (مرض) غالب آ گیا ہے اور ہم لوگوں کے لئے کتاب اللہ کافی ہے اس پر حاضرین میں اختلاف رائے ہوا اور قیل و قال کی آوازیں بلند ہوگئیں جس پر آنحضورؐ نے رنجیدہ ہو کر فرمایا کہ نکلو یہاں سے میرے پاس جھگڑنا سزاوار نہیں ہے۔ پھر ابن عباس یہ کہتے ہوئے اٹھے کہ مصیبت اور پوری

معصیت ہے۔ایسی جھوٹی روایات بیان کر کے خود کو جہنم کا ایندھن نہیں بنانا چاہیئے۔ شہزاد صاحب نے اسے سچ ثابت کرنے کے لئے فضول زور قلم صرف کیا ہے۔ یہ روایت خبر واحد ہے اور مرسل ہے کیونکہ زہری عروہ بن الزبیر سے روایت کرتے ہیں کہ جن سے زہری کی ملاقات ہی ثابت نہیں اور ہر اس روایت کو بیان کرنے والے ابن عباسؓ ہیں اور وہ اس میں منفرد ہیں یعنی کسی اور صحابی سے یہ روایت نہیں ہے اس بیان کردہ واقعے کے وقت کئی صحابہ موجود تھے اگر واقعتاً ایسا ہوا ہوتا تو کوئی اور بھی روایت کرتا پھر ابن عباسؓ کی عمر رسول اللہ کی وفات کے وقت بروایت صحیحہ صرف تیرہ برس تھی اور ابن حجر تہذیب التہذیب میں لکھتے ہیں کہ ابن عباسؓ نے رسول اکرمؐ کی زبان مبارک سے نو سے زائد حدیثیں نہیں سنیں یحییٰ بن قطان فرماتے ہیں کہ دس سے زیادہ نہیں سنیں اور امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ چار سے زیداہ نہیں سنیں اسی لئے ابن حجرؒ اس روایت کو سختی سے رد کرتے ہیں (امام زہری و طبری از علامہ تمنا عمادی صفحہ 101)۔ یہ تھی اس روایت کی فنی و علمی حیثیت ورنہ ایک عام آدمی بھی اس قصے کو پڑھ کر اس کے جھوٹ ہونے کو باآسانی سمجھ سکتا ہے۔ نجانے شہزاد صاحب کو کیوں یہ سمجھ نہیں آیا کہ قصہ تو صحابہ کرامؓ پر اعتراض اور طنز کرنے کے لئے گھڑا گیا جس کی زد صرف صحابہ کرامؓ کی تربیت پر ہی نہیں بلکہ ان کے تربیت کنندہ آنحضورؐ پر بھی پڑتی ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں تعصب کی عینک اتار کر حقیقت کو سمجھنے کا حوصلہ دے۔

حدیث قرطاس کے راوی ابن شہاب زہری کو پہلا جامع حدیث و روایت شمار کیا جاتا ہے وہ بخاری کے بھی راوی ہیں اور بہت سی احادیث ان سے مروی ہیں ان کی مرسلات بہت مشہور ہیں اہلسنت و اہل تشیع میں جتنے اختلافی مسائل ہیں ان سب کی روایات میں زہری نظر آتے ہیں۔ نبی کریمؐ کے بعد ایک دور ایسا بھی گزرا ہے جس میں موضوع احادیث کی بھرمار تھی۔ خاص مقاصد کے لئے احادیث وضع کی جاتی تھیں اور ان کو تشہیر کے مراکز پر پہنچا دیا جاتا تھا جہاں سے وہ پورے عالم اسلام میں گردش کرتی تھیں ان مقاصد میں قرآن پر حملے سب سے اہم تھے۔ اختلاف جمع و تدوین قرآن، اختلاف قرأت اور حدیث قرطاس کی موضوع روایتیں انھی ابن شہاب زہری سے منسوب ہیں۔ سقیفہ بنی ساعدہ اور میراثِ نبیؐ کے واقعہ میں رنگ آمیزی، سیدنا ابوبکرؓ اور سیدہ فاطمہؓ کے فرضی اختلاف کی تشہیر، سیدنا علیؓ کی بیعت ابوبکرؓ میں تاخیر یہ سب روایات زہری ہی بیان کرتے ہیں اور وہ ان میں منفرد ہیں شیعہ کتب خصوصاً اصول کافی میں بھی اس کی روایات موجود ہیں۔ یہ ارسال کے ماہر تھے ضعفا سے روایات لیتے تھے اور پھر انہیں درمیان سے نکال کر اوپر کے قابل قبول راویوں کی طرف نسبت کر کے بیان کر دیتے تھے۔

تہذیب التہذیب میں ابن حجر لکھتے ہیں کہ مشہور محدث اور امام فن رجال یحییٰ بن سعید کہتے تھے کہ زہری کی مرسلات ریح کی طرح ہیں امام ذہبی تذکرۃ الحفاظ جلد 2 صفحہ 106 میں لکھتے ہیں کہ ابو قدامہ سرخسی یحییٰ بن سعید سے روایت کرتے ہیں کہ وہ فرماتے تھے کہ زہری کے مرسلات تمام مرسلات سے بدتر ہیں۔ مزید لکھتے ہیں کہ ابوداؤد نے کہا کہ زہری کی حدیثیں 2200 ہیں جن میں نصف مسند ہیں اور نصف مرسل مگر حقیقت یہ ہے کہ صرف بیس فیصد ہی متصل ہیں۔ زہری کو ادراج کی بھی عادت تھی (المختصر من المختصر) اور مدلس بھی تھے۔ ادراج کا مطلب ہے نبی کریمؐ کے الفاظ کے ساتھ کچھ الفاظ اپنی طرف سے ملا دینا اور تدلیس کا مطلب ہے کہ راوی اپنے شیخ یا سلسلۂ روایت کے کسی نام میں قصداً کوئی ایسی صورت اختیار کرے جس سے اس کی اصلی صحیح شخصیت جو متعارف تھی اس پر پردہ پڑ جائے اور سننے والے کا گمان

کسی اور طرف چلا جائے۔ یہ اسناد کی تدلیس ہے۔ متن حدیث میں بھی تدلیس ہوتی ہے کہ مفہوم ایسے ذومعنی انداز میں بیان کیا جائے کہ جس سے سامع کا ذہن حدیث کے صحیح مفہوم کی بجائے کسی غیر مقصود معنی کی طرف چلا جائے یا صحیح معنی کے ساتھ کوئی غلط مفہوم بھی پیدا ہو جائے تدلیس کذب (جھوٹ) ہے اور ارسال بھی ایک طرح کی تدلیس ہی ہے اور مدلس راوی کبھی ثقہ نہیں ہو سکتا۔

حافظ ابن حجر عسقلانی اپنی کتاب طبقات المدلسین صفحہ 15 مطبوعہ مصر میں فرماتے ہیں کہ امام شافعیؒ، دار قطنی اور متعدد لوگوں نے زہری کو تدلیس کی صفت سے متصف کیا ہے یہ صحابہ سے شدید بغض رکھتے تھے اور ان کے کردار اور اختلافات کو مبالغے کے ساتھ نہایت گستاخانہ انداز میں بیان کرتے تھے۔ (مذہبی داستانیں اور ان کی حقیقت از شیخ الحدیث علامہ حافظ حبیب الرحمٰن صدیقی کاندھلوی)

اب آپ کو علم ہو گیا ہوگا کہ یہ روایت کتنی متفق علیہ ہے اور اس سے کس کی جہالت ثابت ہوتی ہے۔ روایت کو درست ثابت کرنے کے لئے انہوں نے بحث تو بڑی خوبصورت کی ہے لیکن اگر بنیاد ہی خراب ہو تو اس پر جتنی بھی خوش نما عمارت بنائی جائے وہ دھڑام سے آ گرے گی۔

باقی آنحضور کا سایہ مبارک تھا یا نہیں یہ امر علماء کے درمیان متنازعہ ہے۔ دونوں طرف دلائل موجود ہیں اس سلسلے میں جو روایت موجود تھی سیدہ زینبؓ والی اس کا ذکر ہم نے کر دیا جس کے ظاہر سے سایہ ہونا ہی ثابت ہوتا ہے۔ ہم نہیں سمجھتے کہ سایہ ہونے سے آنحضور کی شان میں کوئی فرق پڑتا ہے اصل چیز تو ان کی سیرت ہے جو سراپا روشنی ہے بعض لوگوں نے اس لئے سائے کا انکار کیا کہ سایہ زمین پر پڑنے سے بے ادبی کا احتمال ہے

لیکن یہ خیال درست نہیں کیونکہ قرآن بھی سراپا روشنی ہے اور اس کا سایہ بھی زمین پر پڑ سکتا ہے اسے کوئی بے حرمتی نہیں سمجھتا کیونکہ زمین پر سایہ پڑتا ہے ذات تو نہیں۔ پھر خود نبی کریم کو زمین پر بیٹھنا اور لیٹنا پسند تھا کیونکہ اس میں عاجزی ہے اور نبی کریم کا فرمان ہے کہ عاجزی میرا فخر ہے۔ گو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے کہ ہم نے ہر چیز کا سایہ پیدا کیا ہاں معجزاتی طور پر اس سے نبی کریم کو مستثنیٰ کیا جا سکتا ہے البتہ اسے معجزہ ہی سمجھا جائے تو خیر ہے لیکن اگر اس سے خیر البشر محمد کو درجہ انسانیت سے نکال کر فرشتوں میں شامل کرنے کی کوشش کی جائے تو ہم جیسے کمزور اور گناہگار انسانوں کے۔ لئے اپنے گناہوں کے لئے بڑے جواز ہوں گے اور قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر زمین پر فرشتے بستے ہوتے تو میں ان کی طرف فرشتہ ہی پیغمبر بھیجتا۔

جن روایات کا دفاع شہزاد صاحب نے کیا تھا ان کا موضوع یا ضعیف ہونا ہم نے اسماء الرجال اور علماء محققین کی کتب سے واضح کر دیا اس سے زیادہ تفصیل کے ''حکایت'' کے صفحات متحمل نہیں ہو سکتے اسی لئے پہلے بھی ہم نے تفصیل سے گریز کیا تھا مگر شہزاد صاحب کے اعتراضات کے باعث یہ ضروری ہو گیا تھا۔ میرے مضمون میں بیان کردہ دیگر روایات پر بھی جرح کی تفصیل بیان کی جا سکتی ہے لیکن چونکہ ان پر اعتراض نہیں کیا گیا اس لئے اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔ اللہ ہم سب کو اپنے خود ساختہ معیارات کی بجائے قرآن و سنت کی واضح تعلیمات کے آگے سر تسلیم خم کرنے کی توفیق دے اور اپنے سیدھے راستے کی طرف راہنمائی کرے اور اس کے لئے رکاوٹیں دور کرے چاہے وہ ہمارا اپنا نفس ہی کیوں نہ ہو۔ آمین ثم آمین!

O

ایک کردار کی کہانی

پہچان کے منفی حوالے کبھی زندگی کا روگ بن جاتے ہیں اور تا حیات جان نہیں چھوڑتے۔

☆ ڈاکٹر مبشر حسن ملک

اس نے زندگی میں ہر قسم کی محرومیاں دیکھی تھیں، شاید روزِ اوّل سے، ہر دور میں ہر پہلو۔ ماں باپ نے تو اس کا نام عجائب خان رکھا تھا مگر جب وہ عزتِ نفس سے بھی محروم ہوا تو مختلف ناموں سے پہچانا جانے لگا۔ بعدازاں صرف ایڈیٹ کہلانے لگا۔ اس لئے کہ اس نے ایک انتہائی غریب گھرانے میں جنم لیا تھا۔

جس کے نصیب میں تکریم نام کی کوئی شے نہیں تھی اور وہاں امیدوں کے دیے بھی نہیں جلتے تھے۔

عجائب نے ایک ناکارہ شخص کے ہاں آنکھ کھولی تھی، جو نشئی تھا اور مدت سے افیم کی لت میں مبتلا تھا۔ اس کی شخصیت سے غیرت اور حمیت کا جنازہ اٹھ چکا تھا۔ گھر کا سارا بوجھ عجائب کی ماں کے نازک کندھوں نے سنبھال رکھا تھا، وہی گھرانے کی معاشی پرداخت کی ذمہ دار تھی۔

مدتوں عجائب کے گھر کھانا نہیں پکایا جاتا تھا۔ کسی تہوار کے روز اہتمام کا پہلو نکل آئے تو بند کچن کے در کھل جایا کرتے تھے، کبھی یہ بھی غیر ضروری سمجھا جاتا تھا۔ چار نفوس پر مشتمل اس کنبے کو جھوٹا اور باسی کھانے کی عادت پڑ چکی تھی۔ ماں گھر گھر کام کاج کر کے شام جب اپنے غریب خانے کو لوٹتی تو مختلف گھروں سے بچا کھچا کھانا بھی ساتھ لے آتی۔

گھر میں چوتھا فرد عجائب کا بڑا بھائی، نصیب تھا جو اسی گاؤں میں رئیس کے اصطبل میں گھوڑوں کی خدمت پر مامور تھا۔ وہاں تمام گھوڑوں کی نسلی خوبیاں نصیب کے شخصی نسب سے بڑھ کر سمجھی جاتی تھیں اور خادم کی چابک دستی سے زیادہ گھوڑوں کے گن گائے جاتے تھے۔

دوراں کی رُتیں بدلتی رہتی تھیں مگر عجائب کے گھر میں موسم یکساں رہتے تھے۔ سرما ہو یا گرما، اہل خانہ کے لباسوں میں کچھ زیادہ فرق نہیں پڑتا تھا۔ ناقابل برداشت سردی میں اگر کوئی ترس کھا کر ناکارہ سا سویٹر عجائب کو دے دیتا تو وہ اس سے تن ڈھانپ لیا کرتا تھا، وگرنہ صرف دھوپ تاپا کرتا۔

پاؤں کے جوتے اسے کبھی نصیب نہیں ہوئے تھے۔ اسے سمجھایا گیا تھا کہ مکمل پہناوے فقط اہل ثروت افراد کے چونچلے ہوا کرتے ہیں۔ یہ جان کر اس نے تن و لباس کی صفائی کو بھی کم و بیش اسی زمرے میں شامل کر لیا تھا۔ گھرانے کی آمدنی اتنی قلیل تھی کہ بچوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنا ممکن نہیں تھا۔ ادھر باپ کا نشہ ٹوٹ جاتا تو وہ قیامت برپا کر دیا کرتا تھا۔ اسے غیر قانونی دوا بہم پہنچانا بچوں کی پرداخت سے اہم خیال کیا جاتا تھا۔

ابتدائی تعلیم بچوں نے اگر کوئی حاصل کی تھی تو وہ گالیوں کے غلیظ الفاظ تھے، جنہیں گاؤں کے امراء اور اربابِ اختیار غریبوں کی خوراک سمجھا کرتے تھے۔ محروم طبقے نے بھی ان خرافات کو حق سمجھ کر اپنے گھرانوں میں رائج کر لیا تھا بلکہ گھٹیا لفظوں کے چناؤ میں اوج کمال کا عنصر بھی شامل معمول کر لیا تھا۔ ان سلاسل میں عجائب کا گھر لاثانی کہلانے میں عار محسوس نہیں کرتا تھا بلکہ اس کا باپ ان رویوں کو خاندان پر رعب جمانے کا حربہ خیال کرتا تھا۔ جو اس کے نزدیک گھرانے کو راہِ راست پر قائم رکھنے کے لئے ضروری تھا۔

اس گھرانے میں تمناؤں کے سراب نہیں دکھا کرتے تھے بلکہ ایسی تمام سوچیں لاحاصل گردانی جاتی تھیں جو شکوؤں کو جنم دیتی تھیں۔ یہ بھی نہیں مانا جاتا تھا کہ شکوے ہمیشہ منفی رجحان نہیں ہوتے بلکہ ردعمل صحیح سمت میں جستجو بڑھانے میں کارفرما ہو سکتے ہیں۔ یہ گھرانہ مکمل طور پر منزل ناشناسی کا شکار تھا، جسے اپنا ہر نا خدا، خدا دکھائی دیتا تھا۔ عجائب کا بھائی ادراک رکھتا تھا کہ اس کی مفلس ماں گھریلو ضروریات اور پیسہ بنانے کے لئے گناہ آلود زندگی کو بھی جائز سمجھ لیتی تھی۔ وہ شکر کرتا کہ اس کی بہن جوانی میں پہنچنے سے پہلے ہی انتقال کر چکی تھی۔

پھر عجائب کیسے مختلف شخص بنتا گیا؟ یہ معمہ نہیں تھا، زمانے کی ٹھوکریں کبھی انسان کو پچھاڑ دیتی ہیں مگر بعض اوقات اسے کامل بھی بنا دیتی ہیں اور حالات جیون کو ایسی ڈگر پر چلا دیتے ہیں کہ ٹھوکریں اور مشاکل لاشعوری طور پر سکھتے ہوئے انسان کو مثبت پرداخت سے ہم کنار کر دیتی ہیں۔ عجائب کے ساتھ یہی کچھ ہوا تھا۔ گھرانے سے

علیحدگی اس کے کام آ گئی۔

وہ پانچ برس کا ہوا تو اس کی ماں نے سکھ کا سانس لیا بلکہ اسے اچانک احساس ہوا کہ اس کا چھوٹا بیٹا پانچ "بہاریں" دیکھ چکا تھا۔ اس دم بچے نے ماں کو باور کرایا کہ اسے مدرسہ اچھا لگتا تھا مگر ماں نے اسے مدرسے کے پچھواڑے میں ہیڈ ماسٹر کے گھر ملازم کروا دیا۔ وہ سارا دن ہیڈ ماسٹر کے ننھے بچے کو لان میں کھلایا کرتا۔ اس بچے عجائب کی عملی زندگی میں قطع برید شروع ہو گئی تھی۔

اسے گالیاں دینے سے ممانعت کر دی گئی اور تن صاف رکھنے کی ہدایت کی گئی۔ اسے صاف ستھرا لباس بھی مل گیا۔ گھر میں وہ کئی دوسرے کام بھی کر دیتا تھا۔ گھر والوں کے بوٹ پالش کرتا، بازار سے اشیائے خورد و نوش بھی خرید لاتا۔ کپڑے دھونے میں مدد کرتا اور ساتھ ہی اپنے کپڑے بھی دھو لیتا۔ گھر میں جھاڑ پونچھ بھی وہی کرتا تھا۔ کچن میں بھی مدد کر دیتا۔ اسے اخلاقیات کا درس کڑے انداز میں ملا تھا۔ بچے کی خوراک سے کچھ چرا لیتا تو اسے پورا دن فاقہ برداشت کرنا پڑتا۔ سردیوں میں ہیٹر کے قریب چلا جاتا تو شام کچھ گھنٹے سردی میں باہر کھڑا رہتا۔ چارپائی پر لیٹ جاتا تو کمرے سے قالین اٹھا دیا جاتا اور اسے رات ننگے فرش پر گزارنا پڑتی۔ وہ بچے کو کھلونوں سے کھلا سکتا تھا، خود ان سے نہیں کھیل سکتا تھا۔ اس کے طعام کے لوازمات اور برتن بھی علیحدہ تھے۔

اہل خانہ عجائب کی ملازمت پر رشک کرتے تھے۔ اس کا والد عین یکم تاریخ کو ہیڈ ماسٹر کے گھر پہنچ جاتا اور بیٹے کی تنخواہ وصول پا لیتا۔ اس طرح عجائب نے حقوق اور فرائض میں توازن بھی سیکھ لیا۔ وہ ان مراعات پر قانع تھا، جو اسے دکھائی نہیں دیتی تھیں۔

عجائب نے بچپن ہی سے اپنی اوقات میں رہنا سیکھ لیا تھا جس کے باعث اس کا لڑکپن بھی ہیڈ ماسٹر کے خاندان میں گزرا، جہاں اس کے رویوں کی تطہیر جاری رہی۔ یہ ایسا دور تھا جب اسے مانگنے سے اجتناب باور کرایا گیا اور بن مانگے باورچی اور گھریلو نوکر کا بیشتر کام سکھا دیا گیا۔ اب وہ سلگتے ہوئے کوئلے بھی ہاتھوں کی مدد سے اٹھا لیا کرتا تھا، پھر پھرتی دکھاتے ہوئے گرم پکتی ہنڈیا پر رکھ دیا کرتا تھا۔ جب یہ کار ممکن تھا تو کچن میں چمٹا فوری خرید کرنے کی کیا حاجت تھی۔ یہ تمام تربیتی عمل عجائب پر بڑا احسان گردانا جاتا تھا، جس کے باعث اس کا عوضانہ انتہائی محدود رکھا گیا تھا۔ جو تھا وہ بھی اس کے خاندان کی نذر ہوتا رہا، جس نے معصوم سے کبھی یہ تک نہ پوچھا کہ اس کے پاؤں اکثر ننگے کیوں رہتے تھے؟

"میں نے اپنے جیون میں کبھی کوئی چیز نئی حالت میں استعمال نہیں کی"۔ ایک روز عجائب نے معصومانہ انداز میں والد سے کہا جس کا فوری جواب پا کر اس نے آئندہ کوئی تقاضا نہ کرنے کی قسم کھا لی۔ اس نوع کے جوابی رویوں نے اسے تہذیب پوری طرح سکھا دی تھی اور اب وہ اتنا مہذب ہو چکا تھا کہ تھپڑ کھا کر بھی اف نہیں کرتا تھا۔ طاقت کے خداؤں کی حکم عدولی کفر سمجھتا تھا۔ مالکوں کے فربہ بھوکے کتے کو کھا جا دیئے بغیر خود اپنا کھانا نہیں کھاتا تھا اور بچے کچھے سافٹ ڈرنک نالی میں گرا دیتا تھا کیونکہ اسے صرف سادہ پانی پینے کی اجازت تھی۔ روزمرہ امور میں کبھی غفلت کے نتائج نے اسے سچ بیانی پر پختہ کر دیا تھا۔

وہ یہ بھی سیکھ چکا تھا کہ سکون آور نوع کے مشروب کب اور کن مہمانوں کو پیش کیے جاتے تھے۔ عورتیں اگر مانگیں تو ان کے لئے کون سے مشروبات مخصوص سمجھے جاتے تھے اور اگر وہ یہ پی کر مدہوش ہو جائیں تو ان کے لباس اور زیورات کی حفاظت کیونکر ممکن بنائی جا سکتی تھی۔ سچ تو یہ تھا کہ اسے اپنا یوں مہذب ہونا کبھی برا بھی نہیں لگا تھا، نہ ہی اس نے اس تربیت پر کبھی کوئی فخر محسوس کیا تھا۔

"اہل خانہ گھر پر موجود نہیں"۔ اس سے یہ جھوٹ بلوایا جاتا تو وہ خوشی سے بول دیتا تھا۔ گویا اس کا گناہ و ثواب بھی

معاشی ناخداؤں سے منسلک ہوگیا تھا۔

اس کی زیست میں آزادی اس دم آئی جب اس کے والد کا انتقال ہوا۔ سانحے پر اسے غم ضرور ہوا مگر وہ یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ بطور اولاد اپنے فرائض نبھا دینے پر قدرت کا شکر ادا کرے یا پھر اپنی آزادی پر نازاں ہو جائے۔

اس نے دن چپ سادھے گھر کے ایک کونے میں گزار دیا۔ پھر مطمئن سا ہوگیا کیونکہ وہ اپنی ماں کو بھی قید سے رہا سمجھنے لگا تھا۔ اس کے نزدیک گھرانہ اب بہتر فیصلے کر سکتا تھا۔ اس نے ہیڈ ماسٹر کا گھر چھوڑ دیا، ماں کو بڑے بھائی کے حوالے کیا اور خود قریبی شہر چلا گیا۔ اس ہجرت کا فائدہ اسے یہ ہوا کہ اس کی ملازمت بہتر ہوگئی۔ اسے ایک تاجر کے ہاں بہتر تنخواہ پر باورچی کی ذمہ داریاں مل گئیں۔ نئے ماحول میں سہولیات بھی بہتر تھیں۔

عجائب سے میری ملاقات اپنے تاجر دوست مرزا کے گھر ہوئی۔ اس دور میں وہ ایڈیٹ کے رتبے پر ترقی پا چکا تھا۔ مرزا خوش مزاج شخص تھا، جو اپنا ہر غم سگریٹ کے مرغولوں میں اڑا دینے کا عادی تھا۔ اس کا سارا گھرانہ اسی ڈھب کا تھا۔ ان کے ہاں ہر دم قہقہے برسا کرتے تھے۔ اس گھر میں خوشحالی بھی اپنا احساس دلاتی تھی۔ عجائب کو یہ ماحول بڑا اچھا لگا تھا۔ بہتر کارکردگی پر اسے وہاں شاباش بھی مل جاتی تھی، جو اس کے لئے بہتر تجربہ تھا۔ اس نے اس گھرانے میں اپنا مقام بنا لیا تھا۔ شہر میں آ کر وہ کچھ زیادہ ہی سیکھ رہا تھا۔

گھر میں مرزا کے علاوہ چار دیگر نفوس رہا کرتے تھے، ان کی بیوی اور تین بیٹیاں، لڑکیاں جتنی ذہین تھیں اتنی شریر بھی تھیں۔ شر پسند وہ بالکل نہیں تھیں مگر ان کے مقابل پورا اترنا جان جوکھوں کا کام تھا۔ محفل میں بھی اپنی ماں کی کنی کترنے لگتیں۔ کہیں ماں جھڑک دیتی تو فتویٰ صادر کر دیتیں کہ "امی، خدا کے حضور توبہ کرلو، تم نے معصوم دلوں پر تشدد کر دیا ہے، فوراً استغفار کرو"۔ اپنے ابا سے البتہ کسی حد تک ڈرتی تھیں۔ ان تمام کے گلوں میں طالب علمی کے طوق پرانے ہو چکے تھے۔ اب والدین ان کے لئے مناسب گھرانوں کی فکر کرنے لگے تھے۔

میں مرزا کے ہاں پہنچا تو صبح دوپہر میں ڈھل چکی تھی۔ اتوار کا روز تھا اور برنچ ٹائم۔ مجھے دیکھا تو تینوں پریاں میرے گرد جمع ہوگئیں۔ پھر جلد ہی بے تکلفی سے تکلفات میں پڑ گئیں۔

"ایڈیٹ! فوراً یہاں آؤ"۔ بڑی صاحبزادی صاعقہ نے شستہ زبان میں نوکر کو پکارا۔ چند ہی لمحوں میں ایک نوجوان تیز قدموں سے چلتا ہوا کمرے میں وارد ہوا۔ بطور مہمان وہاں پا کر اس نے مجھے سلام کیا۔

اس روز میں نے عجائب کو پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ گٹھے ہوئے جسم کا نوجوان تھا، خوبرو خدوخال پہاڑی علاقوں کے افراد جیسے تھے۔ چہرہ بیضوی اور رنگ صاف تھا۔ آنکھیں موٹی تھیں، مگر ان میں ذہانت کی چمک جہالت کے باعث ماند پڑ گئی تھی۔ چہرہ بالوں سے معدوم تھا مگر گھنگھریالی زلفوں کا ٹوکرہ اس کے سر پر سجا ہوا تھا جس میں کنگھی فقط بحالت مجبوری کی جا سکتی تھی۔ اس کی مجموعی جھلک ادھورے ہونقوں جیسی تھی، جنہیں سدھارنے کی کوشش کی گئی ہو۔ پھرتیلا تھا، ہر دم حکم ماننے کو تیار دکھتا تھا۔

"ایڈیٹ! فوراً کچن میں جاؤ اور عمدہ سا ناشتہ بناؤ۔ دیکھو، انڈہ صحیح طرح براؤن کرنا اور زردی بالکل نہ ٹوٹنے پائے اور ہاں، ٹوسٹ پر مکھن چپکا ہوا نظر نہیں آنا چاہئے۔ چائے سپرٹ لانا۔ تم شاید انکل کو نہیں جانتے، یہ صرف ذائقے کے لئے کھانا کھاتے ہیں، بھوک مٹانے کے نہیں"۔ منجھلی عائشہ بولی۔ "بدمزہ ناشتہ چھوڑ کر یہ ٹیبل پر سے اٹھ جائیں گے"۔ چھوٹی فائقہ نے بات آگے بڑھائی اور دلآویز مسکراہٹ کے ساتھ گفتگو مکمل کر دی۔

ہدایات سن کر عجائب نے آنکھیں جھپکائیں، پھر جنبش سے سر تسلیم خم کیا اور سرعت سے قدم اٹھاتا ہوا کچن کی طرف چلا گیا۔ لگا کہ وہ سوچتا کم تھا مگر ہدایات پر عمل کرنا جانتا تھا۔ اس نے ناشتہ واقعی بہت عمدہ بنایا تھا۔

''ایڈیٹ! ڈرائیور سے کہنا کہ آج اسے میرے سلے ہوئے کپڑے درزی سے واپس لانے ہیں''۔ صاعقہ نے پھر بجلی گرائی۔

''اور ہاں، ایڈیٹ! تم بھی ڈرائیور کے ساتھ چلے جانا اور واپسی پر بیکری سے چائے کے لوازمات لے آنا۔ وہی چیزیں لانا جو مجھے پسند ہیں۔ انکل لنچ کے بعد سہ پہر چائے ہمارے ساتھ پئیں گے''۔ فائقہ نے ہلکے پھلکے لہجے میں حکم صادر کیا، اٹھلائی، پھر میری جانب دیکھ کر مسکرائی۔

''لنچ میں خود تیار کروں گی۔ آج تم باہر کے کام کر لو''۔ عائشہ گفتگو کے آخری بولی۔ تینوں نے رسماً ایک دوسرے کی طرف دیکھا، پھر آنکھوں ہی آنکھوں میں باہمی فیصلوں کو حتمی صورت دے دی۔ وہ بھی طے کر لیا جو زبانوں سے نہیں کہا تھا۔ عجائب نے کچھ احکامات مسز مرزا سے لئے اور ڈرائیور کے ساتھ باہر نکل گیا۔ میں مرزا کے ساتھ خوش گپیاں کرتا رہا۔

سہ پہر کے بعد میں گھر کی اوپری منزل پر چلا گیا تاکہ آرام کر سکوں۔ لباس تبدیل کرنے کے بعد میں پلنگ کے دبیز گدے پر لیٹ گیا اور آنکھیں موند لیں۔ گزرے ہوئے دن کے واقعات میرے ذہن میں گردش کرنے لگے۔ میں انسان اور اس سے وابستہ معاشی گورکھ دھندوں پر سوچتا رہا۔ پھر یکایک قریبی کمرے سے ایک خوبصورت مردانہ آواز ابھرنے لگی۔ کوئی گا رہا تھا اور نغمہ سرائی کے سنگ شاید گھر میں صفائی بھی نمٹا رہا تھا۔ سُر بہت نشیلی تھی، میں مترنم آواز میں کھو کر رہ گیا۔

اپنوں میں رہے یا غیروں میں
گھنگھروؤں کی جگہ تو ہے پیروں میں

پھر کیسا گلہ جگ سے جو ملا
سہتا ہی رہا ہوں میں
گھنگھرو کی طرح......

میں بے ساختہ کمرے سے نکلا اور آواز کے تعاقب میں چل پڑا۔ میرا اندازہ درست نکال۔ عجائب گردو نواح سے بے خبر اپنی دھن میں گا رہا تھا۔ شاید یہ اس کا لاشعوری معمول تھا، یا پھر شعوری۔

مجھے قریب پا کر وہ ٹھٹک گیا۔ اس کی نوا گلے میں پھنسی اور وہیں دب کر رہ گئی۔ اگلے لمحے وہ مسکرا دیا، قدرے جھجکا، پھر ذرا زور سے ہنس پڑا۔ اچانک گھر کی نچلی منزل سے ایک نسوانی صدا ابھری۔

کبھی ٹوٹ گیا، کبھی توڑا گیا
سو بار مجھے پھر جوڑا گیا
یعنی ٹوٹ ٹوٹ کے اور مٹ مٹ کے
بنتا ہی رہا ہوں مَیں
گھنگھرو کی طرح......

فائقہ خوبصورت آواز میں گاتا آگے بڑھا رہی تھی۔

''ایڈٹ!'' نیچے سے کسی کمرے سے ایک اونچی پکار سنائی دی۔

عجائب نے کام کاج چھوڑا اور کسی روبوٹ کی طرح فوراً نچلی منزل کی طرف سیڑھیاں پھلانگنے لگا۔ میں نے لمحہ بھر کے لئے اسے روکا، پھر پوچھا۔

''یہ ایڈیٹ کیا ہوتا ہے؟''

''شاید گھریلو ملازم کو کہتے ہیں''۔ اس نے سرسری سا جواب دیا اور آگے بڑھ گیا۔

میں مرزا کے شہر میں کچھ ہی عرصہ قبل آیا تھا، اب اکثر اس کے گھر جانے لگا۔ عجائب سے بھی مراسم بڑھنے لگے۔ وہ بے تکلفی سے میرے ساتھ باتیں کیا کرتا تھا۔ بھی میرے لئے خصوصاً کھانا بھی بناتا۔

مجھے اس کی ایک ادا ہمیشہ پسند رہی۔ وہ کام کاج کے دوران مسلسل گایا کرتا تھا لیکن بس ایک ہی نغمہ۔ یہ نغمہ اس نے اتنی بار گایا تھا کہ اب اس کی زندگی کا حصہ بن چکا تھا۔ اس کی نواؤں میں مٹھاس موجود رہتی تھی لیکن انداز میں سوز کبھی بڑھ جاتا اور کبھی معدوم ہو جاتا، دوسری صورت میں طنز کا پہلو اجاگر ہو جاتا، مگر اس کے کارِ حیات کا معیار عموماً یکساں رہتا تھا۔

گزرتے وقت کے ساتھ مرزا کے گھر میں بے رونقی بڑھتی گئی۔ اب وہاں درو دیوار میں قہقہے نہیں گونجتے تھے، بس اک اداسی سی چھا گئی تھی۔ اس کی دو بیٹیوں کی شادیاں ہو گئی تھیں اور خود میاں بیوی بھی ڈھلتی عمروں کا شکار لگتے تھے۔

ایک روز مرزا کے گھر قیامت صغریٰ برپا ہو گئی۔ معلوم ہوا کہ چھوٹی بیٹی فائقہ لاپتہ ہو گئی ہے۔ میں مرزا کے ہاں پہنچا تو حالات سے آگاہ ہوا۔ مرزا اور بیگم ایک ہفتے کے لئے کراچی گئے تھے۔ ان کی خاندانی جائیداد کے چند مسائل تھے۔ واپس لوٹے تو پتہ چلا کہ ان کی بیٹی اسی روز گھر سے چلی گئی تھی، جس روز انہوں نے خود یہ شہر چھوڑا تھا۔ اس دوران گھر میں صرف عجائب موجود رہا تھا جو نہیں جانتا تھا کہ فائقہ کہاں چلی گئی اور کیوں گئی؟ معلوم ہوا کہ ڈرائیور اور عجائب، دونوں پولیس کی حراست میں تھے۔ خیال اور خدشات میرے ذہن میں ابھرے تو وجود لرز کر رہ گیا۔

میں پولیس سٹیشن گیا تو وہاں ڈرائیور اور عجائب دونوں موجود تھے اور روایتی پولیس تشدد کا شکار ہو چکے تھے۔ دونوں انتہائی خوفزدہ نظر آتے تھے۔ پولیس کو عجائب نے وہ باتیں بتا دی تھیں جو مرزا سے چھپائی تھیں۔ یہ پہلو اسے پولیس کی نظروں میں مشکوک بنا رہا تھا۔ اس نے پولیس کو بتایا کہ میں مرزا خاندان کی ہمیشہ عزت کرتا ہوں اور فائقہ خصوصاً مجھے اچھی لگتی تھی۔ اگر میری اپنی کوئی

ن ہوتی تو میں اسے اتنی ہی عزت دیتا جتنی کہ فائقہ کو دیا کرتا تھا۔ بھرے گھر میں وہ میرا سب سے زیادہ دھیان رکھا کرتی تھی وہی تھی جو مجھے نوع انسانی میں شمار کرتی تھی۔

وہ انتہائی خوبرو تھی۔ خوبصورتی اور جوانی دیگر اوصاف کے ساتھ یکجا ہو جائیں تو والدین کو اولاد کا دھیان بساط سے بڑھ کر رکھنا چاہئے۔ فائقہ کے والدین اس فرض میں بری طرح ناکام رہے۔

بہنوں کی شادیوں کے بعد فائقہ کسی نوجوان کو دل دے بیٹھی تھی جورات کے پچھلے پہر اسے ملنے آیا کرتا تھا۔ دونوں کوٹھی کے کنج تنہا میں ملا کرتے تھے۔ بعدازاں وہ نوجوان فائقہ کے کمرے میں بھی چلا جاتا تھا اور دونوں تقریباً فجر تک تنہا رہتے تھے۔ میں نے فائقہ سے بات کی تھی اور اسے والدین کی عزت کا حوالہ بھی دیا تھا۔ یہ بھی بتایا تھا کہ اس دھوکہ دہی کا نتیجہ اچھا نہیں نکلے گا مگر وہ باز نہ آئی۔ میں نے کئی بار اپنے مالکوں کو اشارے بھی دیئے۔ بیگم مرزا سے کہا کہ وہ رات بیٹی کا خیال رکھا کریں۔ وہ تنہائی محسوس کرتی ہے اور دیر گئے تک لان میں گھومتی رہتی ہے۔ اس سے زیادہ مداخلت اس لئے نہ کر سکا کہ میں اپنی حیثیت جانتا تھا۔ پولیس عجائب سے ملزم لڑکے کے بارے تفاصیل جاننا چاہتی تھی مگر اس کا اتہ پتہ وہ نہ بتا سکا۔ وہ مذکورہ لڑکے کو زیادہ نہیں جانتا تھا۔

چند روز بعد فائقہ گھر پہنچ گئی۔ بیمار اور لاغر، لوٹتے ہی اس نے اپنے حق میں جذباتی فضا ہموار کر لی، پھر اپنا دوش بھی مان لیا۔ کہا کہ ”ایک مصیبت میرے وجود میں پلنے لگی تھی، اس سے چھٹکارا پانا ضروری تھا۔ بوائے فرینڈ تو دھوکہ باز نکلا مگر مشکل وقت میں مدد کرنے پر آمادہ تھا۔ اندازہ تھا کہ آپ کے شہر لوٹ آنے سے پہلے میں تندرست ہو کر گھر پہنچ جاؤں گی لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا۔ طبی پیچیدگیاں میری توقع سے بڑھ گئیں اور یوں وقت بھی زیادہ لگا۔ مجھے اپنا بدن اب بھی زخموں سے چور محسوس ہوتا ہے لیکن چونکہ میں نے گھر والوں کے اعتماد کو دھوکہ دیا ہے، اس لئے اب ہر قسم کی سزا بھگتنے کے لئے تیار ہوں۔

قید وصعوبت کے اس واقعے کے بعد ڈرائیور تو اپنی ملازمت پر واپس آ گیا مگر عجائب نے نوکری چھوڑ دی۔ پولیس کی حراست میں وہ بے پناہ ذہنی اور جسمانی اذیت سے گزرا تھا اور مرزا خاندان کے لئے اس کے دل میں کدورت پیدا ہو چکی تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ اسے وفا اور نیک دلی کی کڑی سزا ملی تھی۔ اس واقعے کے بعد میرا رابطہ بھی عجائب سے ٹوٹ گیا۔ آنکھ اوجھل، پہاڑ اوجھل، کے مصداق۔

ظاہر ہے کہ میں نے ہی اسے فراموش کر دیا۔ وقت اپنے ڈھب سے گزرتا رہا۔

موسم بدلا تو میں نے عشاء کی نماز مسجد میں پڑھنا شروع کر دی۔ اس ناطے بھی گردونواح کے لوگوں سے تعارف ہو جاتا تھا اور رفقاء سے تبادلہ خیال کا پہلو بھی نکل آتا تھا۔ ایک شام میں عجائب کو مسجد میں پا کر ششدر رہ گیا۔ وہ اچانک میرے سامنے چلا آیا اور تپاک سے ملا۔ میں اسے اپنے ساتھ گھر لے گیا اور بہت ساری باتیں کیں، اس کی بھی سنیں۔

وہ اپنے پرانے دوست ڈرائیور کے ساتھ قریبی کچی آبادی میں رہ رہا تھا اور کسی ہوٹل میں بطور باورچی کام کرتا تھا۔ اس کو مناسب پیسے مل رہے تھے۔ گفتگو کے دوران اس نے مرزا فیملی کے بارے میں چند پوشیدہ پہلو بھی آشکار کئے۔ خبر ملی کہ فائقہ کی شادی ہونے والی تھی، کسی خاندانی دوست کی وساطت سے۔ لڑکا اپنے خاندان کے ہمراہ کسی یورپی ملک میں رہائش پذیر تھا۔ یہ خاندان لڑکی دیکھنے مرزا کے ہاں آیا تھا۔ ڈرائیور نے لڑکے کو عجائب سے بھی ملایا تھا۔ لڑکا فائقہ کے بارے میں تفصیلی

معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ بقول عجائب، اس نے مذکورہ لڑکے کو باور کرایا تھا کہ فائقہ ایک بہترین رفیقہ ثابت ہو سکتی ہے۔ رخصت ہوتے وقت اس نے لڑکے کو وہ پانچ سو روپے بھی واپس کر دیئے تھے جو اس نے عجائب کو اندرونی کہانیاں آشکار کرنے کے لئے دیئے تھے۔

''رشتے بنانے کا عمل رشتے مٹانے سے افضل ہوتا ہے''۔ عجائب نے اپنے رویے کی توجیہہ پیش کی۔ ''غلطیاں تو سبھی کرتے ہیں''۔ اس نے زور دے کر کہا۔

عجائب نے مجھے بھی اپنے گھر بلایا۔ برصغیر میں خصوصاً اگر کسی کو پذیرائی دینی ہو تو اس کی دعوت کی جاتی ہے، خواہ اس سلسلے میں ادھار ہی کیوں نہ لینا پڑے۔ عجائب کھانے اسی ہوٹل سے اٹھا لایا تھا جہاں وہ کام کرتا تھا۔ اس قسم کی عیاشی اس کے بس میں آ چکی تھی۔ کھانے اور خوش گپیوں کے دوران ڈرائیور بھی ہمارے ساتھ موجود رہا۔ بعد میں عجائب نے میری فرمائش پر اپنا اکلوتا پسندیدہ گانا سنایا۔

مجھے احساس ہوا کہ گانے کی آواز کھڑکی کے راستے گھر کے ہر کونے میں جا رہی تھی۔ مجھے برابر والے کمرے میں جواں سال لڑکی کی موجودگی جانچنے میں بھی دقت پیش نہ آئی۔ مجھے یقین تھا کہ عجائب کی مترنم صداؤں نے لڑکی کو بے چین کر دیا تھا۔

''میری بہن بھی اسی گھر میں رہتی ہے''۔ ڈرائیور نے مجھے بتایا۔ میں جانتا تھا کہ وہ بھی عجائب کی طرح غیر شادی شدہ تھا اور اپنی بہن کا کفیل بھی۔

''میری بہنا نہیں چاہتی کہ عجائب یہ گانا گنگنایا کرے''۔ ڈرائیور نے کہا۔

''کیوں؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''اس کی منطق بھی عجیب ہے''۔ ڈرائیور بڑبڑایا۔ ''کہتی ہے کہ عجائب کوئی قبرستان میں کھلا ہوا پھول نہیں ہے، وہ تو گلشن میں مہکتا ہوا تازہ گلاب ہے''۔ اس کی معنی خیز بات پر میں سوچ میں پڑ گیا۔

واپسی کے لئے اٹھا تو نظر عجائب کی رہائش گاہ پر پڑی، میں ٹھٹک کر رہ گیا۔ ''عجائب! تمہارا کچا پکا مکان بہت ہی بوسیدہ ہے، خصوصاً چھتیں دیکھ کر تو مجھے ہول آتا ہے۔ آگے بارشوں کا موسم ہے کرائے پر کوئی دوسری پناہ گاہ ڈھونڈ لو، یہاں نہ رہو۔ خدانخواستہ......''

''ہم غریبوں کے گھر صاحب! ہمارے دلوں کی طرح ہوتے ہیں، ٹوٹ جائیں، لیکن پھر بھی نہیں ٹوٹتے''۔ ڈرائیور نے میری بات کاٹ کر جواب دیا۔ پھر نیا گھر تلاش کرنے کی ہامی بھی بھر لی۔

چند روز بعد عجائب میرے گھر آیا۔ لگا، زمانے نے اسے بہت کچھ سکھا دیا تھا، گو عمر کے لحاظ سے اس نے تیسری دہائی کے کم ہی سال طے کئے ہوں گے۔ کہنے لگا کہ ''میں زندگی کے دوراہے پر کھڑا ہوں۔ ڈرائیور کی بہن مجھ کم تر پر دل ہار بیٹھی ہے، کہتی ہے کہ وہ میرے بنا نہیں جی سکے گی۔ میں اس بات پر حیران ہوں اور اسی قدر پریشان بھی۔ ڈرائیور میرا محسن ہے، اس نے مجھے اپنے گھر پناہ دے رکھی ہے۔ میں اسی گھر میں نقب نہیں لگا سکتا جو میری آماجگاہ ہے اور جہاں مجھے عزت ملی ہے۔ آپ کوئی راہ سجھائیں''۔ اس نے میرے سامنے دل کھول کر رکھ دیا۔

''دیکھو عجائب!'' میں نے اسے سمجھایا۔ ''رشتہ داری میں منسلک ہو جانا ایک احسن قدم ہے اور حیات کی ضرورت ہے۔ اگر لڑکی تمہیں بطور رفیقہ ناپسند نہیں تو معاملہ میرے حوالے کر دو، میں ڈرائیور سے بات کر لوں گا''۔ میں نے اسے یقین دلایا۔

وہ خاموش رہا، نیم رضامند، پھر اچانک بول پڑا۔ اس بار اس کی گفتگو کا موضوع بالکل مختلف تھا۔ کہنے لگا۔ ''سر! آپ پڑھے لکھے ہیں مگر میں نہیں پڑھ سکا۔ ایک معمہ بہر حال سمجھنا چاہتا ہوں۔ لوگ مجھے ایڈیٹ کیوں

کہتے ہیں؟ کیا آپ مجھے اس کا مطلب بتا سکیں گے؟ اگر برا نہ مانیں تو۔ ہوٹل میں ہر شخص مجھے اسی نام سے پکارتا ہے۔ اجنبی لوگ اس پکار پر بے ساختہ ہنس پڑتے ہیں، کبھی میرا منہ دیکھنے لگتے ہیں۔ ایک دوسرے کو بھی معنی خیز نظروں سے تکتے ہیں۔ بعض مائیں بچوں کو منع کرتی ہیں کہ وہ مجھے اس طرح نہ پکاریں۔ مجھے بتائیں کہ اس لفظ کی حقیقت کیا ہے؟" عجائب نے مجھے مشکل میں ڈال دیا۔ اس کے سوال پر مجھے دلی دکھ بھی ہوا۔ میں سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ اسے کیا جواب دوں؟ سچ بتاتا تو اس کا دل ٹوٹ جاتا۔ کچھ نہ بتاتا تو وہ کسی اور سے دریافت کرتا۔ آخر میں نے اسے ٹال دینا مناسب سمجھا۔

"بہت ہی سادہ انسان کو اس طرح کے لقب مل جاتے ہیں"۔ میں نے اسے سمجھایا۔ وہ تھوڑی دیر چپ رہا پھر بولا۔

"تب تو لوگ مجھے ٹھیک ہی پکارتے ہیں"۔

"پہچان کے منفی حوالے کبھی زندگی کا روگ بن جاتے ہیں اور تاحیات جان نہیں چھوڑتے"۔ میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

کچھ دنوں کے لئے مجھے شہر سے باہر جانا پڑا۔ واپس لوٹا تو شدید بارشیں شروع ہو گئیں۔ پھر پتہ چلا کہ نشیبی علاقوں میں سیلاب آ گیا ہے۔ میں نے عجائب کی طرف جانے کی کوشش کی مگر کچی آبادیوں کی جانب جانے والے اکثر راستے بند تھے۔

ایک صبح ڈرائیور نے میرے سیل فون پر پیغام دیا کہ مجھے فوراً اس کے گھر پہنچنا چاہئے۔ اس کی آواز میں پریشانی نظر آتی تھی۔ مجھے معاملہ کچھ گمبھیر لگا۔ کسی جاننے والے کو ساتھ لیا اور پیدل پانی میں راہیں کھوجتا ہوا منزل کی طرف بڑھا۔ کچھ سڑکوں پر سے پانی اتر چکا تھا مگر نشیبی علاقوں میں ابھی تک جمع تھا، کہیں کم لیکن اکثر جگہ زیادہ۔ عجائب کے علاقے میں پہنچا تو دل بیٹھ گیا۔ چھٹی حس اچھی خبریں نہیں سنا رہی تھی۔ دور سے دیکھا تو عجائب کے گھر بستی کے لوگ جمع تھے۔ آدھا مکان ڈھے چکا تھا۔ لوگ ملبے پر کھڑے حواس باختہ نظر آتے تھے۔ میں قریب پہنچا تو ماحول ماتم کناں دیکھا۔

عجائب کا لاشہ سفید کھدر میں لپٹا ہوا پڑا تھا۔ اس کا جسم زخمی دکھتا تھا۔ رات بوسیدہ کمرے کی چھت اس پر گر پڑی تھی۔ بستی کے لوگوں نے بارش میں اس کی لاش ملبے سے نکالی تھی۔ میں نے عجائب کا چہرہ دیکھا تو اس پر غم کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ ایسا ہی المناک ابر مجھے آسمانوں پر بھی دکھائی دیا جو بار بار رعد کے شعلوں میں سرخ رُو ہو جاتا تھا اور اشک بہانے لگتا۔ وہ دھرتی پر ٹکرانے کے لئے بے تاب نظر آتا تھا۔

پھر ہواؤں اور گھٹاؤں میں طوفانی صدائیں ابھرنے لگیں۔ برستا ہوا پانی اپنے کھیلوں میں الجھنے لگا۔ تا بہ فلک سیلِ رواں تھا جو دھرتی پر ٹوٹ پڑا تھا۔ عجائب کا لاشہ پانی میں بھیگ چکا تھا۔ بستی والے اس کے لئے پناہ گاہ ڈھونڈ رہے تھے۔ برکھا کے ساتھ کئی آنکھوں سے آنسو ابل پڑے تھے۔ عجائب کا بھائی ماں کو لے کر پہنچ گیا تھا۔ طوفانی شور میں مجھے عجائب کی صدا ابھرتی ہوئی سنائی دی۔ وہ گا رہا تھا، میرے قریب کہیں۔ اس کی نوا طوفانی ہواؤں اور گھٹاؤں میں مدغم ہونے لگی تھی۔ لگا کہ ہر طرف سے ایک ہی صدا ابھر رہی تھی، چیخوں میں اور سسکیوں کے ساتھ، مسلسل اور درد انگیز کوئی کہہ رہا تھا۔

اپنوں میں رہے یا غیروں میں
گھنگھرو کی جگہ تو ہے پیروں میں
پھر کیسا گلہ، جگ سے جو ملا
سہتا ہی رہا ہوں میں
گھنگھرو کی طرح......

طوفانِ بادوباراں گھنگھرو باندھ کر ناچ رہا تھا۔

□❀□

لالہ رام دیال

ایک مہترانی کا قصہ جس نے لالہ رام دیال جیسے
ساہوکار کی بیٹی کا رشتہ مانگنے کی جرأت کر ڈالی

☆ محمد نذیر ملک

ہم نے جب اپنے شعور کی آنکھ کھولی تو ہندو ہمارے گاؤں سے جا چکے تھے لیکن ان کی اپنے پیچھے چھوڑی جانے والی یادیں ابھی تازہ تھیں۔

آخر وہ لوگ بھی نسلوں سے اس گاؤں میں آباد رہے تھے، ان کی شادی غمی میں مسلمان شریک ہوتے اور وہ بھی مسلمانوں کے ہر دکھ سکھ کے برابر کے ساجھے دار تھے۔ ہندو تجارت پیشہ تھے اور ساہوکارا کرتے تھے جنہیں بنیے بھی کہا جاتا۔ وہی چمڑی جائے دمڑی نہ جائے والی بات تھی۔ ہندو اپنے سے بڑے کو لالہ کہہ کر پکارتے۔ ادھر مسلمان بھی انہیں لالہ ہی کہتے۔ انہی میں ایک لالہ رام دیال تھے۔ ساہوکارا کرتے تھے اور سودی لین دین ان کا پیشہ تھا اور سب سے بڑا روپیہ پر پکا یقین رکھتے تھے۔ وہ نہایت میٹھی زبان میں گفتگو کرتے۔ منہ سے گویا پھول جھڑتے اور مخاطب کا دل موہ لینے میں انہیں ملکہ حاصل تھا۔

مسلمان بچوں کو میرے راجہ اور بڑوں کو مہاراج کہہ کر مخاطب کرتے۔ لالہ رام دیال کی مالی حیثیت مستحکم تھی۔ وہ اپنی برادری میں کافی نمایاں تھے۔ ان کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔

گھر کی صفائی ستھرائی کے لئے مہترانی رکھی ہوئی تھی جو کافی نچلی ذات کی تھی۔ ہندو ذات پات کا بہت پابند ہے۔ یہ ذات پات کو اپنے دھرم پر بھی ترجیح دیتا ہے۔ ایک روز لالہ رام دیال گھر پر موجود نہ تھے۔ گھر میں ان کا بڑا بیٹا دھرم چند اور دونوں بیٹیاں لکشمی اور مایہ وتی تھیں۔

مہترانی آئی اور آ کر گھر کی صفائی ستھرائی میں لگ گئی۔ کچھ دیر بعد برآمدے میں آ کر ایک جگہ بیٹھ گئی اور لالہ رام دیال کے بڑے بیٹے دھرم چند سے مخاطب ہوئی۔

"دھرم بیٹے آپ سے ایک ضروری کام تھا"۔

دھرم چند نے اپنی کرسی مہترانی کے قریب گھسیٹ لی اور بولا۔ "کہو مہترانی کیا کام ہے؟"

مہترانی کہنے لگی۔ "بیٹے وہ کیا ہے کہ اپنا بیٹا سکھ دیو ہے ناں"۔

دھرم بولا۔ "ہاں ہے"۔

"بھگوان کی دیا ہے وہ اب کھانے کمانے لگا ہے۔

چاہتی ہوں کہ اس کے لئے کوئی اچھا سا ور مل جائے"۔

دھرم بولا۔ "یہ تو بڑی اچھی بات ہے مہترانی!"

بولی۔ "تو پھر کیوں نہ آپ کے گھر سے اس کی شروعات کروں دھرم بیٹے"۔

"میں سمجھا نہیں مہترانی!" دھرم نے حیرانگی کے عالم میں پوچھا۔

بولی۔ "میرا مطلب آپ کی چھوٹی بہن مایہ وتی سے ہے کیونکہ بڑی بیٹی لکشمی کی تو خیر سے سگائی ہو چکی ہے"۔

دھرم کو یوں لگا جیسے کسی نے اس کے جسم میں سوئی چبھو دی ہو۔ وہ تڑپ کر رہ گیا لیکن ضبط کر گیا۔

کہنے لگا۔ "تم جاؤ مہترانی! باپو آئیں گے تو ان سے بات کریں گے"۔ وہ چلی گئی شام کو لالہ رام دیال گھر آئے تو بیٹے نے بپتا سنائی اور کہا۔ "مہترانی کی یہ جرأت اس نے تو ہماری بہن کا رشتہ مانگ کر ہماری ناک کاٹ کر رکھ دی ہے۔ اس نے ہماری بہت ہتک کی ہے باپو! میں نے تو بات آپ کے آنے پر ٹال دی لیکن اس کا سدباب ہونا چاہئے تاکہ آئندہ وہ اس طرح کی جرت نہ کر سکے"۔

بیٹے کی بات سن کر لالہ رام دیال سوچ میں پڑ گئے اور کچھ دیر بعد بولے۔ "بیٹے دھرم! یہ بتاؤ کہ جب مہترانی نے تم سے یہ بات کہی تو وہ اس وقت کہاں بیٹھی تھی؟"

دھرم نے اس جگہ کی طرف اشارہ کیا اور بتایا کہ وہاں بیٹھی تھی۔

لالہ رام دیال نے مسکرا کر اپنی مونچھوں کو تاؤ دیا، بولے۔ "اچھا آنے دو اسے"۔

صبح سویرے مہترانی پھر چلی آئی اور حسب معمول اپنے کام میں لگ گئی۔ لالہ رام دیال نے سامنے آ کر مہترانی کو آواز دی اور بیٹے دھرم چند کو بھی بلا لیا۔ خود کرسی پر بیٹھ گئے اور مہترانی کو کہا یہاں بیٹھو۔ مہترانی نیچے زمین پر بیٹھ گئی۔ دھرم بھی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ لالہ رام دیال نے کہا۔

"مہترانی! اب بتاؤ کل تم نے دھرم سے کیا بات کی تھی"۔

بولی۔ "کون سی بات؟ کیا وہی اپنے بیٹے کے لگن والی بات؟"

"اپنے بیٹے سکھ دیو کے لئے مایہ کا ہاتھ مانگنے والی"۔

مہترانی نے ہاتھ جوڑ دیئے، بولی۔ "مہاراج! کبھی مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگتا ہے، کہاں آپ اتنی اونچی جات والے اور کہاں ہم نیچ۔ بھلا میں ایسی جرأت کر سکتی ہوں؟ نہ لالہ جی نہ، میری یہ مجال"۔

کہا۔ "اٹھو کام کرو"۔ مہترانی اٹھ گئی۔

لالہ رام دیال نے مسکرا کر پھر اپنی مونچھیں چھوئیں۔ ادھر دھرم چند حیران و پریشان کہ یہ کیا ہو گیا۔ کل کیا تھا اور آج کیا ہوا؟

"باپو! مجھے کچھ سمجھ نہیں آئی اس کمینی کی بات"۔ اس نے حیران ہو کر کہا۔

لالہ بولے۔ "بیٹے! آؤ بیٹھو میں تمہیں سمجھاتا ہوں۔ لالہ رام دیال اٹھ کر اس جگہ جا کھڑے ہوئے جہاں گزشتہ روز مہترانی بیٹھی تھی اور کہا کل اسی جگہ بیٹھی تھی ناں مہترانی؟" دھرم نے اثبات میں سر ہلایا۔ "اور آج دوسری جگہ بیٹھی ہے"۔

"باپو جگہ بدلنے سے کیا ہوتا ہے؟" دھرم نے حیرت سے پوچھا۔

کہا۔ "بہت کچھ ہوتا ہے، وہی ہوتا ہے جو تم نے آج دیکھا اور سنا۔ کل جب وہاں بیٹھ کر اس نے تم سے بات کی تھی تو اس کے نیچے دولت کی ڈولی گاڑھی ہوئی تھی جو میں نے وہاں چھپا رکھی ہے اور آج اس کی جگہ بدل کر اس کے نیچے سے میں نے لکشمی نکال لی ہے۔ دیکھا م

نے اس دن کل اور آج والی بات میں زمین و آسمان کا فرق نکلا"۔

کہتے ہیں ہندو لکشمی کا پجاری ہے اس کے پاس جب لکشمی (دولت) آتی ہے تو وہ اس کے آگے جھکتا چلا جاتا ہے۔ پہلے اگر ریشم پہنتا تھا تو لکشمی آنے کے بعد کھدر پہننے لگ جاتا ہے۔ وہ اپنی دولت کی نمائش نہیں بلکہ اس کی حفاظت میں لگ جاتا ہے کہ یہ کہیں ضائع نہ ہو جائے۔

ایک ہندو بنیے کی کئی دکانیں تھیں۔ کسی نے پوچھا۔ لالہ جی آپ رات کو سوتے کہاں ہیں؟ لالہ نے سوچا کہ یہ شخص جاننا چاہتا ہے کہ میں کس جگہ سوتا ہوں تاکہ دوسری جگہ جا کر چوری کر لے۔ کہا۔

"اپنا کیا ہے بھائی! یہاں سوئیں، وہاں سوئیں، اوپر سوئیں نیچے سوئیں، سوئیں سوئیں نہ بھی سوئیں"۔

بات لالہ رام دیال کی چل رہی تھی۔ بتاتے ہیں کہ جب لالہ رام دیال کا دہانت (انتقال) ہوا تو ان کی چتا جلانے کے بعد جلی ہوئی ہڈیاں جنہیں پھول کہا جاتا ہے ایک ڈولی میں چن لی گئیں۔ اگر یہ پھول کسی عام آدمی کے ہوتے تو انہیں کہیں بھی کسی قریبی تالاب یا بہتے پانی میں ڈال دیا جاتا۔ چونکہ لالہ جی امیر کبیر شخصیت تھے لہٰذا گھر والوں نے فیصلہ کیا کہ لالہ جی کے پھول گنگا جل لے جا کر بہائے جائیں۔ چنانچہ گھر والوں نے گاؤں کے میراثی کو بلایا اور کہا کہ لالہ کے پھول لے جا کر گنگا میا میں بہا کر آ جاؤ۔

لہٰذا میراثی کو زادِ راہ دے دیا گیا۔ میراثی پھول والی ڈولی لے کر گاؤں سے نکل گیا۔ گاؤں سے گنگا میا کا سر کافی لمبا تھا۔ ریل گاڑی پر کم از کم ایک طرف کے تین چار دن لگتے تھے۔ یوں سمجھیں کہ آنے جانے میں پورا ایک ہفتہ درکار تھا۔ میراثی نے گاؤں سے باہر نکل کر سوچا کہ کون مجھے دیکھ رہا ہے، کسے پتہ چلے گا کہ میں نے پھول کہاں بہائے ہیں۔ چلو یہیں کہیں موج میلہ کرتے ہیں چند دنوں بعد واپس جا کر انہیں کہہ دوں گا کہ میں پھول گنگا بہا آیا ہوں۔

میراثی ایک قریبی شہر چلا گیا اور وہاں جا کر پھول والی ڈول ایک جگہ پھینک دی اور چار روز وہاں خوب اچھا کھاتا پیتا رہا۔ پانچویں روز واپس گاؤں پہنچ گیا اور واپس آ کر لالہ رام دیال کے گھر والوں کو کہا کہ وہ لالہ جی مہاراج کے پھول گنگا بہا آیا ہے۔

ادھر ہندو بہت ہوشیار تھے۔ وہ سمجھ گئے کہ یہ گنگا نہیں گیا بلکہ راستہ سے ہی واپس آ گیا ہے۔ انہوں نے اس کی واپسی کے دن کا حساب لگایا ہوا تھا۔ انہوں نے سوچا کہ اگر اسے ویسے کہا تو یہ بھی ذات کا میراثی ہے مانے گا نہیں، جواب میں کوئی نہ کوئی بات گھڑ لے گا۔ انہوں نے میراثی کو دوسرے روز بلایا اور لالہ رام دیال کے بڑے بیٹے دھرم چند نے کہا۔

"جمان! سورگ باشی پتا جی میرے سپنے میں آئے ہیں، کہہ رہے تھے کہ ہم اپنی منزل پر نہیں پہنچے"۔

ادھر میراثی بہت کائیاں تھا۔ فوراً سمجھ گیا کہ اس سے کیا غلطی ہوئی ہے۔ سوچنے لگا گھر والوں کو اس کی چالاکی کا علم ہو ہی گیا ہے وہ بڑے حسابی کتابی لوگ ہیں اور مجھ سے دنوں کی گنتی میں ضرور بھول ہوگئی ہے۔ میں اب کوئی بھی بہانہ گھڑوں گا تو یہ مانیں گے نہیں، کیوں نہ سچ بول دوں۔

کہنے لگا۔ "دھرم چند مہاراج جی! آپ کے سورگ باشی پتا لالہ رام دیال مہاراج جی کو جہاں میں نے چھوڑا تھا وہاں سے اتنی دور چل کر واپس یہاں آپ کے سپنے میں آنے کی بجائے وہاں سے ذرا دور آگے چلے جاتے تو وہ اپنی منزل پر ضرور پہنچ جاتے"۔

o

میرے ملک کو اس کی اشد ضرورت ہے

میری نظر میں صاحب کمال کی موت ایک ایسا خواب ہے جو ٹوٹتے رہنے کے باوجود نظر سے اوجھل نہیں ہوتا۔ آج مجھے ڈاکٹر عمر علی کی قبر کا پتا نہیں اور میرے ملک کو اس کی اشد ضرورت ہے۔

☆ قاری منصور احمد

ڈاکٹر جس دُکان یا کمرے میں مقیم تھا اس میں ایک طرف تو معمولی سی چارپائی تھی، ایک طرف چھوٹی سی انگیٹھی اور چائے کا بنڈل۔ مٹی کے تیل کی بوتل اور پچکی ہوئی دیاسلائی کی ڈبیا، ایک کرسی اور میز، نیز چھوٹی بڑی بے شمار بوتلیں اور شیشیاں جو اس کی لیبارٹری تھی۔ ڈاکٹر کے پاس پیسہ پائی کچھ نہ تھا لیکن وہ شعور اور دانائی کی دولت سے مالا مال تھا۔ گفتگو اس قدر دلچسپ کہ سنتے تو سنتے ہی رہئے۔ فقرے فقرے میں معلومات کے ذخائر۔ نام اس کا عمر علی خان تھا۔ ایک مدت تک جرمنی میں سائنس کا پروفیسر رہا۔ پاکستان بنا تو حب الوطنی اسے یہاں لے آئی۔ کچھ دنوں وہ سندھ میں کسی اچھے عہدے پر مامور رہا۔ پھر چونکہ وہ نیک انسان تھا اور اس کے یہاں رشوت وغیرہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور اس قسم کا انسان یہاں ہر محکمے کے لئے ناقابل برداشت ہے، اس لئے اسے اس کے عہدے سے الگ کر دیا گیا۔ اس کے بعد اس کی حالت وہی تھی جس کا اوپر ذکر ہوا۔ وہ غیرت مند زندگی بسر کرنے کا عادی تھا۔ ناداری کے شکنجے میں ہونے کے باوجود عزت اور انا کو ہر قیمت پر برقرار رکھتا تھا۔ وہ ہر روز مجھے اپنا اور اپنے فن کا کوئی نہ کوئی کرشمہ ضرور دکھاتا اور میری حیرت کی انتہا نہ رہتی تھی۔

ایک دن اس نے سپرٹ کی بجائے برساتی پانی سے سینٹ (خوشبو) بنایا جو اس قدر پائیدار تھا کہ ایک ہفتے تک میرے کرتے سے خوشبو آتی رہی۔ انہی دنوں پاکستان گورنمنٹ نے دس روپے والا گہرے گلابی رنگ کا نیا نوٹ جاری کیا تھا اور دانہ دار کاغذ کے باعث یہ کہا جاتا تھا کہ یہ جعلی نہیں بن سکتا۔ میں جب ڈاکٹر کے پاس گیا تو نیا نوٹ دکھا کر کہا۔ ”سنا ہے یہ جعلی نہیں بن سکے گا۔“ یہ الفاظ سن کر ڈاکٹر نے ایک ہلکی سی چٹکی نوٹ پر ماری اور بولا۔

”یہ تو تاش کے پتے کی طرح بنے گا۔ کل بنا کر

دکھا دوں گا۔" چنانچہ دوسرے دن اس نے پیراشوٹ پر تین نوٹ چھاپ کر دکھائے اور کہا۔ "یہ لیجیے! یہ کون سی مشکل بات تھی، یہ جرمنی کا نوٹ تو نہیں کہ جعلی نہ بن سکے۔"

میں نے کہا۔ "کیا جرمنی کا نوٹ جعلی نہیں بن سکتا؟ اگر ایسا ہے تو کیوں؟" ڈاکٹر نے ایک پانی جیسی سیال دوا میں کاغذ تر کر کے دھوپ میں رکھ دیا اور خشک ہونے پر اس پر اپنی ربڑ کی مہر لگا دی۔ پھر مجھے حکم دیا کہ ذرا باہر جا کر اس کا ایک فوٹو تو اتروا لائیں۔ میں بازار گیا اور ایک فوٹوگرافر سے فوٹو اتارنے کے لئے کہا۔ (ان دنوں فوٹو سٹیٹ مشین نہ تھی) فوٹوگرافر نے تین بار اس کا فوٹو تو لیا مگر فوٹو نہیں آیا۔ ہر دفعہ پلیٹ کالی ہو جاتی تھی۔ آخر اس نے یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ اس کا فوٹو نہیں آ رہا۔ کاغذ کچھ خراب معلوم ہوتا ہے۔ میں نے ڈاکٹر سے جا کر کہا کہ اس کا تو فوٹو نہیں آیا۔ اس بیچارے کی تین پلیٹیں خراب ہوئیں۔ آخر ہار کے واپس کر دیا۔

ڈاکٹر مسکرایا اور کہنے لگا۔ "ہاں! ٹھیک ہے، آپ کو یہی بتانا مقصود تھا کہ اس کا فوٹو نہیں آتا۔ جرمنی میں جو نوٹ بنتے ہیں ان کا کاغذ پہلے اس سیال میں بھگو لیا جاتا ہے۔ جس میں مَیں نے یہ کاغذ کا ٹکڑا تر کیا تھا۔ اس کے بعد نوٹ چھپتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نوٹ کا فوٹو نہیں آ سکتا۔ اس صورت میں جعلی نوٹ بننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا"۔ میں نے ڈاکٹر سے کہا۔ "آپ نے جب پاکستان میں سکونت اختیار کر لی ہے تو اپنی سکیم کے متعلق گورنمنٹ کو کیوں نہیں لکھتے؟" لیکن وہ شخص افسران بالا کے رویے سے اس قدر دل برداشتہ تھا کہ ہر امید توڑ بیٹھا تھا۔ اس کے باوجود میرے اصرار پر اس نے پیراشوٹ پر چھپے ہوئے دو نوٹ اور اپنی سکیم جس سے جعلی نوٹ نہیں بن سکتا۔ ایک درخواست نما تجویز کے ساتھ کراچی بھجوا دی۔ (اس وقت دارالحکومت کراچی تھا) ایک دوست نے اپنے رسالے میں اس کا اشتہار بھی دیا لیکن کراچی سے کوئی خاطر خواہ جواب نہ آیا۔

کچھ روز بعد پاکستان کا ایک ہوائی جہاز وہاڑی کے مقام پر گرا اور آگ لگ کر تباہ ہو گیا۔ مسافر ایسے جلے کہ صورتیں تک نہ پہچانی گئیں۔ میں نے اس خبر کا ذکر ڈاکٹر سے کیا۔ ڈاکٹر سرد آہ بھر کر بولا۔ "جہاں ڈاکٹر عمر علی خان موجود ہو وہاں ہوائی جہاز میں آگ لگ جائے، میں تو شرم سے گڑا جا رہا ہوں۔ میرے جرمن دوست کیا کہیں گے؟"

میں نے پوچھا۔ "کیا جرمنی کے جہاز میں آگ نہیں لگ سکتی؟

"ہرگز نہیں"۔ ڈاکٹر بولا۔ دیکھئے! میں آپ کو سمجھاؤں"۔ عمر علی خان اپنی میز پر سے ایک خالی پیالی اور تین چار دوسری شیشیاں اٹھا لایا اور پیالی میں پیٹرول ڈال کر بولا۔ دیکھئے! یہ پیٹرول ہے نا؟ میں نے سونگھ کر اور انگلی ڈبو کر دیکھا تو وہ واقعی پیٹرول تھا۔ میں نے نے کہا۔ ہاں، پیٹرول ہی ہے۔ ڈاکٹر نے اس پیٹرول میں ایک گلابی رنگ کا سفوف حل کر دیا اور مجھ سے کہا کہ اس پیٹرول میں آگ لگاؤ۔ میں نے آٹھ دس دیا سلائیاں پھونک کر ختم کر دیں لیکن پیٹرول میں آگ نہ لگی۔ میں حیران تھا کہ پیٹرول اور آگ نہ پکڑے، کمال ہے۔

ڈاکٹر نے بڑے طنزیہ لہجے میں زور سے کہا۔ "جناب! یہ پانی ہو چکا پانی، پیٹرول نہیں رہا"۔ اب دیکھئے! یہ کہہ کر اس نے سفید رنگ کی ٹکیا اس پیالی میں چھوڑ دی۔ اس ٹکیا کے چاروں طرف چھوٹے چھوٹے بلبلے سے اٹھے اور وہ آہستہ آہستہ حل ہو گئی۔ ڈاکٹر نے ماچس میری طرف بڑھائی، ایک ہی دیا سلائی پر آگ بھڑک اٹھی۔ اب ڈاکٹر نے کہا۔ "جرمنی کے جہازوں میں غیر سوختنی (نہ جلنے والا) پیٹرول بھرا رہتا ہے اور جس نالی سے پیٹرول انجن میں آتا ہے اس نالی کے سرے پر

یہ دوا لگی ہوئی ہوتی ہے جس کی یہ ٹکیہ تھی جو میں نے بعد میں پیٹرول میں ڈالی۔ چنانچہ جو پیٹرول نالی کے منہ سے گزر کر انجن میں داخل ہوتا ہے وہ پیٹرول بنتا جاتا ہے اور جو ٹینکی میں ہوتا ہے وہ پانی کی طرح رہتا ہے۔ اب بتایئے! آگ لگنے کا امکان کتنے فیصد رہ گیا؟ میں اور میرے ساتھی ششدر رہ گئے اور آپس میں سرگوشیاں ہونے لگیں کہ یہ تو بڑا ہی باکمال انسان ہے اور ہمارے ملک کو ایسے انسان پر فخر ہونا چاہیے۔ یہ تو پورے ملک کی قیمت کا اکیلا آدمی ہے۔

ایک دن ڈاکٹر بولا۔ ”لو بھائی! آج ایک اور تماشا تمہیں دکھائیں۔“ میں نے کہا۔ ”جی، کیا تماشا؟“ ڈاکٹر نے بلائنڈنگ پیپر کا اچھا خاصا بڑا ٹکڑا لے کر ایک سیال دوا میں تر کیا اور دھوپ میں رکھ دیا۔ جب وہ سوکھ گیا تو اس کو آگ لگا دی اور وہ جل کر خاک ہو گیا۔ اب ڈاکٹر نے کہا۔ ”دیکھئے! یہ راکھ ظاہر ہے، آگ سے گزر کر بنی ہے لیکن اگر اس کو آگ دی جائے تو یہ بھی بارود ہے۔“ چنانچہ جب اس نے اس راکھ کو دیا سلائی دکھائی تو وہ بھک سے اڑ گئی اور ہم لوگ دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ اس نے مجھے اپنے سائنسی ایجادات کے اس قدر کرشمے دکھائے کہ میں اس کی ناممکن بات کو بھی ممکن جاننے لگا اور اس کی ناقدری سے میری روح بے چین رہنے لگی۔

ایک دن اس نے ایک بارود بنائی اور کہنے لگا چھ ماشے بارود ڈھائی ٹن کا دھماکہ دے گی۔ کہو تو اس پوری بلڈنگ کو اڑا دوں؟“

میں نے کہا۔ ”جناب! مجھے آپ کی بات پر یقین ہے مگر اس پر مصارف کیا آئیں گے؟“

ڈاکٹر نے کہا۔ ”ایک پاؤ بارود پر دس بارہ آنے“۔ میں نے تعجب سے کہا۔ ”دس بارہ آنے؟“

اس نے کہا۔ ”ہاں! سرکار دس بارہ آنے“۔ میں نے کہا۔ ”بارود بنانے کی درخواست دے کر اجازت لے لو اور پھر اس کا سٹاک کر لو ممکن ہے کبھی کام آئے“۔

> ## آزاد یا غلام؟
>
> مقابلے کا پہلا حریف تمہارا نفس ہے۔ اس سے جنگ کر کے خود کو آزما لو کہ آزاد ہو یا غلام! (حضرت علیؓ)
>
> نبیلہ نازش۔ اوکاڑہ

ہمارا تعلق اتنا ہو گیا تھا کہ اس نے بغیر بحث و تمحیص کے میری بات کو تسلیم کر لیا۔ چنانچہ بارود بنانے کی درخواست دے دی۔ میں سفر پر چلا گیا۔ پندرہ دن کے بعد واپس آیا دیکھا تو ڈاکٹر کا کمرہ بند ہے۔ سوچا ممکن ہے کوئی دوست اپنے ساتھ لے گیا ہو، اس لئے زیادہ تشویش نہ ہوئی لیکن تیسرے چوتھے دن ڈاکٹر عمر علی خان کا ایک خط وصول ہوا کہ میں جیل میں ہوں۔ مجھ سے ملنے آؤ۔ میرے تو پاؤں تلے سے زمین سرک گئی۔ میں جیل میں ملنے گیا اور اسیری کا معمہ دریافت کیا۔ اس نے صرف اس قدر بتایا۔ ایک تھانیدار آیا اور مجھ سے بارود بنانے کا پوچھا۔ میں نے کہا۔ اسی دُکان میں بناؤں گا۔ اتفاق سے سامنے پیالی میں تھوڑی سی جمع تھی اس نے کہا۔ ”یہ کیوں بنائی؟ جب کہ اجازت ابھی نہیں ملی“۔ میں نے کہا۔ ”پھینک دیتا ہوں“۔ چنانچہ اٹھا کر نالی میں جھونک دی۔ وہ مجھے اپنے ساتھ تھانے لے گیا۔ مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا۔ وہ مجھ سے بدزبانی سے پیش آیا۔ میں نے ذرا سخت سست کہا اور اس نے مجھے جیل بھجوا دیا۔ اب یہاں جیل والوں کا سلوک مجھ سے کچھ اچھا نہیں۔ اب کل سے کہہ رہے ہیں کہ ہتھکڑیاں ڈال کر پرسوں کراچی لے جائیں گے۔ اگر یہی عالم رہا تو میں مر جاؤں گا۔ دوسرے دن میں نے اپنی سی کوشش کی لیکن روپیہ نہ ہونے کی وجہ سے ناکام رہا۔ اسی اثناء میں چند دن باہر چلا گیا۔ ایک

ہفتہ کے بعد آیا اور آتے ہی ڈاکٹر سے ملنے جیل گیا۔ معلوم ہوا کہ وہ قیدی مر گیا ہے۔ کئی روز ہو چکے ہیں۔

میری نظر میں صاحبِ کمال کی موت ایک ایسا خواب ہے جو ٹوٹتے رہنے کے باوجود نظر سے اوجھل نہیں ہوتا۔ آج مجھے ڈاکٹر عمر علی کی قبر کا پتا نہیں اور میرے ملک کو اس کی اشد ضرورت ہے۔

ڈاکٹر عامر عزیز کی گرفتاری اور نامعلوم مقام پر منتقلی کی خبر پڑھ کر برسوں پہلے نظر سے گزرا ہوا یہ قصہ بے طرح یاد آ گیا، یہ حسرت بھری داستان معروف شاعر احسان دانش نے اپنی خود نوشت کے دوسرے حصے "جہانِ دگر" میں تحریر کی ہے۔ دردمند دل رکھنے والا یہ محب وطن شاعر آج زندہ ہوتا تو اسے ایسی کتنی داستانیں رقم کرنا پڑتیں۔

دل کے پھپھولے سینے کے داغوں سے جلانا پڑتے تو اس پر کیا گزرتی۔ وہ آنکھوں سے ان چراغوں سے گھر کو آگ لگتے دیکھتا جن سے در و دیوار روشن تھے تو کیسی کیسی حسرتیں اس کے دل میں مچلتیں؟ کتنے خواب بنتے اور ٹوٹتے ہوئے دیکھتا؟ وہ کس کس سے کہتا کہ "ان" لوگوں کی ملک کو اشد ضرورت ہے۔

ان کے احساس کی شدت شاید اس لئے بھی زیادہ تھی کہ قیام پاکستان کو ابھی تھوڑا وقت گزرا تھا لوگ خوشی میں یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ ہم واقعی آزاد ہو گئے ہیں۔ وہ ان نادیدہ اور غیر مرئی زنجیروں کو بھول گئے تھے جن سے دور بیٹھے باندھ کر رکھنے کا ہنر آقاؤں نے ایجاد کر لیا تھا۔ حیرت ہے نصف صدی گزر جانے کے بعد بھی ہم اسی بھول کا شکار ہیں۔ ورنہ عمران خان کو ڈاکٹر عامر عزیز کی گرفتاری کے بعد یہ بیان دینے کی ضرورت پیش نہ آتی کہ میں اسمبلی کے پہلے اجلاس میں یہی سوال کروں گا کہ ہم غلام ہیں یا آزاد؟ اگر ان کے جواب میں کسی نے یہ اقرار کر لیا کہ "ہم غلام ہیں" تو پھر اگلا سوال کیا ہو گا؟

صاف چمکتی چندیا پر چپت لگانے کی خواہش پر عمل کرنے سے پہلے ردعمل کا اندازہ لگا لیا گیا تھا۔ چپت کھا کر مڑ کر دیکھنے والے نے مدمقابل کی جسامت دیکھ کر ہی پوچھا تھا۔ "آپ نے مذاق کیا ہے یا سنجیدگی سے یہ حرکت کی ہے؟" مارنے والے نے دونوں ہاتھ کولہوں پر ٹکائے اور تمسخر سے کہا۔ "میں نے سنجیدگی سے مارا ہے"۔ بے چارگی کی زبان نے لہجے کا دبدبہ قائم رکھتے ہوئے کہا۔ "پھر کوئی بات نہیں، میں ایسا مذاق برداشت نہیں کیا کرتا"۔

یقیناً خان صاحب یہ کہتے ہوئے اپنی نشست پر بیٹھ جائیں گے۔ "اوہ! اچھا، میں سمجھا تھا ہم آزاد ہیں"۔

ہماری ہی آنکھیں بند ہیں ورنہ آقاؤں نے یہ بھول مٹانے کو گزشتہ سال سے ڈیرے ڈالے ہوئے ہیں۔ عامر عزیز کو عبدالقدیر خان، جنرل محمود، جنرل عثمانی اور ڈاکٹر بشیر الدین کا حشر دیکھ کر ہوش نہ آیا تو قصور کس کا ہے؟ ہمیں تو آقا کے حوصلے اور وسعت ظرفی کی داد دینی چاہئے کہ اس نے رونے، پیٹنے، واویلا کرنے، جلوس نکالنے، احتجاج کرنے، خبریں لگانے اور کالم لکھنے کی اجازت دے رکھی ہے۔ احسان دانش کو ڈاکٹر عمر علی کی قبر کا پتا نہیں تھا۔ ہمیں بھی علم نہیں کہ ڈاکٹر عامر عزیز کس عقوبت خانے میں بندھا ہوا ہے؟ عمر علی کمزور دل اور مایوس تھا۔ عامر عزیز سخت جان اور پُرامید ہے۔ گو اس وقت ہمارے ملک کو عامر عزیز جیسے لوگوں کی قطعاً ضرورت نہیں ہے مگر وہ کسی "جوہر شناس" کے واپس آنے کی امید پر زندہ رہے گا جس کی اس ملک کو ہی نہیں پوری انسانیت کو اشد ضرورت ہے اور جس دن یہ آس ٹوٹ گئی اس دن یہ بھی مر جائے گا اور اس جیسے اور بہت سے لوگ کہ درندوں کی بستی میں انسانوں کو زندہ رہنے کا حق نہیں۔

***

ابلیس کی کانفرنس

یہ موت سے گزر کر لا الہ الا اللہ تک تو آن پہنچے ہیں۔
میری پوری کوشش ہے کہ یہ محمد رسول اللہ تک نہ پہنچیں۔

☆ امجد جاوید 0308-6759608

ضابطہ

میرے سامنے ایک عظیم صحرا تھا۔ سورج چمک رہا تھا۔ بھوری، سنہری ریت تاحدِ نگاہ پھیلی ہوئی تھی۔ ایک پُر ہول سناٹا تھا، جس میں فقط ہوا کی دہشت ناک سنسناہٹ تھی۔ میں چلتا چلا جا رہا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں کس طرف اور کیوں چلتا جا رہا ہوں۔ اچانک صحرا میں تاریکی چھانے لگی۔ جس کے ساتھ ہی ماحول میں وحشت بڑھنے لگی۔ سورج سیاہ دھوئیں کی اوٹ میں چھپ گیا تھا۔ میں ایک ٹیلے پر چڑھا تو سامنے کا منظر حیرت زدہ کر دینے والا تھا۔

ایک دائرے میں بے شمار عجیب و غریب قسم کے جانور بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے کچھ جانور پہچانے جا رہے تھے اور کچھ عجیب الخلقت تھے۔ ان میں سب سے آگے ایک اُلو، چمگادڑ، اور کرگس بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے بالکل سامنے کی طرف ریچھ، لنگور اور بندر تھے۔ انہی کی دائیں جانب رال ٹپکاتے ہوئے کتے بیٹھے ہوئے تھے اور بائیں جانب لومڑی اور سانپ تھے۔ ان کے

علاوہ کافی سارے ایسے جانور بھی تھے جنہیں میں نہیں جانتا تھا اور نہ ہی انہیں کبھی دیکھا تھا۔

یہ عجیب میلہ لگا ہوا تھا۔ وہ سارے ہی بار بار آسمان کی جانب دیکھ رہے تھے۔ شاید انہیں کسی کا انتظار تھا۔ کتنا ہی وقت یونہی گزر گیا۔ اچانک آسمان کی طرف سے ایک چمکتا ہوا انڈہ ریت پر آن گرا۔ جو کچھ لمحے تو پڑا رہا، پھر ہلنے لگا۔ اسی طرح ہلتے ہوئے وہ ٹوٹ گیا۔ اس کے ٹوٹتے ہی ہر جانب سڑاند پھیل گئی۔ سارے جانور سجدے میں گر کر شور مچانے لگے، کسی کی سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ اس ٹوٹے ہوئے انڈے میں سے ایک گرگٹ نے سر اٹھایا۔ چند لمحوں میں اس نے نہ صرف اپنے رنگ بدلے بلکہ اس کا چہرہ بھی تبدیل ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ ایک بھیانک چہرہ واضح ہو گیا۔ اسی لمحے وہ سارے جانور سجدے میں سے اٹھ گئے۔

''میرے چیلو، تمہیں انسان کی بربادی مبارک ہو۔ تمہاری درخواست پر میں نے اجلاس بلا لیا ہے، کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟'' اس نے اپنی بھدی اور خرخراتی ہوئی آواز میں کہا تو میں سمجھ گیا۔ وہ شیطان تھا۔ اور اس کے اردگرد سارے اس کے چیلے تھے۔ تبھی ایک عجیب الخلقت جانور نے آگے بڑھ کر جھکتے ہوئے کہا

''بے شک انسان کی بربادی آپ ہی کی وجہ سے ہے گرو جی، ہم کیا چیز ہیں۔ آج کے اس اجلاس کی درخواست آپ سے اس لئے کی گئی ہے کہ آپ کا ہر چیلا بڑھ چڑھ کر اپنی خدمات سرانجام دے رہا ہے۔ اب وہ یہ فیصلہ چاہتے ہیں کہ ان میں بڑا کون ہے؟''

اس پر ابلیس چند لمحے خاموشی سے سب کو دیکھتا رہا پھر اپنی بھدی اور خرخراتی ہوئی آواز میں بولا

''تم وہ ہو جو انسان کو اپنے جیسا بنا لیتے ہو۔ انسان کتنا پاگل ہے، اپنی انسانیت چھوڑ کر جانور بن جاتا ہے۔ تم وہ صفت اور صلاحیت ہو، جو کسی انسان میں داخل ہو جائے تو وہ اپنی انسانیت کو بھول جاتا ہے۔ مجھے تم سب پر فخر ہے۔ خیر! اجلاس کی ابتدا کرتے ہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے سب کی طرف دیکھا پھر اُلو پر نگاہ ٹکا کر بولا۔ ''اے اُلو، میرے دانشور،، تجھے تو نروان حاصل ہے میرے اس دانشور کی شان یہ ہے کہ جب انسان کے لئے سورج غروب ہوتا ہے تو اس کے لئے طلوع ہوتا ہے، یعنی کالی رات میں اس کا دن طلوع ہوتا ہے، بتا اے دانشور اُلو، تُو کس حد تک کامیاب ہے۔''

اس پر اُلو آگے بڑھا اور ہاتھ باندھ کر بولا۔

''جناب! یہ آپ ہی کی مہربانی ہے کہ مجھے نروان دیا۔ میرا یہ نروان ایسا ہی ہے کہ میں انسانوں کے ذہن میں شک پیدا کرتا ہوں۔ جس سے ان کی فکری پختگی ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی میں ان میں خوف پیدا کر دیتا ہوں، ہر طرح کا خوف، موت کا خوف، بھوک کا خوف، ان کے اپنے وجود کا خوف۔''

''تم اس کی کوئی مثال دے سکتے ہو؟'' شیطان نے چلبلاتے ہوئے پوچھا

''بے شمار ہیں۔ ایک چھوٹی سی مثال یہ ہے کہ میں نے انسان میں خوف پیدا کر دیا ہے کہ اس زمین سے پانی ختم ہو جائے گا، پھر کیا ہوگا؟ اس خوف کا پیدا ہونا ہی تھا کہ آپ نے دیکھا، انسان اسی لئے بڑے بڑے اجلاس بلا رہا ہے، حالانکہ اسے یہ نہیں معلوم کہ جس نے انسان کو پیدا کیا، وہ پانی ختم نہیں ہونے دے گا۔ اس نے کہہ دیا ہوا ہے کہ جتنا پانی میں نے دے دیا، وہ کبھی ختم ہونے والا نہیں۔ کیونکہ خالق نے ہر شے کو پانی سے زندگی بخشی ہے۔ زندگی اور پانی لازم و ملزوم ہیں۔ میں نے ایسا ابہام پیدا کیا، کوئی سمجھ ہی نہیں رہا۔''

''اور بڑی مثال؟''

''انسان کی جس میں حقیقی آزادی ہے، میں نے اسے غلامی بنا کر فلسفہ پیدا کر دیا۔ اور جو غلامی ہے، اسے

آزادی بنا دیا ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں، میں نے ہر جگہ آگ لگائی ہوئی ہے، کسی کو سمجھ ہی نہیں آنے دے رہا ہوں کہ حقیقی آزادی ہے کیا؟"

"کوئی اور بات کرنا چاہتے ہو؟"

"جناب میں نت نئے فلسفے گڑھ کر فکر و فلسفہ میں انتشار بڑھا رہا ہوں۔ آپ نے دیکھا نہیں عورتوں سے امامت تک کروا دی گئی۔ مرد اس کے پیچھے نماز پڑھ رہے ہیں۔ یورپ کی عورتیں بچے پیدا نہیں کر رہی ہیں۔ میں نے عورت سے اس کا عورت پن چھین لیا۔ آزادی نسواں کے نام پر۔ یہی حال اب برصغیر کی عورتوں کا ہے، وہ اندھی ہو چکی ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ یورپ کی عورتوں کا کیا حشر ہو چکا ہے، پھر بھی آزادی نسواں کی تحریکیں چلا رہی ہیں۔ آقا! میری کیا کیا خدمات نہیں ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" یہ کہہ کر ابلیس نے چمگادڑ کی طرف دیکھا اور کہا، "اے گیانی! تمہارا آسمان اُلٹا ہے، ہاں اب تم بولو۔"

"آقا! میں زیادہ باتیں کر کے دماغ خراب نہیں کرتا۔ میں نے جو کیا ہے اس کی تصویری جھلک دکھاؤں گا تاکہ ہر شے واضح ہو جائے۔" چمگادڑ نے دست بدستہ ہو کر کہا

"تو پھر کھولو اپنی گٹھلی اور دکھاؤ، کیا دکھاتے ہو۔"

شیطان نے اپنے دانت نکوستے ہوئے کہا۔

چمگادڑ نے اپنی گٹھلی کھولی، اس میں سے سیل فون نکالا، اس نے اپنے ہاتھوں کو پھیلا کر سیل فون اس پر رکھا تو وہ آئی پیڈ بن گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی اسکرین بڑی ہوئی لیپ ٹاپ جیسی ہو گئی، پھر وہ ٹی وی جیسا بن گیا۔ جس کی جسامت لحہ بہ لحہ بڑھ رہی تھی۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ سینما اسکوپ سائز کی اسکرین بن گئی۔ سبھی اس طرف دیکھ رہی تھے۔ اسکرین پر سب سے پہلے ایک نائٹ کلب کا منظر ابھرا۔ نوجوان جوڑے مستی میں ایک دوسرے سے جڑے ناچ رہے تھے۔ ہر جوڑا اپنے آپ میں مست تھا۔ کسی کو کسی کی خبر نہیں تھی۔ اس کے ساتھ ہی چمگادڑ کی آواز ابھری

"میں نے ہر جگہ یہ کلچر متعارف کرا دیا ہے۔ یہ صرف انہی ملکوں میں نہیں ہے، جہاں اجازت ہے، بلکہ میرا کام تو وہاں آسان ہوتا ہے جہاں ان نائٹ کلب پر پابندی ہوتی ہے، وہاں یہ نوجوان چھپ کر موج مستی کرتے ہیں، یہ دیکھو ان کے گھروں کا منظر، میں نے ان کے گھروں کو نائٹ کلبوں میں بدل دیا ہے۔"

اس کے ساتھ ہی منظر بدل گیا۔ گھروں میں نوجوان جوڑے ناچ رہے تھے۔ شراب عام بہہ رہی تھی۔ اس میں کئی منظر بدلے۔ نائٹ کلب، ہوٹل، رقص گاہیں، گھروں میں مخلوط پارٹیاں، جہاں رشتے ناطوں کی کوئی پروا نہیں تھی، نہ کسی رشتے کے تقدس کا احساس اور نہ احترام۔ اس کے ساتھ ہی منظر بدلا، سمندر کنارے برہنہ عورتیں نمودار ہوئیں، اس کے ساتھ بڑے بڑے سوئمنگ پول میں نہاتے جوڑے، اٹھکیلیاں، قہقہے، شور شراب، ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے۔ ان سارے مناظر میں یوں دکھائی دے رہا تھا کہ جیسے یہ سارے جسم اور بدن کے پجاری ہوں۔ اور بدن کی ہوس نے سب کو حیوانی سطح پر لا کھڑا کیا ہو۔ انہیں دوسرا ہوش ہی نہ ہو۔

"شاباش۔! ان ترقی پذیروں کو جلد از جلد ترقی یافتہ بنا دو۔" شیطان نے خوش ہوتے ہوئے کہا

"میرا گیان اگر دیکھنا ہے تو میرے سامنے بیٹھے ریچھ، بندر اور لنگور کو دیکھو، یہ وہ آئینہ ہیں جس میں انسان کو یہ باور کرایا کہ ان کے آباء واجداد یہ جانور ہیں۔ ڈارون کی تھیوری کو ایک زمانہ تسلیم کرتا ہے، کتنا احمق ہے یہ انسان۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ یہ سائنسی اصول ہر زمانے میں، ہر جگہ ایک ہی نتیجہ دیتا، مگر انسان کی عقل پر قربان جاؤں، من وعن یہ تسلیم کر لیا کہ جس حقیقت کا

وجود ہی نہیں، اسی کو تسلیم کئے بیٹھے ہیں۔ ان عقل کے اندھوں سے پوچھا جائے کیا اب لنگور اور بندر سے انسان بنتے ہیں؟ جو انسان کی اولاد کہلوانا عار سمجھتے ہیں اور جانوروں میں اپنے آباؤ اجداد کو تلاش کرتے ہیں۔ آخر کار صدیوں سے انسان کی عقل فکر میں نہ آنے والے ان رازوں نے اپنی منزل کو پالیا۔ ان کی باسوں سے اپنے آباؤ اجداد کی بُو کا ادراک پایا۔"

"واہ! تم نے خوب کام کیا۔" شیطان نے تعریف کرتے ہوئے خوشی کا اظہار کیا۔

"اور تو اور میرے گیان کو مغربی مفکرین جس طرح پیش کر رہے ہیں، وہ میری طاقت کا مظہر ہیں۔ میں وہ گیان عام ہونے نہیں دیتا، جس میں انسان کو عقل آ جائے، جیسے آئن سٹائن کی تھیوری کو قانون بننے میں کتنا وقت لگا۔ اب بھی اس میں شک ڈال دیا ہے میں نے، اس کی طرف کسی کو آنے ہی نہیں دیتا کہ کسی انسان کو اس کی سمجھ آ جائے مگر یہ وہ راز ہے جسے اگر انسان سمجھ لے تو اپنے وجود ہی کے بہت سارے انکشافات اس کے منتظر ہیں، جس سے وہ حقیقت کو سمجھنے کے قابل ہو سکتا ہے۔

"ہاں، انسان کو اندھیرے میں رکھو۔ اندھیرا ہی ظلمت ہے جو کفر کی طرف لے جاتا ہے، ان کو انہی کے جسم میں الجھا دو، اسی لذت میں گم کر دو۔ ان بھیدوں کی طرف نہ جانے دو جس سے انسان شعور پا جائے۔" شیطان نے چیخ کر کہا، پھر کرگس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"بول، تیرا دھیان کیا کہتا ہے؟"

کرگس آگے بڑھا اور اپنی بھدی آواز میں بولا:

"میرے آقا! کیا آپ دیکھ نہیں رہے میں نے کس قدر موت بانٹنی شروع کر دی ہے۔ نروان والا اُلّو تو اس طرف لاتا ہے، گیان والی تو مست کرتی ہے اور انہیں الجھا دیتی ہے، لیکن اصل کام تو میں کرتا ہوں۔ میں موت بانٹتا ہوں۔ دیکھ نہیں رہے انسان کس قدر ذلیل و خوار ہو کر مر رہا ہے۔ رُوئے زمین پر اس وقت سب سے ارزاں خون مسلمان کا ہے، مجھے ان پر محنت نہیں کرنا پڑتی، یہ تو پیلیکن کی طرح ہیں جو اپنا لہو خود ہی پی رہے ہیں۔ اتنی قتل غارت کبھی پہلے دیکھی تھی آقا؟"

"شاباش، تمہارا کام بہت اچھا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے کتے اور سانپ کی طرف دیکھا۔ کتا آگے بڑھا تو شیطان نے کہا، "تم تو پیچھے ہٹ جاؤ، تم میں جو انسان سے وفاداری کی فطرت ہے وہ مجھے کھٹکتی ہے، تم سے تو اچھا یہ سانپ ہے۔ تم آگے آؤ اور بتاؤ۔"

سانپ تیزی سے آگے بڑھا اور پھن اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنی نیلی آنکھیں تیزی سے گھمائیں۔ پھر اپنے روپ بدلے اور بولا

"یہ نروان، دھیان اور گیان والے ایک طرف، موت بانٹنے والی بھی ایک طرف، یہ سب اس وقت تک ناکارہ ہیں، جب تک میں سازش نہ کروں۔ یہ میری سازش کا کمال ہے کہ انسان آپس میں لڑتے ہیں۔ اگرچہ انسان مجھے کتے سے بھی بدتر سمجھتے ہیں، لیکن میں ان میں ایسے چہرے کے ساتھ جاتا ہوں کہ وہ مجھے گلے لگانے پر مجبور ہوتے ہیں۔ میرا احترام کرتے ہیں۔ میں انہی کے اندر کے تکبر، لالچ اور بھوک کو استعمال کرتا ہوں۔ میرا سب سے بڑا ہتھیار وہ سکالر ہیں جو کتابوں کو ہاتھ میں رکھ کر ان سے علم حاصل کرنے کی بجائے، دوسروں پر تنقید کے جواز تلاش کرتے ہیں۔ میری سازش ہی سے وہ ہمارے جال میں آتے ہیں۔ اس سے آگے ہی یہ نروان، گیان اور دھیان والے کام کر سکتے ہیں۔"

سانپ کے کہنے پر ایک دم سناٹا چھا گیا۔ شیطان خاموش تھا۔ چند لمحے یونہی گزر گئے، پھر وہ بولا۔

"میں خوش ہوا کہ میرے چیلے ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ میں ان میں کوئی فرق نہیں کر پا رہا ہوں۔ مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میرا ایجنڈا، پروپیگنڈا، اور ہتھکنڈا

مضبوط ہاتھوں میں ہے۔ تم سب بڑے ہو، بس تم میں سے وہ بڑا ہے جو زیادہ انسانوں کو بہکا دے۔ تم سب نے بڑے بڑے کام کر لئے مگر ایک خطرہ اب بھی ہے، میں اسی سے ڈرتا ہوں۔"

"آپ بھی ڈرتے ہیں آقا؟" ایک سڑاند مارتے ہوئے جانور نے حیرت سے پوچھا

"یہ ڈر خوف نہیں ہے، بلکہ یہ ڈر وہ ہے جس سے حضرت انسان آگہی پا سکتا ہے، پھر ہماری طاقت وہاں پر سلب ہو جاتی ہے۔ یہ اجلاس جا ہے جس مقصد کے لئے تھا، لیکن تمام بلّیات کو یہاں بلانے کا مقصد کچھ اور بھی ہے۔ کیا میں وہ نا بتاؤں؟" شیطان نے دردمندی سے کہا تو تمام بلّیات اور جانور اچھل اچھل کر شیطان کی تائید کرنے لگے۔

"آقا، جیسا آپ چاہیں۔" سبھی طرف سے یہی آواز بلند ہوئی تھی۔

"سنو! میں کیا چاہتا ہوں یہ میں بعد میں بتاتا ہوں، پہلے یہ جان لو کہ ہم اس وقت برصغیر کی اس دھرتی پر کھڑے ہیں، جسے چاہے تقسیم کر دیا ہے، مگر میں اس کی تقسیم کو نہیں مانتا۔ مجھے سرحدوں سے کوئی غرض نہیں ہے۔ مجھے یہاں سے ڈر لگ رہا ہے۔ میرے تھنک ٹینکوں نے مجھے بتایا ہے کہ یہاں کے انسان ہمارے ایجنڈے، پروپیگنڈے اور ہتھکنڈے کو ختم کر سکتے ہیں۔ یہ بات تم لوگوں کو ایسے سمجھ نہیں آئے گی، اس کے لئے تمہیں ماضی میں لے جانا پڑے گا۔" شیطان بے حد جذباتی ہو گیا تھا۔

"کہو آقا کہو۔" ایک شور اٹھا۔

"جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ میری دشمنی انسان سے ہے، اور ان میں سے سب سے بڑا دشمن مسلمان ہے۔" یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کو رکا پھر کہتا چلا گیا۔ "یہ انتہائی نازک لمحات ہوتے ہیں جو صدیوں کے بعد قوموں پر آتے ہیں، وہ لمحات ہوتے ہیں آزادی کے۔ میری بھرپور کوشش ہوتی ہے کہ میں ان لمحات کو ٹال دوں۔ حقائق عالم سے ان کی آنکھیں بند کر دوں۔ تا کہ وقت گزر جائے۔ جب وقت گزر جاتا ہے تو پھر کچھ نہیں بچتا۔ کیونکہ آزادی کے لمحات صدیوں بعد ہی قوموں پر آتے ہیں۔ حقائق عالم کو ان کی نگاہوں سے اوجھل کرنے کے لئے میں مذہبی، عوامی سیاسی اور معاشرتی گروہوں میں گھس جاتا ہوں۔ ہر طرح سے انہیں گمراہ کرتا ہوں۔ ان کے اندر نفرت، حسد اور کینہ بھر دیتا ہوں۔ یہ بہت آسان ہے۔ صرف یہ کرنا ہوتا ہے کہ ان سب کو ایک دوسرے سے بڑا کر کے دکھا دو۔ انہیں یہ باور کرا دو کہ تم سب سے بڑے ہو۔ میں نے بھی ایسا ہی کیا۔ میں نے ہر ایک کو یہ باور کرایا کہ تم سب سے بڑے حریت پسند ہو۔ ساری حریت تمہارے پاس ہے۔ میں نے سب کے ہاتھوں میں حریت تھما دی اور ان کا شیرازہ بکھر گیا۔ اس کے بعد میں نے بڑا وار یہ کیا کہ انہیں جتایا تم ہی سب سے اعلیٰ اور برتر قوم ہو۔ اپنی قوم کے لئے سب سے بہتر فکر کرنے والا دوسرا کون ہے۔ انہیں لڑنے مرنے کے لئے تیار کر لیا۔ انہیں کہا کہ اپنے ماننے والوں کو الگ کر لو۔ اور جسے تم اچھا سمجھتے ہو اس کے ساتھ مل کر آزادی حاصل کرو۔ بھی آزادی کے متوالے حریت پسند بن گئے۔ میں نے اپنی ہنرمندی سے اس وقت کو ان کی آنکھوں سے اُڑا دیا۔ ان قیمتی لمحات کو اپنے دام فریب سے الجھا دیا۔ میں کامیاب تھا کہ انسان پر انسان کی غلامی کا تسلسل قائم رہتا۔ اپنی ہی غلامی میں نسل در نسل انسان خود پر ظلم کی انتہا کرتا رہتا۔ میں کامیاب تھا، اس وقت دو چار لوگ جو مذہب، سیاست اور آزادی سے واقف تھے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ میں نے انفرادی طور پر ان کے دماغ میں بھی ڈال دیا تم ہی حریت پسند ہو اور بڑے گروہ والے ہو۔ یوں وہ اپنے ماننے والوں کو لے کر الگ ہو گئے۔ میں نے اصل میں انہیں گمراہ کر کے انہیں اپنی ہی قوم کا

دشمن بنادیا۔ یہ ثابت کردیا کہ وہ جاہل اور ظالم ہیں۔ میں کامیاب تھا مگر......"

"مگر کیا ہوا آقا؟" ایک شور اٹھا۔

"اس وقت میرے ارادوں کو ایک مردِ حریت کی آنکھ دیکھ رہی تھی۔ اس نے میرے ہتھکنڈوں کو بھانپ لیا۔ اس نے بر وقت دو قومی نظریہ پیش کر کے نہ صرف میرے مکروفریب کے جال کو ان کی نگاہوں پر ظاہر کیا اور ان کے مقصد کو واضح کیا۔ جسے میں اپنے ہم رنگِ زمیں جال کے نیچے چھپائے ہوئے تھا۔ میں چاہتا تھا کہ پوری مسلمان قوم کو غلامی میں رکھوں۔ اس مردِ حریت نے کہا غیر کی طرف مت دیکھو، اپنی طرف آؤ، اپنوں سے مل کر آزادی حاصل کرو، غیر کے ساتھ ملنے سے رسوائی کے سوا کچھ نہیں۔ خود آزادی حاصل کرو اور غیر کو اپنے ارادے سے نکال دو۔ یہی حریت ہے۔ خود اپنی قوت سے آزادی حاصل کرو۔ یہی میرے لئے موت تھی۔"

"پھر آپ نے کیا کیا آقا؟"

"کیا تم نے نہیں دیکھا۔ اس غلامی کی اندھیری رات میں اس ملک کے دل میں اس نے ان کے محبوب رہنما قائداعظم کا دیدار کرایا۔ اور صورت کو ان کے دلوں میں اتارا۔ میرے پھیلائے ہوئے جال کو پھاڑ دیا اور اپنے مقصد کو حاصل کر لیا۔ ایک صورت سامنے کردی، جس پر یقین کو قوت بنا دیا۔ لیکن میں بھی اپنا کام کر چکا تھا۔ میں نے اس خطے میں انتشار پیدا کر دیا تھا۔ مگر پھر بھی اس قلندرِ لاہوری کی آواز جس کے کانوں میں بھی پڑی اس پر آزادی کا جنون طاری ہو گیا۔ کیا تم نے نہیں دیکھا اس قلندر کی نواؤں کی بجلیاں جہاں گرتی تھیں، وہاں سے آزادی کی تلواریں پھوٹتی تھیں اور میں بے بس ہو گیا۔" شیطان یہ کہہ کر خاموش ہو گیا

"خاموش کیوں ہو گئے آقا؟" چیلے چیخ اٹھے تو وہ چند لمحے چپ رہنے کے بعد رقت آمیز لہجے میں بولا

"وہ وقت قابلِ دید ہوتا ہے جب آزادی کے متوالوں کے جذبے آسمان سے باتیں کر رہے ہوتے ہیں۔ ان کے حوصلے ایسے ہوتے ہیں کہ ہر قربانی سے گزر جاتے ہیں۔ وہ میرا جال کاٹ کر نکل گئے۔ وہ "لا الہ الا اللہ" پر گئے۔ انہوں نے ایک نیا جہان بنا لیا۔ کائنات میں اپنا آپ ظاہر کر کے "اللہ" کی قوت کا مظہر بن گئے۔ یہ لوگ موت سے بے تیغ و سناں گزر گئے۔ انہیں موت بھی نہ روک سکی۔ وہ قلندر کی دی ہوئی صورت میدان میں ڈٹی رہی۔ اس کی صدائیں بلند ہوتی رہیں۔ وہ میرے اندر کے فتنے کو دیکھ رہا تھا۔ میں ننگا ہو کر ناچا۔ وہ قلندر تھا اور اس نے مجھے سچا کر رکھ دیا۔ وہ صاحب بصیرت میری چالوں کو سمجھتا تھا۔ ورنہ میں کسی کی سمجھ میں آنے والا نہیں ہوں۔ اس نے لا الہ الا اللہ سے سفر کیا اور ایک نیا جہان بنا کر محمد رسول اللہ کی طرف بڑھنے کو تیار تھے۔ جو درس حریت انہیں ان کا دین دیتا ہے وہ سینے سے لگا کر موت سے بھی گزر گئے۔ اس وقت میرا جال ٹوٹ گیا تھا، وہ دوبارہ نہیں بن سکا۔ وہ وقت میرے لئے بڑا دردناک تھا۔ اس وقت جو اپنی قوت بازو سے نکل گئے، سو نکل گئے۔"

"پھر کیا ہوا؟" چیلے چیخے

"اس مردِ قلندر نے میرے سارے منصوبے ختم کر دیئے لیکن میں نے بھی اس سے بڑا انتقام لیا۔ سکھوں کے ہاتھوں قتل و غارت گری کا بازار گرم کر دیا۔ میں نے اس جاہل قوم کی سوچ ہی سلب کر لی۔ یہ کیسے بے ہوش لوگ ہیں، جنہیں آزادی کا احساس تک نہیں ہوا۔ اس وقت یہ سمجھ رہے تھے کہ انہوں نے آزادی حاصل کر لی، کیا تم نے نہیں دیکھا سن چوراسی میں، ان کے ساتھ میں نے کیا کیا۔ میری ابلیسیت ننگا ہو کر ناچی۔ آزادی کا خمار ان کے ذہنوں سے نکل گیا۔ ہر اس قوم کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے، جو غیر کے ساتھ مل کر آزادی حاصل کرتے ہیں۔

آزادی صرف اپنی قوت بازو سے نصیب ہوتی ہے۔ انہوں اب پھر حریت کا نعرہ لگا دیا ہے۔ ان کی عقل میں مزید جوئیں ڈال دو۔ تاکہ انہیں ہوش تک نہ آئے۔ اگر کہیں انہیں آزادی کا پتہ چل بھی جائے اور یہ آزادی ان کے سینے میں ابھرے تو بارود سے ان کے سینے ٹھنڈے کردو۔ یہی اس قوم کی سزا ہے۔"

"ہمارے سب سے بڑے دشمن مسلمانوں کے ساتھ کیا کیا؟" ایک چیلا دست بستہ بولا۔

"اسی دن سے میرا اگلا مقصد شروع ہوگیا۔ تاکہ یہ جو سلامتی کے نام پر جہان بنایا گیا ہے، یہی سلامت نہ رہے۔ اس پر کبھی شباب نہ آئے۔ یہ خزاں رسیدہ ہی رہے۔ یہاں دودھ کی نہروں کی بجائے خون بہے۔ پہلے میں نے ان کی شہہ رگ پر چھری رکھ دی۔ سو کچھ ہی سال بعد میں نے سن پینسٹھ میں اس پر حملہ کردیا۔ میں نے تو یہ سوچا تھا کہ یہ ابھی کمزور ہے، یہاں کے لوگ بھوکے ہیں۔ لیکن مجھے کیا پتہ تھا کہ شہادت ان کی سب سے بڑی قوت ہے۔ میں نے ان کے دل پر شب خون مارا۔ اس کے شہیدوں نے میرے مذموم منصوبوں کو ناکام بنا دیا۔ انہوں نے شہادت کی روایت کو برقرار رکھا۔ میں کہاں سکون سے بیٹھنے والا تھا۔ چند سال بعد ہی میں نے اس کا ایک بازو کاٹ کر رکھ دیا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے پنڈال کی طرف فخر سے دیکھا تو سانپ نے اٹھ کر کہا

"لیکن کیا آپ نے نہیں دیکھا آقا، انہوں نے ظاہری شباب حاصل کرلیا، اس نے ایٹم بم کی صورت میں اپنا ایک خوفناک بازو پیدا کرلیا ہے؟"

اس کے یوں کہنے پر شیطان نے غضب ناک انداز میں اسے دیکھا اور خرخراتی ہوئی آواز میں انتہائی غصے میں کہا

"احمق! تم نے میرے زخم جگر پر ناخن مار دیا۔ اس بے غیرت کو یہاں سے اٹھا کر پچھلی نشستوں پر دھکیل

دو، مجھے برداشت نہیں ہو رہا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا لباس تار تار کر دیا۔ اس کے سیاہ بدن پر نشان واضح تھے۔
"یہ دیکھو! میرے جسم پر، میرے ظاہر اور باطن پر یہ جو شکست کے داغ ہیں، یہ اس مردِ قلندر کے پے در پے وار کرنے کے نشان ہیں۔ اس نے وہ تلوار ان لوگوں کے ہاتھ میں دے دی ہے جو مسلسل چلتی چلی جا رہی ہے۔ اس لئے اب میری ترجیح بدل گئی ہے۔"
"کون سی ترجیح آقا؟" چیلے بولے۔
"یہ جو لا الہ الا اللہ کی بنیاد پر ملک بنا، اسے چلانا تو انسانوں ہی نے ہے نا۔ میں نے اس ملک کے باسیوں کو اس تلوار سے غافل کر دیا ہے جس کی طرف مردِ قلندر نے توجہ دلائی تھی۔ جو ان میں بجلی کی سی صلاحیت بھر دینے کے لئے کافی ہے۔ میری نگاہیں ادھر ہی گڑی ہوئی ہیں۔ میں کوئی لمحہ خالی نہیں جانے دیتا۔ افسوس اس نے ظاہری شباب حاصل کر لیا۔ چاغی کے پہاڑوں نے اس کا جلال دیکھا، جس سے میں خوف زدہ ہو گیا ہوں۔ سو تب سے میرا مقصد صرف یہی ہے کہ میں اسے روحانی اور باطنی طور پر اس قدر کمزور کر دوں کہ یہ تلوار ہی نہ اٹھا سکیں۔ میں نے اسے باطنی شباب حاصل کرنے کے قابل ہی نہیں چھوڑنا۔ کیا تو نہیں دیکھا، جن اسلامی ممالک کے دماغوں میں طاقت کا جنون پیدا ہوا میں نے اُن کے ساتھ کیا کیا۔"
"وہ اپنی موت آپ مرتے جا رہے ہیں۔" چیلوں نے خوشی سے بغلیں بجاتے ہوئے کہا۔
"نہیں، وہ مرتے نہیں ہیں، یہی تو سب سے بڑی مصیبت ہے۔ وہ پھر سے زندہ ہو جانے کی قوت رکھتے ہیں۔ میں نے ان کے لئے کچھ اور ہی سوچ لیا ہے۔"
"کیا سوچا ہے آقا" چیلوں نے پوچھا۔
"اس ملک نے ظاہری عالم میں تو شباب حاصل کر لیا ہے، میں انہیں روحانی شباب پر ہی نہیں آنے دوں گا۔"
شیطان نے زور سے کہا تو ایک چیلا اٹھ کر بولا
"آقا یہ روحانی شباب کیا ہے؟"
"اس قوم کی اکملیت عشقِ رسول (ﷺ) میں ہے، وہی پیدا نہ ہونے دو۔ یہی ان کا روحانی زوال ہو گا۔"
"میں نے انہیں باطنی طور پر کمزور کرنے کے لئے ساری قوت لگا دی ہے۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اُلو، چمگادڑ، سانپ کیا کیا کر رہے ہیں۔ تم میرے ساتھ آؤ، ہر شعبہ زندگی میں، چاہے وہ سیاسی ہے، مذہبی یا معاشرتی علمبردار ہیں۔ میڈیا ہے، بیوروکریسی ہے، زندگی کے ہر شعبے میں میرے ساتھ لگ جاؤ۔ تم نے دیکھا نہیں اس وقت سب سے زیادہ مذہبی منافرت یہیں ہے۔ جو ملک مذہب کے نام پر بنا۔ یہاں کے لوگ مذہب کے لئے نہیں، مسلک کے لئے لڑتے ہیں۔ اس سے بڑی کامیابی کیا ہو گی۔ اب میں کامیاب ہوں، بڑی دیر ہو گئی میرے مقابل کوئی نہیں آ رہا۔ میں نے ہر جانب فحاشی پھیلا دی ہے۔ میری خواہش ہے کہ اب کوئی میرے مقابل آ کر مجھے شکست دے۔ ایسا ہمیشہ چلتا رہے گا مگر......" شیطان یہ کہہ کر خوف زدہ انداز میں خاموش ہو گیا
"مگر کیا آقا؟" چیلے تشویش زدہ لہجے میں بولے۔
"یہ ملک ایک وجود کی مانند ہے اور اس کا ایک دل ہے، جسے عالمِ جاوید کہتے ہیں۔ اسی عالم سے، اسی دل سے ہمہ وقت صدائیں اٹھ رہی ہیں۔ میں نے پوری کوشش کر کے انہیں ان صداؤں سے دور رکھا ہوا ہے۔ طوفانِ بدتمیزی اس قدر برپا ہے کہ انہیں آواز سنائی نہیں دینے دیتا۔ میں نے پورا زور لگایا ہوا ہے کہ ان کے کانوں میں عالمِ جاوید کی آواز نہ پڑے۔ میں نے ان کے کان بند کر دیئے ہوئے ہیں۔"
"ایسا کیا ہے اس آواز میں آقا؟" ایک چیلے نے پوچھا تو شیطان کو جھرجھری آ گئی اس نے کہا

"تم نے نہیں دیکھا، انہی صداؤں نے پہلے کیا کیا ہے۔ اس عالم میں ایک جہان پیدا کر دیا۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں پھر سے اس جہان میں اس کی روح نہ پیدا ہو جائے۔ وہ قوانین جوان کی آنکھوں پر کھل نہیں رہے جو چودہ صدیاں پہلے تجربات سے گزر چکے ہیں۔ آج بھی وہ اسی طرح کامیاب ہیں، جیسے پہلے تھے اور ابد تک رہیں گے۔ ان قوانین کو ان کی آنکھوں سے دور رکھا، کہیں پھر سے وہ انقلاب پیدا نہ ہو جائے، جس میں تین سو تیرہ عالم کفر پر بھاری تھے۔ فرشتے ان کی نصرت میں آج بھی اتر سکتے ہیں۔"

"کیا ایسا ہو جائے گا؟" چیلا ڈرتے ہوئے بولا تو شیطان نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور نخوت سے بولا

"جو اپنے آپ کو بھول گئے، انہیں کیا یاد آئے گا۔" یہ کہہ کر اس نے سنجیدگی سے سب کی طرف دیکھا اور بولا۔ "سنو! نوجوانوں کو تعلیم سے عاری کر دو، نصاب سے اسلاف کے کارنامے اُڑا دو، میں نے بھی ایٹم بم بنا لیا ہے۔ بے غیرتی، عیاشی، فحاشی پھیلا دو۔ ہر شعبہ فکر میں پھیلا دو۔ دوسری بات سنو! یہ مذہب جو عورتوں کو عزت اور احترام دیتا ہے۔ عورت ہی کو اس کے مقام سے گرا دو۔ عورتوں میں آزادی کی لہر کو تیز کر دو، انہیں غلامی کا احساس دلاؤ۔ انہیں مذہبی اور دنیاوی تعلیم سے بیگانہ کر دو۔ عورتوں کی بلاوجہ بازاروں میں گردش بڑھا دو۔ لچے، لفنگے، راہزن میرے ماننے والوں کو چوراہوں میں تعینات کر دو۔ عورتوں کی دینی اور دنیاوی تعلیم روک دو تاکہ بیماری کی صورت میں مرد معالج ہی انہیں دیکھیں۔ مرد خود مجبور ہو جائیں اپنی عورتوں کو غیر مردوں کے آگے ڈالنے کے لیے۔ یہ جو نئے دو تحفے میں نے بتائے ہیں یہ رنگ برنگے نشے ہیں۔ قوموں کا سرمایہ نوجوان ہوتے ہیں۔ نیا شباب پکڑتے جاؤ اور انہیں ان نشوں پر لگا دو۔ انہیں اخلاقی، فکری، شعوری طور پر تباہ و برباد کر دو۔

حتیٰ کہ یہ اپنے حوصلے کھو بیٹھیں۔ جب یہ خود سے بے گانہ ہو جائیں گے تو یہ خود ہی میں نہیں رہیں گے۔ تو پھر دین اور مذہب کہاں رہیں گے۔ کہیں پیر تعویذ بیچیں گے اور کہیں مولوی فتویٰ فروشی کریں گے۔ خدا اور دین کہاں رہے گا؟ انہی کے ہاتھوں انہیں ختم کردوں گا۔ میں ساری ذمے داری پوری کرنے کے بعد خود بری الذمہ ہو جاتا ہوں اور سارا الزام حالات پر ڈال دیتا ہوں کہ وقت کا یہی تقاضا تھا، تم بھی ایسے ہی کرو، بلکہ یہ انسان پر ہی ڈال دو۔"

"یہ تو ہم کرکے ہی رہیں گے۔ کوئی نئی بات بھی ہے آقا۔" چیلا آگے بڑھ کر بولا

"میں اس ملک کی نسلوں کو تباہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں اور میرے جال سنہری ہیں۔ رنگ برنگے خوبصورت ہتھیار جو بغیر دھماکہ کئے اندر تک فنا کردیتے ہیں۔ سن لو! میرا ایجنڈا، میرا پروپیگنڈا اور ہتھکنڈہ مضبوط ہاتھوں میں ہے۔ میرا منشور واضح اور صاف ہے۔ بے غیرتی، فحاشی اور عریانی کو عام کردو۔ عام لوگ میری بات کو نہیں سمجھتے۔ اس کا حل میں نے یہ نکالا، میں نے اپنا منشور دس دس روپے کی سی ڈیز میں ریڑھیوں پر رکھ دیا ہے تاکہ یہ اپنی آنکھوں سے اس کے معانی اور مقصد کا مشاہدہ کرلیں۔ کہو اتنا سستا ہتھیار کس کے پاس ہے؟"

"آقا، آپ ہی کے پاس ہے۔" چیلوں نے شور مچادیا۔ کان پڑی آواز سنائی نہ دے رہی تھی۔ شیطان نے انہیں خاموش ہونے کے لئے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ وہ چپ ہوگئے تو وہ بولا۔

"میرے جال برے نہیں، میں اپنے ارادے کو عملی جامہ پہناتا ہوں۔ یہ سب انسان ہی کرتے ہیں جو میرے چیلے ہیں۔ کیا یہ اب بھی نہیں سمجھتے کہ میں ان کی آزادی کا کتنا خواہاں ہوں۔ تم اس وقت کا اور اک ہی نہیں کرسکتے کہ میرا کیا حال ہوتا ہوگا، جب میں ان دانشوروں کی عقل کی صراحیوں میں ان حسین افکار کو اتارتا ہوں۔"

"ہمارے لئے کیا حکم ہے آقا؟" ایک بڑے چیلے نے پوچھا جواب تک خاموش تھا

"ہم نے اس ملک کے دل کو قابو کرنا ہے۔ یہی ہماری منزل ہے۔ ذرا جلدی قدم بڑھاؤ، ہمارا سفر اس ملکِ خداداد کے دل کی طرف ہے۔"

"اس سے کیا ہوگا آقا؟" چیلے نے پوچھا۔

"پھر سن لو! یہ موت سے گزر کر لا الہ الا اللہ تک تو آن پہنچے ہیں۔ میری پوری کوشش ہے کہ یہ محمد رسول اللہ تک نہ پہنچیں۔ کیونکہ ان انسانوں میں کلمے کی حقیقی روح سامنے نہ آجائے جو پہلے ہی ان میں بسی ہوئی ہے۔ محمد رسول اللہ ہی ان کی روحانی تکمیل ہے۔ اسی سے یہ پوری دنیا پر چھا جائیں گے۔ پھر یہاں میری کسی سازش کا اثر نہیں ہوگا۔ میں بے بس ہوں گا۔" یہ کہہ کر وہ تھک سا گیا اور اس نے اپنے گردن جھکالی۔

اس کے ساتھ ہی شور مچ گیا۔ شیطان کا ہر چیلا تیار تھا۔ اس کے ساتھ ہی شیطان گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے لگا۔ سڑاند چاروں جانب پھیلنے لگی۔ مجھ سے وہاں کھڑا نہیں ہوا جارہا تھا۔ تبھی وہ انڈا پھر سے بند ہونے لگا۔ اس میں سے مختلف رنگ نکلنے لگے۔ اور وہ واپس آسمان کی جانب اٹھ گیا۔ سارے چیلے شور مچاتے وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔

سورج کی روشنی تیز ہونے لگی۔ جیسے جیسے وہ صحرا ان شیطانی چیلوں سے خالی ہونے لگا، اسی طرح ریت بھی سرکنے لگی۔ یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے انہی کی نحوست کی وجہ سے ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ وہ صحرا میدان بنتا چلا گیا، یہاں تک کہ میں نے خود کو درختوں کے ایک جھنڈ کے پاس پایا۔

☐❋☐

طنز و مزاح

بن بلائے مہمان

ان لوگوں سے جو کہ بن بلائے مہمانوں سے خداواسطے کا بیر رکھتے ہیں،
میری درخواست ہے کہ وہ اور کچھ نہیں تو محض تفریح کے طور پر
مہینے میں ایک بار کسی بن بلائے مہمان کو اپنے ہاں ضرور بلوایا کریں۔

☆ سعادت حسن منٹو

غالب کہتا ہے:

میں بلاتا تو ہوں ان کو مگر اے جذبہ دل
ان پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

یعنی اگر اسے بن بلائے مہمانوں سے کد ہوتی تو یہ شعر ہمیں اس کے دیوان میں ہرگز نہ ملتا۔

غالب کہتا ہے۔ میں بلاتا ہوں ان کو مگر میرا جی تو یہ چاہتا ہے کہ کوئی ایسی بات ہو جائے کہ وہ بن بلائے چلے آئیں اور سچ تو یہ ہے کہ بلا کر کسی کے آ جانے میں وہ مزہ کہاں ہے جو بن بلائے آ جانے میں ہے لیکن سمجھ میں نہیں آتا۔ کیوں لوگوں کو بن بلائے مہمانوں سے خدا واسطے کا بیر ہے۔

آپ کہیں گے کہ صاحب غالب نے تو معشوقوں کے متعلق کہا تھا کہ ان کا بن بلائے آ جانا عاشقوں کے لئے ایک بہت بڑی بات ہے۔ آپ نے زبردستی یہ شعر مہمانوں کے ساتھ چپکا دیا۔ اچھا صاحب یوں ہی سہی لیکن نفسیات کی روشنی تو موجود ہے۔ چلئے اسی میں بن بلائے مہمانوں کو دیکھ لیتے ہیں۔

یہ نفسیات کا زمانہ ہے۔ ہر چیز آج کل اسی ترازو میں تولی اور اسی کسوٹی پر پرکھی جاتی ہے لیکن بن بلائے مہمانوں کا نفسیاتی تجزیہ کرنے سے پہلے اس بات کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے کہ آیا ہر مہمان کو بلانا ضروری ہے یعنی کیا وہی آدمی قابل برداشت مہمان ہوتا ہے جس کو مدعو کیا جائے، خط لکھ کر، دعوتی کارڈ بھیج کر، تار دے کر یا ٹیلی فون کر کے اپنے گھر بلایا جائے۔ اس کا جواب منطق کی رُو سے یہی ہوگا کہ ایسے بلائے ہوئے مہمان ضروری نہیں کہ سو فیصدی قابل برداشت ثابت ہوں۔ اسی طرح ہم اس نتیجے پر بھی آسانی کے ساتھ پہنچ جائیں گے کہ بن بلائے مہمان ضروری نہیں کہ سو فیصدی ناقابل برداشت ثابت ہوں...... واضح یہ ہوا کہ ہر بن بلائے مہمان پر ناقابل برداشت اور ناقابل قبول کا لیبل لگا دینا بہت بڑی زیادتی ہے۔

اور یہ بھی زیادتی ہے یعنی آپ ساری عمر نہیں بلائیں گے تو کیا اس کا یہ مطلب ہوگا کہ آپ کے ہاں کوئی آئے ہی نہیں۔ اسی انتظار میں آدمی سوکھتا رہے کہ آپ کب بلاتے ہیں اور بفرض محال مہربان ہو کے آپ نے ایک دفعہ بلا لیا تو اس کے بعد آس لگائے بیٹھے ہیں

کہ جب دیکھئے آپ پھر کب مہربان ہو کے بلاتے ہیں...... نا صاحب بلانا ولانا کوئی ضروری نہیں، جب بھی کسی کا جی چاہے چلا آئے۔ دوستوں میں ایسی بھی کیا غیریت۔

عربوں کی مہمان نوازی مشہور ہے لیکن ہم نے کبھی یہ نہیں سنا کہ انہوں نے اونٹ روانہ کر کے مہمانوں کو بلایا ہو۔ اصل میں وہ مہمان نوازی ہی کیا جو بلا کر کسی آدمی پر عائد کی جائے۔ ہم تو عربوں کے متعلق یہی سنتے آئے ہیں کہ ان کے مہمان اکثر بن بلائے ہی ہوتے تھے...... دن کو رات کو کسی وقت بھی آ نکلتے۔ دروازے کھلے پاتے، حاتم طائی کبھی پیدا نہ ہوتا اگر وہاں مہمانوں کو بلا کر ان کا میزبان بننے کا دستور ہوتا۔

انگریزوں کی روزمرہ زندگی بڑی نپی تلی ہے۔ منٹوں اور سیکنڈوں کا حساب کیا جاتا ہے۔ بن بلائے کسی کے یہاں جانا ان کے نزدیک بہت بڑی بدتمیزی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حاتم طائی کے قد و قامت کی ایک بھی شخصیت ان کی تاریخ میں نظر نہیں آتی لیکن یہاں حاتم طائی کے قد و قامت کی شخصیتیں پیدا کرنے کا سوال نہیں۔ ہمیں تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ بن بلائے مہمان کو سوسائٹی کیوں ایسی بُری نظروں سے دیکھتی ہے اور معاشرے میں اس کی حیثیت کیوں ایک خارش زدہ کتے سے بھی بدتر ہے۔

مان نہ مان، میں تیرا مہمان...... یہ بالکل اور چیز ہے لیکن بن بلایا مہمان ہرگز ہرگز ملعون و مطعون نہیں ہونا چاہئے بلکہ میزبان کو الٹا ان کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ یہ ان میں خود اعتمادی پیدا کرنے کا موجب ہوتے ہیں اور خود اعتمادی۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں انسان کے کردار میں بہت ہی ضروری ہے۔

ذرا غور فرمائیے...... اگر آپ کسی بن بلائے مہمان کو برداشت نہیں کر سکتے جو زیادہ سے زیادہ چار پانچ روز آپ کے پاس ٹھہر کر اپنی راہ لے گا تو آپ ایک ایسے بڑے ناگہانی حادثے کو کیوں کر برداشت کر سکیں گے جس کا ردِعمل برسوں جاری رہتا ہے۔ ملک کی سیاست میں کسی اچانک تبدیلی کو آپ کا ذہن کیسے برداشت کرے گا اور آپ کیوں کر اس تبدیلی کے ساتھ خود کو سمو سکیں گے۔ اگر آپ بن بلائے مہمان کو برداشت نہیں کر سکتے تو معاف کیجئے، موت کے فرشتے کا کیا کیجئے گا جو ہمیشہ بن بلائے آتا ہے۔

دنیا کچھ بھی کہے لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ ہر بن بلائے مہمان کی آمد، نہ بلانے والے میزبان میں خود اعتمادی پیدا کرتی ہے۔ دعوت کا اعلان کر کے اور خورد و نوش کا جملہ سامان تیار کر کے ایک دس یا بیس آدمیوں کو مہمان بنا لینا کوئی بڑی بات تو نہیں، بڑی بات تو اس وقت ہوگی جب آپ کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہوگی اور تین چار دوست بیک وقت یا یکے بعد دیگرے آپ کے گھر آ دھمکیں گے اور آپ کو افراتفری میں ان کے کھانے پینے اور رہنے سہنے کا انتظام کرنا پڑے گا۔

صاحب خانہ یا میزبان کے سلیقے کا اندازہ اعلان کر کے دی ہوئی دعوتوں اور بلا کر بنائے ہوئے مہمانوں کی خاطر مدارت سے بطریق احسن کبھی نہیں ہو سکتا۔ آپ کے، آپ کی بیگم صاحبہ کے، آپ کے نوکروں کے حسن انتظام خوش سلیقگی اور رکھ رکھاؤ کا صحیح اندازہ صرف اسی وقت ہوگا جب آپ امتحان کے لئے تیار نہ ہوں گے۔

انسپکٹر جب بتا کر سکولوں کا دورہ کرتے ہیں کہ وہ فلاں دن، فلاں سکول کا معائنہ کریں گے تو اس دن سکول کا غلیظ ترین کونہ بھی صاف ہو جاتا ہے۔ صحیح معائنہ تو اصل میں اس وقت ہوگا جب انسپکٹر Surprise Visit پر آ نکلے گا۔

انسپکٹر تو محض اپنے فرائض سے سبکدوش ہونے کے

لئے معائنے پر آتے ہیں لیکن بن بلائے مہمان غیر شعوری طور پر میزبانوں کو اپنے فرائض سے سبکدوش ہونے کا موقع بہم پہنچاتے ہیں۔ سوسائٹی انہیں ملعون و مطعون گردانتی ہے لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے اس لئے کہ ان کا وجود سوسائٹی کے حق میں بے حد مفید ہے۔

یہاں تک کہہ چکنے کے بعد میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں اور بے جھجک بتانا چاہتا ہوں کہ میں بلانے پر کسی کے یہاں آج تک نہیں گیا۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ میرے اکثر و بیشتر میزبان مجھ سے نالاں ہیں کہ میں بن بلائے آدھمکتا ہوں لیکن اس کے باوجود میں نے اپنی عادت نہیں بدلی اس لئے کہ مجھے اس میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی۔

میں شاعر مزاج ہوں۔ ٹھس واقعات اور سپاٹ چیزوں سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ شادی، بیاہ اور سالگرہ وغیرہ کی دعوتیں میرے لئے بالکل بے کیف ہیں۔ وہ کھیل اور تماشے بھی میری نظروں میں وقعت نہیں رکھتے جن کو دیکھنے کے لئے آدمی کو وقت کا پابند ہونا پڑے۔ مجھے اس بستر پر کبھی نیند نہیں آسکتی جو میرے لئے خاص طور پر تیار کیا گیا ہو۔ وہ مہمان نوازی مجھے کھلتی ہے جس میں پہلے کی تیاری کی ہلکی سی جھلک بھی ہو۔

وہ لوگ جو مجھے یا میرے مزاج کے آدمیوں کو حقارت کی نظروں سے دیکھتے ہیں ان کے متعلق مجھے افسوس سے کہنا پڑے گا کہ وہ شعریت سے یکسر خالی ہیں۔ ڈرامے کو سمجھنے اور اس سے حظ اٹھانے کی صلاحیت ان میں ذرہ بھر نہیں۔ حادثات کا مقابلہ کرنے کی تاب تو معاف کیجئے، ان میں سرے سے ہوتی ہی نہیں۔

اونچی سوسائٹی کی ایک خاتون تھیں جن کے متعلق اونچی سوسائٹی ہی میں یہ مشہور تھا کہ پرلے درجے کی مہمان نواز ہیں۔ مطلب یہ تھا کہ وہ ہر ہفتے بلاناغہ ایک پارٹی دیا کرتی تھیں جس میں شہر کی تمام اونچی شخصیتوں کو مدعو کیا جاتا تھا۔ میں ان کے یہاں جب بھی گیا بن بلائے گیا۔ وہ مجھے بہت اونچے درجے کا بدتمیز سمجھتی تھیں اور میں سمجھتا تھا کہ وہ بہت ہی اونچے درجے کی خاتون ہیں لیکن ان کے دل کا نچلا حصہ جہاں درد، منت کش دوا نہیں ہوتا۔ جہاں تیر تمام کش پر تیر نیم کش کو ترجیح دی جاتی ہے، سرے سے موجود نہیں تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک رات وہ ایک بن بلائی چوہیا کو دیکھ کر بے ہوش ہو گئیں اور یہ صدمہ انہیں تادمِ آخر رہا کہ ان کے گھر میں جہاں مچھر نکال دینے پر وہ دس ہزار روپے ہار دینے کے لئے تیار تھیں، ایک چوہیا نکل آئی۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ ایسے لوگوں میں حادثات کا مقابلہ کرنے کی تاب بالکل نہیں ہوتی۔ اس خاتون کی جگہ جن کا ذکر میں نے ابھی ابھی کیا ہے اگر کوئی ایسی عورت ہوتی جس کے دل کے نچلے حصے میں اگر خواہی حیات اندر خطرزی کا جذبہ موجزن ہوتا تو میں سمجھتا ہوں، اس رات محفل درہم برہم ہونے کی بجائے اور جم جاتی اور ایسے لطیفے ہوتے جو سب کو تادمِ آخر فرحاں و شاداں رکھتے۔

آپ یقین نہیں کریں گے مگر آپ کبھی ایسے میزبان کو جسے بن بلائے مہمانوں سے چڑ ہو، شیکسپیئر کے ڈرامے پڑھنے کے لئے دیجئے، دوسرے پڑھ پڑھ کر سر دھنیں گے مگر اس پر ذرہ برابر اثر نہیں ہوگا۔ اسی طرح فنونِ لطیفہ سے بھی ایسے شخص لطف اندوز ہو سکتے ہیں کیوں کہ ان میں شئے لطیف کی کمی ہوتی ہے۔ اگر یہ کمی نہ ہوتی تو وہ ان تمام لطافتوں کو سمجھ سکتے جو بن بلائے مہمانوں کی آمد کے ساتھ ان کے گھر میں داخل ہوتی ہیں۔

آپ کی اپنی بیوی کے ساتھ زبردست جنگ ہوئی ہے۔ وہ مصر تھی کہ میکے جائے گی اور ضرور جائے گی۔ آپ اس کے خلاف تھے۔ نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے

کہ آپ نے پورا ڈنر سیٹ غصے میں ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا تھا اور آپ کی بیوی اپنی نئی ساڑھی کی چندی چندی کر کے بیٹھی رو رہی تھی۔ آپ تین بار طلاق کہنے والے تھے دروازے پر دستک ہوئی یا زور سے گھنٹی بجی۔ آپ نے اٹھ کر دروازہ کھولا اور کیا دیکھا کہ میں اپنی بیوی سمیت کھڑا ہوں۔ آپ چلائے۔ ''ارے تم کہاں؟'' آپ نے پھر میری بیوی کی طرف دیکھا اور اپنے چہرے پر سے کدورت کے تمام آثار دور کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اس کو آداب عرض کیا۔ تھوڑی دیر ٹھٹکے پھر زور سے میرے کاندھے پر ہاتھ مارا اور کہا۔ ''چلو بھئی اندر، باہر سردی میں کیا کھڑے ہو''۔

چلئے صاحب، ہم اندر داخل ہو گئے۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پوچھا۔

''بیگم صاحب کہاں ہیں...... سو رہی ہیں؟'' آپ نے کھٹ سے جھوٹ بولا۔ ''نہیں اندر ہیں، ذرا طبیعت خراب ہے''۔ میری بیوی نے جھٹ سے برقع اتارتے ہوئے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔ ''ہائیں...... کیا ہوا دشمنوں کو؟'' آپ کی بیگم صاحبہ نے اندر کمرے میں یہ باتیں سنیں تو جلدی جلدی بچی ہوئی ساڑھی کی چندیاں بکس میں ڈالیں اور آنسو پونچھتے ہوئے باہر نکلیں اور جھٹ سے میری بیوی کو اپنے گلے لگا کر اور کچھ اس خوب صورتی سے اپنے بچے ہوئے آنسو نکالے کہ اس غریب کو رونا پڑا۔

رات بہت دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ میں نے ٹوٹے ہوئے ڈنر سیٹ کے متعلق پوچھا تو آپ کو ایک نہایت ہی دردناک داستان گھڑ کے سنانا پڑی کہ نوکر نے لاکھ منع کرنے پر بھی سارے برتن ایک ہی طشت میں اٹھائے اور اندھادھند میز کے ساتھ ٹکرا کر سب کے سب فرش پر گرا دیئے۔ غریب نوکر کو بھی آپ کے ساتھ گالیاں دیتا رہا۔ حالانکہ صاف دیکھ رہا تھا کہ سیٹ شکنی آپ ہی کا کام ہے کیوں کہ فرش پر گر کر پلیٹوں کے ٹکڑے الماری تک کیسے پہنچ سکتے ہیں۔

پھر سونے کے وقت آپ کی بیگم صاحبہ نے غلطی سے اپنا بکس کھولا اور میری بیوی دھنی ہوئی ساڑھی دیکھ کر چلائی۔ ''ہائیں بہن یہ کیا؟'' تو آپ کی بیگم صاحبہ کو ایک فرضی کہانی سنانا پڑی۔ ان کم بخت چوہوں نے تو ناک میں دم کر رکھا ہے۔ پچھلے مہینے میرا ساٹن کا سوٹ غارت ہوا۔ آج یہ نئی ساڑھی۔ تو گولیاں ڈالنا۔ تو ساڑھی کو غارت کرنے والی خود آپ کی بیگم ہیں کیوں کہ چوہے پھاڑتے نہیں بوٹیاں نوچتے ہیں لیکن وہ بے چاری آپ کی بیگم کو چوہے مارنے کی کئی ترکیبیں سمجھاتی رہی۔

ہم دس دن آپ کے یہاں رہے۔ آپ کو بہت کوفت ہوئی اس لئے کہ ہم بن بلائے مہمان تھے۔ کئی دفعہ ہم نے آپ میاں بیوی کو آپس میں ہمارے متعلق کھسر پھسر کرتے سنا کہ یہ کم بخت ٹلتے کیوں نہیں لیکن افسوس ہے کہ آپ نے ہماری بروقت آمد کے فوائد پر غور نہ کیا۔

میں ایسی ہزاروں مثالیں پیش کر سکتا ہوں۔

ایک صاحب کے یہاں ہم دس روز ٹھہرے۔ ان کی بیوی، ان کی دو سالیاں، ان کے تین بچے سب بلا کے چٹورے تھے۔ بلڈنگ کے اس حصہ سے کوئی بھی خوانچہ والا گزرے، ٹھہرا لیا جاتا تھا اور سینکڑوں روپے ہر ماہ یوں برباد کر دیئے جاتے۔ صاحب خانہ کو سخت شکایت تھی کہ کھانا کوئی نہیں کھاتا لیکن الم غلم چیزیں دن بھر کھائی جاتی ہیں۔ ہم صرف دس روز ان کے یہاں ٹھہرے۔ آپ یقین مانئے چوتھے روز ان سب کا چٹورا پن غائب ہو گیا اور وہ باقاعدہ گھر کا پکا ہوا کھانا کھانے لگے لیکن مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہماری آمد کے اس افادی پہلو کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے اور ہم پر بن بلائے مہمان کا لیبل چسپاں ہو گیا۔

بن بلائے مہمانوں کے متعلق میرا رویہ بہت ہی اچھا ہے۔ جو آتا ہے بڑے شوق سے آئے۔ جب جی چاہے آئے، ایک روز آئے، دس روز آئے، دس مہینے رہے۔ مجال ہے جو میرے ماتھے پر ہلکی سی شکن بھی آ جائے۔ زیادہ آ جائیں گے تو میں ان سے کہوں گا۔ دیکھیے جناب ہمارے پاس دو پلنگ ہیں۔ آپ اپنی عقل کے مطابق استعمال کر سکتے ہیں۔ ہماری فکر نہ کیجئے۔ صوفہ ہے اس پر سو جاؤں گا، گدا ہے اس پر میری بیوی آرام سے سو سکتی ہے، بچے ہیں ان کا بھی انتظام ہو جائے گا۔ وہ کہیں گے نہیں نہیں، اس قدر تکلیف کی کیا ضرورت ہیں تو میں کہوں گا بہتر...... آپ صوفہ اور گدا سنبھال لیجئے لیکن دیکھیے یہ ریڈیو میں اپنے کمرے میں لئے جاتا ہوں اس لئے کہ رات کو اگر آپ میں سے کوئی بجائے تو ممکن ہے باقیوں کو ناگوار معلوم ہو۔ جس چیز کی ضرورت ہو آپ باہر سے خود لا سکتے ہیں۔ سگریٹ والے کی دکان گلی کے نکڑ پر ہے، دودھ کا شوق ہے تو دس قدم اور آگے چلے جائیے گا، بڑا اچھا حلوائی ہے۔

جب تک جیب اجازت دے گی، میں اپنے مہمانوں کی خاطر تواضع کرتا رہوں گا لیکن جب وہ جواب دے جائے گی تو میں ان سے ایک روز اچانک کہوں گا۔ ”لیجئے جناب! آج سے تصویر کا دوسرا رخ شروع ہو گا۔ ہم آپ کے مہمان، آپ ہمارے میزبان۔ اور اگر معاملہ بہت ہی نازک صورت اختیار کر گیا تو ہم اپنے مہمانوں کو وہیں گھر چھوڑ کر کسی دوسرے کے یہاں بن بلائے مہمان چلے جائیں گے۔ اللہ اللہ، خیر صلا!

آخر میں ان لوگوں سے جو کہ بن بلائے مہمانوں سے خدا واسطے کا بیر رکھتے ہیں، میری درخواست ہے کہ وہ اور کچھ نہیں تو محض تفریح کے طور پر مہینے میں ایک بار کسی بن بلائے مہمان کو اپنے ہاں ضرور بلوایا کریں۔

●○●

(ریاض عاقب کوہلر)

بغداد پہ گزری ہے جو تاتار کے ہاتھوں
اپنا بھی وہی حال ہے سرکار کے ہاتھوں

دکھ درد کے انبار ہی ہر بار ملے ہیں
اِس یار کے ہاتھوں کبھی اُس یار کے ہاتھوں

آ جاؤ کہ فرقت نے لبِ گور کیا ہے
اب میری بقا ہے ترے دیدار کے ہاتھوں

اک تن ہی نہیں من بھی میاں ہار چکا ہوں
اس طور بکا ہوں میں خریدار کے ہاتھوں

مقتل جو مقدر ہے تو پھر فکر کہاں کی
اب تیر سے مرتا ہوں یا تلوار کے ہاتھوں

عاقبؔ پہ جو گزری تمھیں معلوم کہاں ہے
گفتار کے ہاتھوں ترے اطوار کے ہاتھوں

تحریکِ آزادی کا ایک دل گداز باب

یکم دسمبر 1826ء کی شام ابھی گہری نہیں ہوئی تھی۔ سلطنتِ مغلیہ کا سورج کبھی کا ڈوب چکا ہے۔ قلعے جو مغلوں نے تعمیر کئے تھے، وہ اُن کے مقبروں کی طرح اداس اور خاموش تھے۔ ان میں ایک قلعہ لاہور تھا جسے شاہی قلعہ کہتے ہیں۔ اب یہ قلعہ سکھوں کے قبضے میں تھا۔ اس کا قلعہ دار اودھم سنگھ قلعے کے اندر روزمرہ معمول کے مطابق ٹہل رہا تھا۔ دو محافظ اس کے ساتھ تھے۔ ایک سکھ دوڑتا آ رہا تھا۔ محافظوں نے آگے ہو کر اُسے روک لیا اور پوچھا کہ وہ قلعہ دار کی طرف کیوں دوڑا آ رہا ہے۔ اُس نے بتایا کہ وہ قلعے کا قاصد ہے۔

''آنے دو اسے''۔ قلعہ دار اودھم سنگھ نے حکم دیا۔ ''اِدھر آ اوئے...... کیوں آئے ہو''۔

''ایک مسلمان کو پکڑا ہے مہاراج!'' قاصد نے آ کر کہا۔ ''وہ کہتا ہے میں اسلامی فوج کا قاصد ہوں اور مہاراجہ کے لئے پیغام لایا ہوں۔ آپ کی اجازت کے بغیر اُسے مہاراجہ کے سامنے نہیں لے جا سکتا تھا''۔

''اسلامی فوج؟'' اودھم سنگھ نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ ''کون سی اسلامی فوج؟...... اوہ...... یہ پشاور کے پٹھان خوانین کا قاصد ہوگا''۔ اس نے رعونت سے کہا۔ ''ان کے قاصد کو گرفتار کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ صلح کا پیغام لایا ہوگا۔ ایسے کمزور لوگوں کے قاصد سے ڈر کیسا!...... چلو، میں آتا ہوں''۔

وہ اس جگہ پہنچا جہاں سکھ سپاہیوں نے ایک مسلمان کو گرفتار کر رکھا تھا۔ کم و بیش بیس سکھ تلواریں سونتے ایک جواں سال مسلمان کو گھیرے میں لئے ہوئے تھے۔ قلعہ دار اودھم کو دیکھ کر انہوں نے گھیرا کھلا کر دیا۔ اودھم سنگھ نے دیکھا کہ بیس بائیس سال عمر کا ایک مسلمان جس کی رنگت گوری تھی، کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اُس کی تلوار اُس کی نیام میں تھی۔ اودھم سنگھ کے چہرے پر خفت کا تاثر آ گیا۔ اُس نے جتھے دار کاہن سنگھ کی طرف غصیلی نگاہوں سے دیکھا۔

''مہاراج!'' کاہن سنگھ نے قلعہ دار کی آنکھوں میں غصہ اور سوال بھانپ کر کہا۔ ''یہ مہاراجہ سے ملنا چاہتا ہے مگر اپنی تلوار سے ہمارے حوالے نہیں کرتا''۔

''کیا نام ہے تمہارا؟'' اودھم سنگھ نے اس جواں سال مسلمان سے پوچھا۔ ''کہاں سے آئے ہو؟''

''میرا نام ہمت خان ہے''۔ مسلمان نے جواب دیا۔ ''میں اپنے سالارِ اعلیٰ سیّد احمد کا پیغام مہاراجہ رنجیت سنگھ کے نام لے کر آیا ہوں''۔

''اوہ، سیّد احمد''۔ اودھم سنگھ نے بے نیازی سے کہا۔ جیسے سیّد احمد کو کچھ سمجھتا ہی نہ ہو۔ اُس نے کہا۔ ''کیا وہ چند ایک آدمیوں کو ساتھ ملا کر سالارِ اعلیٰ بن گیا ہے؟''

''وہ کچھ بھی ہے، میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے نام اُن کا پیغام لایا ہوں''۔ ہمت خان نے کہا اور اپنے گرد سکھوں کے گھیرے کو دیکھ کر بولا۔ ''آپ کا کوئی حقیر آدمی بھی ہمارے ہاں آ جائے تو ہم اُس کے ساتھ یہ سلوک نہیں کریں گے جو میرے ساتھ ہو رہا ہے''۔

''یہ قلعہ ہے نوجوان!'' اودھم سنگھ نے کہا۔ ''ہمارے کچھ قاعدے قانون ہیں۔ ہم تمہیں مہاراجہ سے ملوا دیں گے لیکن تمہیں اپنی تلوار ہمارے حوالے کرنی پڑے گی''۔

''کچھ قاعدے قانون ہمارے بھی ہیں''۔ ہمت خان نے کہا۔ ''ہمارا مذہب ہتھیار دشمن کے حوالے کرنے کو گناہ کہتا ہے۔ میں آپ کے مہاراجہ کو قتل کرنے نہیں آیا، انہیں پیغام دینے آیا ہوں''۔

''کیا پیغام دوستی کا ہے؟'' اودھم سنگھ نے پوچھا۔ ''مسلمان اب دوستی کا ہاتھ بڑھانے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے''۔

''اس کا انحصار مہاراجہ رنجیت سنگھ کے جواب پر ہے''۔ ہمت خان نے کہا۔ ''لیکن مجھے زیادہ بات کرنے کا حکم نہیں۔ مجھے صرف پیغام دینا ہے''۔

''تم آج رات ہمارے مہمان ہو گے''۔ اودھم سنگھ نے کہا۔ ''کل تمہیں مہاراجہ کے سامنے لے جایا جائے گا''۔ اُس نے جتھے دار کاہن سنگھ سے کہا۔ ''اسے مہمان خانے پہنچا دو اور خیال رکھو کہ اس کے ساتھ کوئی بدتمیزی نہ ہو۔ اس کی تلوار اس کے پاس رہے گی''۔

اودھم ہمت خان کو مہمان خانے بھجوا کر رنجیت سنگھ کے پاس چلا گیا۔ اُس وقت رنجیت سنگھ کوئی سنجیدہ بات سننے اور سمجھنے کی حالت میں نہیں تھا۔ اُس کے سامنے شراب رکھی تھی اور تین چار درباری مے نوشی میں اُس کا ساتھ دے رہے تھے۔ اودھم سنگھ کو دیکھ کر اُس نے بازو پھیلا کر کہا۔ ''ہمارا قلعہ دار بھی آ گیا ہے''۔

اودھم سنگھ بیٹھ گیا مگر مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ساتھ اُس نے قہقہہ نہ لگایا۔

''مہاراج جی!'' اُس نے رنجیت سنگھ سے کہا۔ ''کیا یہ سیّد احمد وہی ہے جس کا آپ نے اُس روز ذکر کیا تھا؟...... آپ نے کہا تھا کہ سیّد احمد ہندوستان کا رہنے والا ہے اور اب قندھار سے پشاور پہنچا ہے۔ آپ نے بتایا تھا کہ وہ کوئی عالم نہیں جادوگر ہے۔ جدھر جاتا ہے وہاں کے مسلمان اُس کے ہاتھ پر بیعت کرتے اور اُس کی فوج میں شامل ہو جاتے ہیں''۔

''کیا یہ بات کرنے کا تمہیں یہی وقت ملا تھا اودھم سنگھ؟'' مہاراجہ رنجیت سنگھ نے کہا۔ ''تم نے کوئی نئی بات تو نہیں سن لی؟ ہم سیّد احمد کو اس قابل نہیں سمجھتے کہ اس وقت اُس کا ذکر کریں''۔

''نئی بات یہ ہے مہاراج جی!'' اودھم سنگھ نے کہا۔ ''کہ اُس کا قاصد کوئی پیغام لے کر آیا ہے۔ قاصد کہتا ہے کہ وہ اپنی تلوار سمیت آپ کے سامنے آئے گا''۔

''کیا تم مسلمانوں کی صرف ایک تلوار سے ڈرتے ہو؟'' مہاراجہ رنجیت سنگھ نے کہا۔ ''اُسے صبح دربار میں پیش کرنا۔ اُس سے تلوار نہ لینا...... اور دیکھو اودھم سنگھ! سیّد احمد سے اتنا ڈرنے کی ضرورت نہیں جتنا تم سوچ رہے ہو''۔

OOO

اودھم سنگھ کی مزاجی کیفیت میں ذرا سی بھی تبدیلی نہ آئی۔ وہ اٹھ کر چلا گیا اور مہمان خانے جا پہنچا۔ اُس نے دیکھا کہ ہمت خان نماز پڑھ رہا ہے۔ اودھم سنگھ اُسے دیکھتا رہا۔ ہمت خان نے نماز ختم کر کے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے پھر ہاتھ منہ پر پھیر کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اودھم سنگھ کو دیکھ کر وہ حیران سا ہوا۔ اودھم سنگھ بیٹھ گیا۔

''میں تمہارے سالارِ اعلیٰ سیّد احمد کے متعلق کچھ معلوم کرنا چاہتا ہوں''۔ اودھم سنگھ نے کہا۔ ''میں نے اُس کے متعلق کچھ باتیں سنی ہیں''۔

''آپ کو مجھ سے یہ امید نہیں رکھنی چاہئے کہ میں آپ کو ہر وہ بات بتا دوں گا جو مجھے نہیں بتانی چاہئے''۔ ہمت خان نے کہا۔ ''آپ نے میری عزت افزائی کی ہے لیکن میں آپ کو اپنا دوست نہیں کہہ سکتا۔ میں آپ کو یہ نہیں بتا سکتا کہ ہماری فوج کتنی ہے، ہمارے ہتھیار کیسے ہیں اور ہمارا لڑنے کا طریقہ کیا ہے۔ میں آپ کو اپنے سالارِ اعلیٰ سیّد احمد کے متعلق بتا دوں گا کہ وہ کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں''۔

''میں یہی جاننا چاہتا ہوں''۔ اودھم سنگھ نے کہا۔

''آپ کو میری باتیں اچھی نہیں لگیں گی''۔ ہمت خان نے کہا۔ ''یہ مذہب کا معاملہ ہے اور ہر کوئی اپنے مذہب کو سچا سمجھتا ہے۔ پھر بھی آپ جو کچھ جاننا چاہتے ہیں وہ میں آپ کو بتا دیتا ہوں۔ اُن کا نام سیّد احمد ہے۔ ہندوستان کے شہر بریلی کے رہنے والے ہیں۔ اللہ نے انہیں رُوح کی روشنی دی ہے، اشارہ دیا ہے اور انہیں ایک منزل دکھائی ہے جو حق اور صداقت کی منزل ہے۔ سیّد احمد عالم دین ہیں لیکن وہ حجرے میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرنے والے اور منبر پر کھڑے ہو کر وعظ کرنے والے عالم نہیں۔

وہ اللہ کی راہ میں جہاد کا سبق دیتے ہیں۔ مسلمان کے لئے جہاد عبادت ہے۔ ہندوستان اسلامی ملک ہے۔ مسلمان بادشاہ اللہ کی راہ سے بھٹک گئے تو آپ نے دیکھا ہے کہ یہاں اسلام کا پرچم سرنگوں ہو گیا اور اس ملک پر سمندر پار سے آیا ہوا فرنگی قابض ہوتا چلا جا رہا ہے......

"سیّد احمد نے ہمیں سبق دیا ہے کہ قرآن کی رُو سے مسلمان کسی کا غلام نہیں ہو سکتا کیونکہ غلامی میں اسلام کی رُوح مر جاتی ہے۔ سیّد احمد ہندوستان میں اللہ کی حکمرانی قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اس وقت ملک کے حالات ایسے ہیں کہ جہاد لازمی ہو گیا ہے۔ چنانچہ وہ صرف جہاد کا سبق دیتے ہیں۔ کفار کو وہ حق کی دعوت دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان پر انسان کا قانون نہیں اللہ کا قانون چلے گا۔ ہمارے سالارِ اعلیٰ وہی کہتے ہیں جو قرآن میں لکھا ہے۔ وہ گاؤں گاؤں، نگر نگر گھوم آئے ہیں۔ سب سے پہلے مسلمانوں کو اپنا پیغام دیتے اور انہیں اللہ کا راستہ دکھاتے ہیں۔ انہیں کہتے ہیں کہ کفر کے خلاف جنگ ایک عبادت ہے اور اللہ کی راہ میں تیغ زنی کے بغیر دین کا علم مکمل نہیں ہو سکتا......

"وہ جہاں جاتے ہیں وہاں کے مسلمان اُن کے مرید ہو جاتے ہیں۔ اُن کی آواز میں ایسا جادو ہے کہ کوئی مسلمان اُن کے کہنے کو ٹال نہیں سکتا۔ اُن کی زبان میں خدا کی آواز ہے۔ بے شمار غیر مسلم بھی ان کے ہاتھ پر بیعت کر کے مسلمان ہو گئے ہیں...... میں عالم نہیں، حقیر انسان ہوں۔ میں اُن کی طرح بات نہیں کر سکتا اس لئے آپ کو میری زبان میں وہ جادو نظر نہیں آئے گا۔ میری زبان میں وہ اثر نہیں۔ آپ کبھی اُن کی زبان سنیں تو آپ کہیں گے کہ یہ انسان نہیں خدا بول رہا ہے، پھر آپ بھی میری طرح تیروں کی بارش میں بھی اور دشمن کی تلواروں کے سائے میں بھی نماز پڑھنے کی خواہش کریں گے اور اللہ کی راہ میں لڑنے اور جان دینے کی کوشش کریں گے۔ اگر آپ مجھ سے پوچھیں گے کہ ہمارے لڑنے کا طریقہ کیا ہے تو میں صرف یہ جواب دوں گا کہ ہم اللہ کے بھروسے پر لڑتے ہیں"۔

سکھ کوئی قوم نہیں تھی۔ یہ ایک قبیلہ تھا جس کی تاریخ میں حکمرانی اور جنگ و جدل کا نام و نشان نہیں ملتا تھا اس لئے وہ فنِ حرب و ضرب سے عاری تھے۔ البتہ لڑنا جانتے تھے کیونکہ ان کا پیشہ ڈاکہ زنی اور رہزنی تھا۔ یہ جرائم وہ گروہوں کی صورت میں کرتے تھے۔ سلطنتِ مغلیہ کے خاتمے کے بعد ہندوستان کی کیفیت دگرگوں تھی۔ انگریز پاؤں جمانے کی کوشش کر رہے تھے۔ کوئی حکومت نہیں تھی۔ اس افراتفری سے سکھوں نے فائدہ اٹھایا اور پنجاب پر قابض ہو گئے۔ ان کا دورِ حکومت جس کی طوالت صرف چالیس سال تھی، انگریزوں اور مسلمانوں سے لڑائیاں لڑتے گزر گیا۔ مسلمانوں کو سیّد احمد شہید نے تحریک مجاہدین کے پلیٹ فارم پر متحد کیا تھا۔

سکھوں میں اگرچہ فہم و فراست کی کمی اور خودسری اور سرکشی زیادہ تھی لیکن لاہور قلعے کا کماندار اودھم سنگھ سنجیدہ ذہن کا آدمی تھا۔ وہ سوچنا سمجھنا جانتا تھا۔ اُس نے سیّد احمد شہید کے قاصد سے اُن کے نظریات سنے تو وہ ان کا مذاق اڑانے کی بجائے خاموشی سے مہمان خانے سے نکلا۔ اُس کا جھکا ہوا سر اور چلنے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ گہری سوچ میں کھویا ہوا ہے۔

OOO

اگلی صبح مہاراجہ رنجیت سنگھ شاہانہ تخت پر بیٹھا تھا۔ یہ تخت کسی مسلمان بادشاہ کی یادگار تھا۔ رنجیت سنگھ کے چہرے پر فرعونیت تھی۔ اس کا دربار اُن روایتی بادشاہوں جیسا تھا جن سے تاریخ بھری پڑی ہے۔ رنجیت سنگھ کے سامنے بیٹھے ہوئے درباریوں، پیچھے کھڑے محافظوں اور رانی پر سناٹا طاری تھا کیونکہ مہاراجہ کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ خشمگیں ہے۔ وہ دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے کسی

کا منتظر ہو۔

ہمت خان دربار میں داخل ہوا۔ اُس کے دائیں اور بائیں دو سکھ لمبی برچھیاں اٹھائے آ رہے تھے۔ ہمت خان رنجیت سنگھ کے سامنے جا رکا اور بولا۔ ''السلام علیکم''۔

مہاراجہ نے سر کو جھٹکا دے کر درباریوں اور محافظوں پر نظریں دوڑائیں اور گرج کر پوچھا۔ ''اسے کسی نے بتایا نہیں کہ یہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کا دربار ہے جہاں آنے والا جھک کر سلام کرتا ہے؟''

''مہاراجہ!'' ہمت خان نے کہا۔ ''کوئی مجھے بتاتا تو بھی میں جھک کر سلام نہ کرتا۔ میں یہی پیغام لے کر آیا ہوں کہ کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ وہ کسی انسان کو اپنے سامنے جھکائے۔ اللہ کے بندے صرف اللہ کے سامنے جھکا کرتے ہیں''۔

''میں وہ پیغام جو تم سیّد احمد کا لائے ہو سن کر تمہاری قسمت کا فیصلہ کروں گا''۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے کہا۔ ''کیا تمہیں یہاں بھیجنے والے نے بتایا نہیں کہ رنجیت سنگھ کے دربار کے نام سے انگریز اور پٹھان کانپتے ہیں؟ تم کمسن ہو۔ تم میں جوانی کی نادانی اور جوش ہے''۔ اس نے گرج کر کہا۔ ''پیغام کیا ہے؟''

ہمت خان نے گول کیا ہوا کاغذ کھولا اور بلند آواز سے پڑھنے لگا۔

''خدا کے حقیر بندے سیّد احمد کا پیغام، پنجاب کے حاکم مہاراجہ رنجیت سنگھ کے نام...... میں تمہارے سامنے تین صورتیں رکھتا ہوں۔ پہلی یہ کہ اسلام قبول کرلو، پھر تم ہمارے بھائی اور ہمارے مساوی ہو گے لیکن اس میں کوئی جبر نہیں۔ دوسری صورت یہ کہ اسلام قبول نہ کرو۔ ہماری اطاعت قبول کرلو اور جزیہ ادا کرتے رہو۔ اس صورت میں تمہارے جان و مال کی حفاظت ایسے ہی کریں گے جیسے ہم اپنے جان و مال کی کرتے ہیں اور تیسری صورت یہ کہ اگر تمہیں یہ دونوں صورتیں منظور نہ ہوں تو لڑنے کے لئے تیار ہو جاؤ اور سن لو کہ سارا یاغستان اور ملک ہندوستان کا ہر ایک مسلمان ہمارے ساتھ ہے۔ تمہیں شراب سے اتنی محبت نہیں جتنی ہمیں شہادت سے ہے۔...... سیّد احمد۔ سالارِ اعلیٰ لشکر مجاہدین''۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ پھنکارنے لگا۔ محافظوں کے ہاتھ کرپانوں کے دستوں پر چلے گئے۔ درباری اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہمت خان جس کے چہرے پر سلیقے سے تراشی ہوئی چھوٹی چھوٹی داڑھی تھی، ہونٹوں پر مسکراہٹ لئے رنجیت سنگھ کے سامنے کھڑا تھا۔ اُس کی نظریں بڑی آہستہ آہستہ تمام دربار میں گھومنے لگیں۔ وہ ہر سکھ کا چہرہ اور ہاتھ کرپان کے دستے پر دیکھتا گیا۔ درباری حکم کے انتظار میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ صرف ایک سکھ تھا جس کا چہرہ بے تاثر تھا اور وہ یوں بیٹھا رہا جیسے اس منظر کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہ ہو۔ وہ قلعہ دار اودھم سنگھ تھا۔

''یہ لڑکا بڑی دور سے آیا ہے''۔ رنجیت سنگھ نے کہا۔ ''میں اس کی ماں پر رحم کرتا ہوں۔ اسے قتل نہ کیا جائے۔ اس کا سر، داڑھی اور مونچھیں بالکل مونڈھ کر اسے لاہور سے نکال دیا جائے''۔

کاہن سنگھ جتھے دار نے ہمت خان کے عقب سے جھپٹا مارا اور اُس کی تلوار نیام سے کھینچ لی۔ پانچ چھ محافظوں نے ہمت خان کو گھیرے میں لے لیا اور اُسے دھکیلتے ہوئے دربار سے لے گئے۔

''سیّد احمد''۔ رنجیت سنگھ نے طنزیہ کہا۔ ''سیّد احمد...... یہ ملیچھ مُسلے برباد ہو گئے ہیں مگر ابھی تک ان کے دماغ سے ہندوستان کی بادشاہی نہیں نکلی۔ مولویوں کی طرح وعظ کرنے والا سیّد احمد خالصہ راج سے ٹکر لینے آیا ہے۔ اُسے کسی نے بتایا نہیں کہ اب راج کرے گا خالصہ''۔

''مہاراج!'' اودھم سنگھ نے کہا۔ ''بغیر دیکھے، بغیر

جانے دشمن کو کمزور نہ سمجھیں۔ قاصد نوشہرہ سے آیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کا لشکر نوشہرہ تک آ گیا ہے۔ سید احمد نے شاید ٹھیک ہی لکھا ہو کہ تمام یاغستانی اُس کے ساتھ ہیں۔ مجھے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ ہندوستان اور پنجاب کے مسلمان بھی نوشہرہ اور پشاور جا رہے ہیں۔ سید احمد نے ان میں کوئی اور ہی روح پھونک دی ہے۔ ہمیں وہاں پیش بندی کر لینی چاہئے، نہیں تو خالصہ راج زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکے گا۔ ہمیں مسلمانوں کو اکوڑہ اور نوشہرہ کی پہاڑیوں میں لڑانا چاہئے۔ اگر وہ لاہور کے میدانوں میں آ گئے تو وہ لڑائی میں سہولت محسوس کریں گے“۔

”بدھ سنگھ اس وقت کہاں ہوگا؟“ رنجیت سنگھ نے پوچھا۔ ”اُس کے ساتھ کتنا لشکر ہے؟“

”وہ دریا کے اُس طرف ہے“۔ دیوان نے اٹھ کر جواب دیا۔ ”اُس کے ساتھ تقریباً سات ہزار نفری ہے“۔

”کافی ہے“۔ رنجیت سنگھ نے کہا۔ ”نہایت اچھے گھوڑے پر قاصد کو ابھی دوڑا دو۔ بدھ سنگھ کو پیغام دو کہ فوراً اکوڑہ پہنچ جائے اور کسی موزوں جگہ پر خیمہ زن ہو جائے لیکن لشکر کو تیاری کی حالت میں رکھے اور وہاں کے کسی مسلمان کو بھیج کر معلوم کرے کہ سید احمد کے ساتھ کتنی نفری ہے۔ بدھ سنگھ اپنے فیصلے خود کرے اور سید احمد کے لشکر کو ختم کرے“۔

OOO

ہمت خان کو دربار سے نکال کر کاہن سنگھ لے جا رہا تھا۔ اُس کے ساتھ تین سکھ سپاہی تھے۔ ہمت خان اب نہتہ تھا۔ کاہن سنگھ کو اُس پر بہت غصہ آ رہا تھا کیونکہ ہمت خان قلعے میں داخل ہوا تھا تو کاہن سنگھ کے کہنے پر اُس نے کاہن سنگھ کو اپنی تلوار نہیں دی تھی۔ اُس نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ اسے بڑے دروازے کے پاس لے چلو اور ایک آدمی جا کر نائی کو لے آئے۔ کاہن سنگھ حیران تھا کہ ہمت خان منت سماجت کیوں نہیں کرتا کہ اس کی داڑھی کو نہ چھیڑا جائے اور وہ مسکرا کیوں رہا ہے؟

”اوئے مُسلے!“ کاہن سنگھ نے ہمت خان کے پہلو میں ہلکا سا گھونسہ مار کر کہا۔ ”تُو مہاراجہ سے معافی کیوں نہیں مانگ لیتا؟ میرے پاؤں پڑ، میں شاید تجھے معاف کر کے قلعے سے نکال دوں“۔

ہمت خان مسکرا کر کہا۔ ”اللہ کی راہ میں ہمارے بازو اور ٹانگیں کٹ جاتی ہیں تو بھی ہم افسوس نہیں کیا کرتے یہ تو بال ہیں“۔ اُس نے آسمان کی طرف دیکھا اور وہ ہنس پڑا۔

کاہن سنگھ پریشان ہو گیا۔ اُس نے ہمت خان کو دروازے کے قریب روک لیا اور ایک سپاہی کو نائی کو لانے کے لئے بھیج دیا۔ قلعے کا دروازہ کھلا۔ دو سوار اندر آئے۔ گھوڑوں سے اتر کر انہوں نے گھوڑے وہیں رہنے دیئے۔ وہ دروازے پر کھڑے سنتری سے کچھ پوچھنے کے لئے رُک گئے۔ دروازہ ابھی بند نہیں ہوا تھا کیونکہ دو بیل گاڑیاں آ رہی تھیں۔ ہمت خان نے کاہن سنگھ کو بے خبر دیکھا تو وہ دوڑ پڑا۔ گھوڑے پندرہ بیس قدم دور تھے۔ ہمت خان اُسی رفتار سے دوڑتا اوپر کو اچھلا اور ایک گھوڑے کی پیٹھ پر جا پڑا۔ اُس نے لگام کو دروازے کی طرف جھٹکا دیا اور ایڑ لگائی۔ گھوڑا ہوا ہو گیا۔

کاہن سنگھ نے شور مچایا اور دوسرے گھوڑے پر سوار ہو کر ہمت خان کے پیچھے گیا۔ اس کے پیچھے دو سپاہی گھوڑوں پر سوار ہو کر گئے لیکن ہمت خان دور نکل گیا تھا۔ اُس کے لئے خطرہ یہ تھا کہ نہتہ تھا۔ دوسرا خطرہ یہ کہ فوجوں کے پاس توڑے دار رائفلیں بھی آ گئی تھیں جو سامنے سے بارود اور چھرے بھر کر فائر کی جاتی تھیں۔ اُس کے تعاقب میں آنے والے اُس پر فائر کر سکتے تھے۔ وہ عام راستے سے ہٹ گیا۔ اُس زمانے میں راوی تک کا علاقہ گھنا جنگل تھا۔ وہ اس جنگل میں دوسری سمت چلا گیا۔ چونکہ

سردیوں کا موسم تھا اس لئے جہاں کہیں سے دریا کا پاٹ چوڑا تھا وہ پانی زیادہ گہرا نہیں تھا۔ ہمت خاں نے جنوب کی طرف دور جا کر گھوڑا دریا میں ڈال دیا۔ اُس کے سامنے بڑا لمبا سفر تھا۔

OOO

اٹک سے پشاور تک کے علاقے پر سکھوں کی حکمرانی تھی۔ یہ حکمرانی نہیں بلکہ لوٹ کھسوٹ، ظلم وتشدد، بے گار اور اندھیر نگری تھی۔ سکھوں نے اس علاقے کو تقسیم کر کے ٹھیکے پر دے رکھا تھا۔ یہ ٹھیکیدار لوگوں سے مالیہ، لگان اور کئی اقسام کے ٹیکس وصول کرتے اور سکھوں کا خزانہ بھرتے تھے۔ جہاں کہیں لوگ متحد ہو کر بغاوت کرتے سکھ فوج جس کے جتھے جگہ جگہ موجود رہتے تھے، بغاوت یا شورش کے مقام پر ٹوٹ پڑتے۔ وہاں کوئی مسلمان محفوظ نہیں رہتا تھا۔ فوج کے جانوروں کے لئے چارہ لوگوں کے کھیتوں سے کاٹ لیا جاتا۔ لوگ اناج باہر گڑھے کھود کر ان میں چھپا دیتے تھے۔ کسی مسلمان کی عزت محفوظ نہیں تھی۔ عورتوں کو گھروں میں بند رکھا جاتا۔

درانیوں اور پٹھانوں کو یہ سزا ان کے آپس کے نفاق کی پاداش میں مل رہی تھی۔ وہ آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے تھے۔ آپس میں عداوت کی وجہ سے ان پر سکھ غالب آ گئے تو بھی انہوں نے متحد ہونے کی نہ سوچی بلکہ ایک دوسرے کو زک پہنچانے کے لئے انہوں نے سکھوں کی چاپلوسی شروع کر دی اور اپنے مسلمان بھائیوں کو نقصان پہنچانے لگے۔ یہ صورت حال سکھوں کی حکومت کے لئے سودمند تھی۔ انہوں نے پٹھانوں میں اپنے لئے غدار پیدا کر لئے۔

عداوتیں سرداروں کی تھیں سزا لوگوں کو مل رہی تھی۔ پٹھان عوام سکھوں کو اپنا حاکم تسلیم نہیں کرتے تھے لیکن اتحاد اور قیادت کے بغیر وہ ظلم وتشدد سہنے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ان حالات میں سید احمد شہید اس علاقے میں آئے۔ انہوں نے دیکھا کہ بہت سے لوگ اپنے کنبوں کو ساتھ لے کر پہاڑیوں میں جا چھپے اور کسمپرسی کی زندگی گزار رہے تھے۔ سیّد احمد شہید نے ان لوگوں کو سکھوں کے خلاف اتحاد کی دعوت دی۔ لوگوں نے سُکھ کا سانس لیا۔ مسجدوں سے ایک بار پھر اذانوں کی اور کلمہ طیبہ کی بلند آوازیں سنائی دینے لگیں۔

OOO

ہمت خاں جب نوشہرہ پہنچا اُس وقت وہ نیم جاں تھا۔ اس کا چہرہ لاش کی مانند تھا۔ اُسے فوراً سیّد احمد شہید کے پیش کیا گیا۔ اُس نے ہانپتے کانپتے بتایا کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اُن کے پیغام اور پیغام لے جانے والے کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ سیّد احمد شہید نے اُسی وقت جنگ کی تیاری کا حکم دے دیا۔

اُسی روز بدھ سنگھ کی خیمہ گاہ میں جو اٹک کے کہیں قریب تھی، لاہور کا سکھ قاصد پہنچا اور بدھ سنگھ کو مہاراجہ رنجیت سنگھ کا حکم نامہ دیا کہ سیّد احمد اور اُس کے مریدوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے اور اگر وہ فوج کی صورت میں منظم ہوں تو حملہ کر کے انہیں ختم کر دیا جائے۔

بدھ سنگھ نے اس سے پہلے ہی اپنا قاصد لاہور کو دوڑا دیا تھا۔ وہ رنجیت سنگھ کے دربار میں پہنچ چکا تھا۔ اُس نے سیّد احمد شہید کی سرگرمیوں کی اطلاع دے دی تھی۔ بدھ سنگھ نے پیغام بھیجا کہ سیّد احمد نام کے جس آدمی کے چرچے ہم نے پہلے سنے تھے وہ نوشہرہ تک آ گیا ہے۔ ہمارے وفادار مسلمان سرداروں نے اُس کے متعلق جو خبریں دی ہیں انہیں ہم معمولی نہیں کہہ سکتے اور اس شخص کو ہم عالم، صوفی یا درویش بھی نہیں کہہ سکتے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ وہ جنگجو ہے اور وہ کابل، قندھار اور گردونواح کے علاقوں میں فن سپہ گری کے کمال دکھا چکا ہے۔ مجھے مخبروں نے بتایا ہے کہ سیّد احمد نے لاہور دربار کو کوئی پیغام بھیجا ہے۔ اگر آپ نے اس پیغام کو قبول کیا تو یہ خالصہ راج کی

موت کا باعث ہوگا اور اگر قاصد کو دھتکار دیا تو مسلم ان سیّد احمد کے جھنڈے تلے ہم پر حملہ کریں گے۔ پٹھان اس جھنڈے تلے جمع ہو رہے ہیں۔

بدھ سنگھ نے پیغام میں کہا کہ اکوڑہ کا رئیس امیر خان خٹک ہمارا مخالف ہے لیکن اُس کے بھائی فیروز خان کا بیٹا خواص خان امیر خان کے خلاف ہو گیا ہے۔ اس نے مجھے اکوڑہ بلایا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ میں اپنا لشکر اکوڑہ کے قریب خیمہ زن کروں اور اُس کے چچا امیر خان خٹک اور سیّد احمد کو وہیں ختم کروں۔

بدھ سنگھ نے پیغام میں مہاراجہ رنجیت سنگھ سے درخواست کی کہ اُسے لاہور سے فوراً کمک بھیجی جائے کیونکہ سیّد احمد سے لڑائی کے دوران یا اس کے بعد ہمارے وفادار پٹھان سرداروں میں سے ایک دو نے بھی بغاوت کر دی تو میرے لئے بڑی مشکل پیدا ہو جائے گی۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اُس وقت لاہور کے قلعہ دار اودھم سنگھ اور اپنے ایک اور کماندار ہری سنگھ کو طلب کیا اور انہیں بدھ سنگھ کا پیغام سنا کر حکم دیا کہ انتہائی تیز رفتار سے کمک لے کر اکوڑہ راوانہ ہو جائیں۔

جب سیّد احمد جنگ کی تیاری کا حکم دے رہے تھے اُس وقت بدھ سنگھ اکوڑہ خٹک کے قریب پہنچ گیا تھا اور اودھم سنگھ اور ہری سنگھ اپنے دستوں کے ساتھ اٹک کے قریب دریا عبور کر رہے تھے۔ سیّد احمد شہید کے لئے یہ جگہ نئی تھی۔ لوگ اُن کی پکار پر ان کے گرد جمع ہوئے تھے لیکن سید احمد شہید محتاط تھے کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ ان لوگوں کی وفاداریاں مشکوک ہیں اور ان میں گھر کے بھیدی اور غدار بھی ہوں گے۔ سید احمد شہید نہیں چاہتے تھے کہ میدانِ جنگ میں جب وہ دشمن سے گتھم گتھا ہو چکے ہوں ان کا کوئی اپنا بھائی اُن کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دے۔ چنانچہ نئے لوگوں کی جانچ پڑتال میں بہت دن لگ گئے۔

سیّد احمد نے جو فوج تیار کی اس کی تعداد (مؤرخین کے مطابق) صرف ڈیڑھ ہزار تھی۔ سکھوں کی نفری سات ہزار بھی لکھی گئی ہے اور دس ہزار بھی۔ اس میں اودھم سنگھ اور ہری سنگھ کی کمک بھی شامل تھی۔ سیّد احمد شہید نے اپنی اس قلیل جمعیت کو حسبِ معمول چار حصوں میں تقسیم کیا۔ دائیں جانب مولوی محمد یوسف کی جماعت تھی۔ بائیں بازو پر سیّد محمد یعقوب کی جماعت کو رکھا گیا لیکن اکوڑہ کی جنگ میں سید یعقوب نہیں تھے اس لئے قیادت اُن کے نائب شیخ بڈھن کو دی گئی۔ ہراول میں مولوی محمد اسماعیل تھے۔ چوتھی جماعت اللہ بخش خان کی قیادت میں تھی جو جمعدار اللہ بخش کے نام سے مشہور ہوئے۔

21 دسمبر 1826ء (20 جمادی الاوّل 1242ھ)

سیّد احمد شہید نے اپنے ان چاروں کمانڈروں کا اجلاس بلایا جو ظہر کی نماز کے بعد شروع ہوا۔

OOO

اس اجلاس میں چاروں کمانڈروں کے علاوہ مجلس مشاورت کے ارکان بھی موجود تھے۔ سیّد احمد شہید نے حاضرین کو بتایا۔ ”ہمارے مخبروں نے اطلاع دی ہے کہ سکھوں کی نفری دس ہزار کے لگ بھگ ہے۔ انہوں نے اپنی خیمہ گاہ کے اردگرد پتھروں کی فصیل کھڑی کر دی ہے جسے یہ لوگ سنگھر کہتے ہیں۔ اس کے ساتھ انہوں نے خاردار جھاڑیاں اتنی زیادہ رکھ دی ہیں جن میں گھوڑے بھی نہیں گزر سکتے۔ سنگھر ایک گز سے ذرا اونچا ہے۔ سکھ اپنی خیمہ گاہوں کو اس طرح محفوظ کیا کرتے ہیں۔ ان کی خیمہ گاہ کے ایک طرف دریا ہے۔ ہماری کل تعداد ڈیڑھ ہزار ہے۔ اپنے اللہ کے اس فرمان کو نہ بھولنا کہ تم اگر ایمان والے اور ثابت قدم رہے تو تم میں سے بیس دو سو پر غالب آئیں گے۔ مسلمانوں کی تعداد ہمیشہ کم رہی ہے، اس کمی کو ایمان کی قوت سے پورا کرنا ہے۔......

”آپ سب محسوس کرتے ہوں گے کہ اتنی قلیل نفری اتنی کثیر فوج کے خلاف آمنے سامنے کی لڑائی نہیں لڑ

سکتی۔ ہمیں شبخون مارنا پڑے گا اور اس کے بعد بھی ہم ضرب لگاؤ اور اِدھر اُدھر ہو جاؤ، کا طریقہ اختیار کریں گے۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ لڑائی کس طرح لڑی جاتی ہے۔ آپ میں سے کون آج رات شبخون مارنے کو تیار ہے؟"

کون تھا جو کہتا کہ وہ تیار نہیں؟ لیکن سیّد احمد شہید کی نظر انتخاب جمعدار اللہ بخش پر پڑی۔ جمعدار اللہ بخش ہندوستان کے ضلع اناؤ کے رہنے والے تھے اور انگریزوں کی فوج میں بھرتی ہو گئے۔ سیّد احمد شہید نے تحریک مجاہدین کا علم بلند کیا تو جمعدار اللہ بخش اُن سے آ ملے اور اُن کے دست راست بن گئے۔

"مجاہدین!" سیّد احمد شہید نے کہا۔ "خدائے ذوالجلال ہماری نیتوں اور ہمارے مقاصد سے آگاہ ہے۔ ہم اپنی حکمرانی قائم کرنے کے لئے وطن سے بے وطن نہیں ہوئے۔ ہم مسلمانوں کی حکمرانی بحال کرنے نکلے ہیں ہمیں ملک ہندوستان کو کفر کی غلاظت سے پاک کرنا ہے"۔

اجلاس کے حاضرین کو ایسے وعظ کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ گھروں سے سربکف نکلے تھے۔ انہوں نے اجلاس سے پہلے ظہر کی نماز سیّد احمد کے پیچھے پڑھی تھی۔ انہوں نے جب دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تو اُن کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ مقتدی جانتے تھے کہ اُن کا امام خدا کے حضور گڑگڑا رہا ہے اور فتح و نصرت کی بھیک مانگ رہا ہے۔ بہت سے مقتدیوں کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے تھے۔

اجلاس میں سیّد احمد شہید نے ایمان اور جذبات کی باتوں کے بعد جمعدار اللہ بخش کو شبخون مارنے کے متعلق کچھ ہدایات دیں۔ کچھ دیر بحث مباحثہ ہوا اور شبخون کی سکیم تیار ہو گئی اور یہ بھی طے ہو گیا کہ کتنی نفری جائے گی۔ اس نفری میں ہمت خان بھی شامل تھا۔ اس نے اپنے آپ کو رضاکارانہ طور پر پیش کیا تھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دربار میں اُس کے ساتھ جو سلوک ہوا تھا اُس کا وہ انتقام لینے کو بے تاب تھا۔ لاہور سے اُس کی واپسی کا سفر بڑا ہی کٹھن تھا۔ اتنے دنوں کی مسلسل گھوڑسواری، بے آرامی اور بھوک پیاس نے اس کی ہڈیاں توڑ ڈالی تھیں مگر اُس نے منت کر کے شبخون میں اپنا نام دے دیا۔

OOO

"مسلمانوں کی نفری اتنی تھوڑی ہے کہ وہ ہمارے سائے کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتے"۔ اکوڑہ خٹک کے قریب سکھوں کی خیمہ گاہ میں رات کے وقت ہری سنگھ اودھم سنگھ اور بدھ سنگھ سے کہہ رہا تھا۔ اس کی آواز شراب کے نشے سے بے قابو سی لگتی تھی۔ اُس نے کہا۔ "بدھ سنگھ! تم سیّد احمد کے نام سے ڈر گئے ہو"۔

"اوئے ہری سنگھا!" بدھ سنگھ نے ہری سنگھ کی ران پر ہاتھ مار کر کہا۔ "چل لڑائی نہ ہوئی تو یہاں کچھ دن عیش موج کر جا...... میں سیّد احمد کے نام سے نہیں ڈرا۔ تُو بھی سوچ، ان مُسلوں پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے حکومت کی ہے۔ یہ اٹھ کھڑے ہوئے تو نہ ہری سنگھ رہے گا نہ بدھ سنگھ اور تیرا مہاراجہ رنجیت سنگھ مسلمانوں کے بھٹ جھونک رہا ہو گا"۔

اودھم سنگھ پاس بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ اُس نے بھی کہا کہ مسلمان اور خودکشی نہیں کرنا چاہتے تو وہ اتنی تھوڑی نفری سے ہمارے مقابلے میں نہیں آئیں گے۔

اس وقت جب یہ بات ان سکھوں کمانڈروں کے دماغوں تک پہنچ چکی تھی، ایک نوجوان سکھ خیمہ گاہ کی حفاظتی فصیل کے باہر دبے پاؤں چل رہا تھا۔ وہ کبھی اُن جھاڑیوں کو دیکھتا جو پتھروں کی فصیل کے ساتھ بچھی تھیں، کبھی ایڑیاں اٹھا کر ان کے اوپر سے خیمہ گاہ کو دیکھنے کی کوشش کرتا۔ رات کی تاریکی میں اُسے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ خیمہ گاہ میں خاموشی تھی۔ یہ نیند کا سکوت تھا جسے کبھی

کسی گھوڑے کی آواز اور کبھی کسی سنتری کی آواز توڑتی اور رات پھر خاموش ہو جاتی۔

یہ نوجوان سکھ تمام تر خیمہ گاہ کے گرد گھوم گیا اور جدھر سے آیا تھا اُدھر ہی چلا گیا۔ کچھ دور جا کر اُسے آواز سنائی دی۔

''آ گئے ہمت خان!'' وہ اس طرف گیا۔ اُس نے مصنوعی داڑھی چہرے سے نوچ کر پھینک دی۔ اس کے نیچے اس کی اپنی بڑی خوبصورت داڑھی تھی۔ اس نے سر سے پگڑی بھی اتار پھینکی جو اس نے سکھوں کی طرح باندھ رکھی تھی۔ وہ سکھ نہیں ہمت خان تھا جو سکھوں کے بھیس میں خیمہ گاہ کا جائزہ لینے گیا تھا اور اُس کے انتظار میں جمعدار اللہ بخش کھڑا تھا۔ ہمت خان نے جمعدار اللہ بخش کو خیمہ گاہ کی کیفیت تفصیل سے بتائی اور کہا کہ شبخون کے لئے فضا صاف ہے۔

تاریخوں میں لکھا ہے کہ ان چھاپہ مار جانبازوں نے مقامی پٹھانوں کی راہنمائی میں چھوٹی چھوٹی کشتیوں سے دریائے کابل عبور کیا تھا کیونکہ خشکی کے راستے پر سکھ فوجی گشت پر رہتے تھے اور گشت کی نفری زیادہ ہوتی تھی۔ دریا پار کر کے ہمت خان کو خیمہ گاہ کے جائزے کے لئے بھیجا گیا تھا۔ ہمت خان نے سنگھر میں ایک جگہ دیکھ لی تھی جہاں سے اندر جایا جا سکتا تھا۔

جمعدار اللہ بخش نے اپنے جانباز چھاپہ ماروں کو آخری ہدایات دیں اور کہا۔ ''ہم سب نے ایک دوسرے کا کہا سنا معاف کر دیا ہے۔ اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ کون زندہ واپس جائے گا۔ صرف یہ خیال اپنے سامنے رکھو، آج کا شبخون تمہارا آخری فرض ہے اور اُس کے بعد تم خدا کے حضور چلے جاؤ گے۔ اب یہ فیصلہ خود کرو گے اللہ کے حضور سرخرو ہو کر جانا ہے یا فرض سے نظریں چرا کر ملعون کے روپ میں''۔

چھاپہ ماروں کے اس جیش میں سے کسی کی بھی آواز نہ نکلی کیونکہ انہیں خاموشی برقرار رکھنے کی بڑی سخت ہدایت دی گئی تھی۔ انہوں نے اللہ اکبر کے نعرے یوں سینوں میں روک رکھے تھے جیسے عقابوں کو پنجرے میں بند کر دیا گیا ہو اور وہ پنجرے توڑنے کو پھڑ پھڑا رہے ہوں۔

OOO

دس ہزار سکھوں کی خیمہ گاہ میں نیند کا موت جیسا سکوت طاری تھا۔ بے ہوشی کی اس نیند میں دیسی شراب کا عمل دخل زیادہ تھا۔ سکھ شراب کے بغیر اُس پودے کی مانند ہوتا تھا جسے پانی نہ ملے۔ لہٰذا سکھوں کی فوج کو پانی بعد میں اور شراب پہلے دی جاتی تھیں وہ شراب کے زور پر لڑتے تھے۔ سنتری بیدار تھے اور گھوم پھر رہے تھے۔ چھاپہ مار دبے پاؤں خیمہ گاہ کی حفاظتی باڑ پتھروں کے سنگھر سے دور دور ہمت خان کی راہنمائی میں اس مقام تک جا رہے تھے جہاں سے اندر جانا تھا۔

بعض مؤرخوں نے چھاپہ ماروں کی نفری ایک سو لکھی ہے اور بعض نے نو سو کے قریب لیکن شبخون میں اکثر کم سے کم نفری لے جائی جاتی تھی۔ تعداد نو سو نہیں ہو سکتی۔ بہر حال یہ جیش اُس مقام کے قریب پہنچ گیا۔ جمعدار اللہ بخش نے وہ جگہ دیکھی اور سنگھر کے باہر کی خاردار جھاڑیاں ایک طرف کرا دیں اور دو چھاپہ مار دیوار سے اندر کود گئے۔ انہوں نے اندر کی طرف بچھائی ہوئی جھاڑیاں ہٹا دیں۔ وہاں سے کچھ اور چھاپہ مار اندر چلے گئے ان میں سے چار اپنی تلواریں سونتے ایک جگہ چھپ گئے تا کہ سنتری اِدھر آئیں تو انہیں ختم کر دیا جائے۔

ہمت خان جب اکیلا آیا تھا تو یہ نہیں دیکھ سکا تھا کہ سنتریوں کے پاس ہتھیار کیا ہیں۔ ان کے پاس برچھیاں نہیں بلکہ توڑے دار بندوقیں تھیں...... چھاپہ مار اندر چلے گئے۔ انہوں نے اس طرف کے خیموں کی رسیاں کاٹ دیں اور اوپر سے برچھیاں مارنے لگے۔ خیموں میں دبے ہوئے سکھ مرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ شور اٹھا تو

کسی سنتری نے اِدھر کو بندوق کر کے فائر کر دیا۔ تمام چھرے مولانا باقر علی عظیم آبادی کے سینے میں اتر گئے۔ مولانا نے بلند آواز سے پکارا۔ "میرے دوستو! مجھ سے ہتھیار لے لو۔ یہ اللہ کی امانت ہیں انہیں دشمن ہاتھ نہ لگائے"۔ وہ گرے اور شہید ہو گئے۔ وہ اس شبخون کے پہلے شہید تھے۔

اس کے بعد ایک قہر تھا جو سکھوں پر ٹوٹ پڑا، ایک قیامت تھی جو بپا ہوئی مجاہدین خیموں کی رسیاں کاٹتے اور گرے ہوئے خیموں میں برچھیاں مارتے چلے جاتے تھے۔ کسی مجاہد چھاپہ مار نے ایک خیمے کو آگ لگا دی۔ سکھوں کی تعداد دس ہزار تھی۔ اتنی مخلوق ہڑبڑا کر بیدار ہوئی، اپنے ساتھیوں کی چیخ و پکار اور اللہ اکبر کے نعروں کی گرج سنی تو سوائے بھاگنے کے کچھ نہ سوچ سکی۔ بہت کم سکھوں نے سمجھنے کی کوشش کی کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ مقابلے کے لئے تیار ہوئے لیکن سامنے کوئی دشمن ہوتا تو مقابلہ کرتے۔ وہاں تو بھگدڑ اور نفسانفسی تھی۔

جمعدار اللہ بخش کی نظر سکھوں کی توپوں پر تھی۔ انہوں نے چند ایک چھاپہ مار اپنے ساتھ رکھے ہوئے تھے۔ انہوں نے ایک سکھ کو پکڑ لیا اور اُسے جان خوشی کا وعدہ دے کر پوچھا کہ توپیں کہاں ہیں۔ سکھ انہیں توپوں تک لے گیا۔ جمعدار اللہ بخش نے اُسے بھگا دیا۔ اب یہ توپیں مجاہدین کی تھیں۔ خیمہ گاہ میں کئی جگہوں سے شعلے اٹھ رہے تھے۔ گھوڑوں کی ہنہناہٹ خوفناک تھی۔ وہ آگ اور غل غپاڑے سے بدکتے اور بڑی زور زور سے ہنہناتے تھے۔ اکّا دکّا گولی بھی چلتی تھی۔

OOO

کماندار اودھم سنگھ کا خیمہ کچھ دور تھا۔ وہ گھبراہٹ کے عالم میں اٹھا۔ خیمے سے باہر آیا تو اس کا دل ڈوب گیا۔ اُس کی دس ہزار نفری کا قتلِ عام ہو رہا تھا۔ وہ بدھ سنگھ کے خیمے میں دوڑتا گیا مگر خیمہ خالی تھا۔ اُسے پتہ نہ چل سکا کہ بدھ سنگھ اس ڈر سے بھاگ گیا ہے کہ مسلمانوں کی بہت زیادہ نفری نے حملہ کر دیا ہے اور اب جان بچانے کے سوا کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ ہری سنگھ بھی لاپتہ تھا۔

جمعدار اللہ بخش نے دیکھا کہ شبخون کا مقصد پورا ہو چکا ہے تو اُس نے اپنے ساتھ جو تین قاصد رکھے ہوئے تھے انہیں کہا کہ مجاہدین سے چلا چلا کر کہو کہ خیمہ گاہ سے نکلو اور دریا کے کنارے پہنچو۔ جمعدار اللہ بخش نے خود بھی بڑی بلند آواز میں احکام دینے شروع کر دیئے مگر مجاہدین اپنی کامیابی سے اس قدر سرشار تھے کہ کوئی حکم نہیں مان رہے تھے۔ دس ہزار نفری کی خیمہ گاہ جس میں رسد، گھوڑے اور بیل گاڑیوں کے بیل اور سینکڑوں ملازم بھی تھے، دو میل سے زیادہ رقبے میں پھیلی ہوئی تھی۔ مجاہدین، سکھوں کی بندوقیں، بارود اور دیگر ہتھیار اکٹھے کر رہے تھے۔

آخر اکبر خان نام کے مجاہد کی کوششوں سے مجاہدین خیمہ گاہ سے نکلنے لگے۔ اُس وقت بھی بندوقیں فائر ہو رہی تھیں۔ کہیں دست بدست لڑائی ہو رہی تھی۔ جمعدار اللہ بخش مجاہدین کو باہر نکالنے کے لئے بھاگ دوڑ رہے تھے کہ کسی بندوق کے چھرے اُن کے جسم کو چھلنی کر گئے اور وہ شہید ہو گئے۔ اکبر خان نے جو قندھار کے رہنے والے تھے دیکھ لیا اور چھاپہ ماروں کی قیادت سنبھال لی۔

صبح صادق کا وقت تھا جب چھاپہ مار مجاہدین خیمہ گاہ سے تقریباً دو میل دور اکٹھے ہوئے۔ انہوں نے پہلا کام یہ کیا کہ اذان دی اور نمازِ فجر باجماعت پڑھی۔ نماز کے بعد شہیدوں کے لئے دعائے مغفرت کی۔ جماعت میں سے جو جانباز غیر حاضر تھے ان میں ہمت خان بھی تھا۔ اس کے متعلق یہی سمجھ لیا گیا تھا کہ شہید ہو گیا ہے۔

OOO

اودھم سنگھ کی آنکھ اُس وقت کھلی تھی جب چھاپہ مار خیمہ گاہ پر چھا چکے تھے اور سکھوں میں بھگدڑ مچ چکی تھی۔

اُسے اپنے دونوں ساتھی کمانڈر بدھ سنگھ اور ہری سنگھ نہ ملے تو وہ ایک طرف ہو کر دیکھنے لگا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ کچھ بھی کرنے کے قابل نہیں تھا۔ وہ کمانڈ نہیں لے سکتا تھا۔ وہ اس صورت حال پر قابو پانے کے قابل نہیں تھا۔ وہ بھاگنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کسی بھی فوج میں جب یہ صورت پیدا ہو جاتی ہے تو کمانڈر اپنے دستوں پر قابو نہیں پا سکتے۔

اس نے اپنی کرپان بھی نیام سے نہ نکالی اور ایک طرف چل پڑا۔ خیموں اور دیگر جلتے ہوئے سامان کے شعلوں کی روشنی اتنی تھی کہ اسے نظر آ رہا تھا کہ وہ کدھر جا رہا ہے۔ اس نے اپنے سکھ سپاہیوں کی لاشوں سے ٹھوکریں بھی کھائیں اور وہ خیمہ گاہ کے دروازے تک چلا گیا۔ بندوقیں بھی فائر ہو رہی تھیں۔ وہ کسی بندوق کے فائر کیے ہوئے چھروں کی زد میں آ گیا۔ زیادہ تر چھرے اُس کے بازو میں اترے اور کچھ سینے کے ایک طرف پھٹے میں اور کچھ سر میں لگے۔ وہ دروازے سے نکل گیا۔ وہ سنگھر کے ساتھ ساتھ چلتا گیا۔ اُسے چکر آیا پھر وہ گر پڑا۔

ہمت خان اُس وقت خیمہ گاہ سے نکلا جب اُس کے سارے ساتھی جو زندہ تھے جا چکے تھے۔ اُس نے اپنی بے عزتی کا انتقام لے لیا تھا۔ خیمہ گاہ کے دروازے سے نکلتے اُس نے خیمہ گاہ کو دیکھا۔ شعلے بجھتے جا رہے تھے۔ خیمہ گاہ تباہی کا منظر پیش کر رہی تھی۔ ہمت خان کو عجیب سا سکون محسوس ہوا۔ اُس کے قریب سے سکھ دوڑتے گزر رہے تھے۔ اُس کی طرف کوئی دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔

ہمت خان سنگھر کے ساتھ ساتھ جا رہا تھا، جہاں سنگھر ختم ہوا وہاں سے زمین نیچے کو جا رہی تھی۔ وہ نیچے اترنے لگا اور اس کے دائیں بائیں دو ٹیکریاں آ گئیں ان سے گزرتے صبح کی سپیدی نکھرنے لگی۔ اُس کے ساتھی نماز پڑھ کر اُس کے لئے دعائے مغفرت کر چکے تھے۔ اس نے دیکھا کہ ایک آدمی زمین پر پڑا ہے۔ وہ لاش ہی ہو سکتی تھی۔ وہ دوڑ کر اُس کے قریب گیا کہ یہ کوئی اس کا اپنا ساتھی ہی نہ ہو۔

وہ اُس کا اپنا ساتھی نہیں کوئی سکھ تھا۔ اس نے حقارت سے ہاتھ پیچھے کر لیا لیکن صبح اتنی صاف ہو چکی تھی کہ اُسے اُس شخص کا چہرہ اچھی طرح نظر آ گیا۔ ہمت خان نے اُس پر جھک کر دیکھا تو اُس کے منہ سے نکلا۔ ''اوہ، یہ تو اودھم سنگھ ہے''۔ تب اُس نے اُس کی نبض پر انگلیاں رکھیں۔ وہ زندہ تھا۔ ہمت خان کو لاہور قلعے میں اودھم سنگھ کا سلوک یاد تھا۔ اُس نے وہاں ہمت خان کی یہ عزت افزائی کی تھی کہ جب اُسے کہا جا رہا تھا کہ وہ تلوار اتار دے تو اودھم سنگھ نے سکھوں کو حکم دیا تھا کہ وہ اُس کی تلوار اس کے پاس رہنے دیں۔ دربار میں تمام محافظوں نے تلواریں نکال لی تھیں اور سارے درباری اُس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ اُس وقت اُس نے اودھم سنگھ کو دیکھا تھا۔ وہ واحد آدمی تھا جو اُسے غصیلی نظروں سے گھور نہیں رہا تھا اور اُس نے اپنی کرپان کے دستے پر ہاتھ نہیں رکھا تھا۔ اُس رات اودھم سنگھ اُس کے پاس مہمان خانے میں گیا اور اُس کی باتیں توجہ سے سنی تھیں۔ اودھم سنگھ کے اس سلوک کے علاوہ ہمت خان نے اُس شخص میں نہ جانے کیا دیکھا تھا کہ وہ اُسے اچھا لگا تھا۔

اُس نے کہا۔ ''اودھم سنگھ! زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے لیکن میں تمہیں یہاں نہیں مرنے دوں گا۔ تمہیں بچانے کی کوشش ضرور کروں گا''۔ لیکن اودھم سنگھ بیہوش پڑا تھا۔ وہ کچھ بھی نہیں سن رہا تھا۔ ہمت خان نے گھٹنے ٹیک کر اُسے اٹھایا اور کندھے پر ڈال کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اتنے قوی ہیکل آدمی کے بوجھ تلے وہ چل پڑا۔

OOO

اودھم سنگھ ہوش میں آیا تو اُس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں۔ اِدھر اُدھر اوپر دیکھا۔ اسے اپنے اوپر چھت نظر آئی اور اس کے پاس جانی پہچانی شکل وصورت

کا ایک جواں سال آدمی بیٹھا تھا۔ اودھم سنگھ نے اپنا دایاں بازو پٹیوں میں جکڑا ہوا پایا۔ سر پر بھی پٹیاں لپٹی ہوئی تھیں۔ اُس کے ہونٹوں سے حیرت زدہ سرگوشی نکلی۔

''ہمت خان!...... مجھے تم یہاں لائے ہو؟''

جب ہمت خان نے اُسے بتایا کہ وہ کہاں سے اور کس طرح اُسے اٹھا لایا ہے تو اودھم سنگھ حیرت سے جیسے سن ہو گیا ہو۔ وہ اس علاقے کی دشواریوں اور فاصلوں سے واقف تھا۔ اتنے میں ایک آدمی اندر آیا اور اُس نے کہا۔ ''امیر المومنین تشریف لا رہے ہیں''۔ ہمت خان اٹھ کھڑا ہوا۔ سیّد احمد شہید اندر آئے۔ اودھم سنگھ اٹھ بیٹھا اور بڑے غور سے سیّد صاحب کو دیکھنے لگا۔

''مجھے بتایا گیا ہے کہ آپ کے زخم گہرے نہیں''۔ سیّد احمد شہید نے اودھم سنگھ کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''جلدی ٹھیک ہو جائیں گے۔ ہمت خان نے مجھے بتایا ہے کہ لاہور میں آپ نے اُس کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا تھا۔ ہمارا سلوک بھی آپ کو مایوس نہیں کرے گا''۔

''میں آپ کا قیدی ہوں''۔ اودھم سنگھ نے کہا۔ ''آپ میرے ساتھ جو سلوک چاہیں کر سکتے ہیں۔ میں اگر مایوس ہوں گا بھی تو آپ کا کیا بگاڑ سکتا ہوں''۔

''آپ ہمارے قیدی نہیں مہمان ہیں''۔ سیّد احمد شہید نے کہا۔ ''زخم ٹھیک ہونے تک آپ ہمارے مہمان رہیں گے، پھر آپ کو اُسی عزت اور احترام سے رخصت کیا جائے گا جو ایک کمانڈر اور قلعہ دار کا حق ہے۔ میں آپ کے لئے دعا کروں گا۔ آپ جلدی صحت یاب ہو جائیں گے''۔ اور سیّد صاحب اودھم کے سر پر ہاتھ پھیر کر چلے گئے۔

اودھم سنگھ کی نظریں دروازے پر جمی رہیں جس میں سے سیّد احمد شہید نکل گئے تھے۔ ہمت خان کو آواز نے اُسے چونکا دیا۔ ''یہ ہیں سیّد احمد، ہمارے سالارِ اعلیٰ اور امیر المومنین جن کے متعلق آپ نے مجھ سے لاہور قلعے میں پوچھا تھا''۔

''ہاں، یہ شخص اپنے آپ میں جادو کا اثر رکھتا ہے''۔ اودھم سنگھ نے کہا۔

جس مکان میں اودھم سنگھ کو رکھا گیا تھا یہ اکوڑہ خٹک سے کچھ دور ایک گاؤں کا کچا مکان تھا۔ اودھم سنگھ کی ہر روز مرہم پٹی ہونے لگی اور اُسے نہایت اچھا کھانا دیا جانے لگا۔ سیّد احمد شہید اس کی تیمارداری کو آتے تھے۔ انہوں نے اُس پر کبھی ظاہر نہ ہونے دیا کہ اُسے دشمن یا غیر مسلم سمجھا جا رہا ہے۔ علی الصبح اُس کے کانوں میں بڑی سریلی آواز پڑتی۔ اودھم سنگھ کو معلوم تھا کہ کوئی قرآن پڑھ رہا ہے لیکن کسی آواز میں اُس نے یہ تاثر محسوس نہیں کیا تھا۔

ایک روز ہمت خان اُس کے پاس اکیلا بیٹھا تھا۔ اودھم سنگھ جیسے پھٹ پڑا ہو۔ بولا۔ ''ہمت خاناں! میں سکھ ہوں۔ مجھ پر رحم نہ کرو۔ ہم مسلمان کو اذیتیں دے دے کر مارتے ہیں تو ہمیں لطف آتا ہے۔ ہم مسلمان عورتوں کی عزت لوٹ کرنا چاہا کرتے ہیں۔ مسلمانوں کے بچوں کو قتل کر کے ہم قہقہے لگایا کرتے ہیں۔ تم میرے ساتھ مہمانوں جیسا سلوک کیوں کر رہے ہو''۔

''ہم یہ نہیں دیکھ رہے کہ آپ سکھ ہیں''۔ ہمت خان نے کہا۔ ''ہم یہ یاد رکھتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں۔ ہم صرف میدانِ جنگ میں قتال کرتے ہیں۔ عورت، بچہ، نہتا آدمی اور زخمی کسی بھی قوم کا ہو ہم اُس پر ہاتھ نہیں اٹھاتے۔ ہمارے امیر المومنین نے آپ کے مہاراجہ کو قبولِ اسلام کا پیغام بھیجا ہے لیکن آپ کو نہیں کہا کہ اسلام قبول کر لیں کیونکہ آپ ہمارے رحم و کرم پر ہیں''۔

''اگر میں اپنی مرضی سے اسلام قبول کر لوں تو؟''

''ہمیں یقین کرنا پڑے گا کہ آپ کسی خوف یا لالچ سے اسلام قبول نہیں کر رہے''۔ ہمت خان نے جواب دیا۔

OOO

ایک روز اودھم سنگھ کو جب وہ صحت یاب ہو چکا تھا اور باہر گھومنے پھرنے لگا تھا، پتہ چلا کہ سیّد احمد شہید گاؤں میں موجود ہیں۔ وہ اُن کے کمرے میں چلا گیا اور اُن کے پاؤں پر سر رکھ کر کہا کہ اُسے مسلمان کر لیا جائے۔ اُسے کہا گیا کہ وہ آزاد ہے، وہ واپس جا سکتا ہے لیکن اُس نے یہی ایک رَٹ جاری رکھی کہ وہ مسلمان ہونا چاہتا ہے۔ آخر سیّد احمد شہید نے اُسے کلمہ طیبہ پڑھا کر مسلمان کر لیا اور اس کا نام اسماعیل رکھا۔

مسلمان ہو کر اُس نے بتایا کہ اُس کی ماں اور جوان بہن بھی اس کے ساتھ آئی تھیں۔ اُس زمانے میں کماندار اور عہدیدار اپنی بیویوں کو اور بعض اپنے کنبوں کو اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ اودھم سنگھ اپنی ماں اور بہن کو اپنے ساتھ لایا تھا۔ انہیں خیمہ گاہ میں رکھنے کی بجائے اُس نے انہیں اکوڑہ سے کچھ دور ایک گاؤں میں رکھا تھا۔ اُس نے کہا کہ وہ انہیں اپنے پاس لانا چاہتا ہے۔۔ وہ علاقہ سکھوں کی بڑی ظالم عملداری میں تھا۔

وہ انہیں لانے کی سوچ ہی رہا تھا کہ مجاہدین کے ایک جاسوس نے اطلاع دی کہ اسماعیل کے قبول اسلام کی خبر بدھ سنگھ تک پہنچ گئی ہے اور اُس نے حکم دیا ہے کہ اسماعیل (اودھم سنگھ) کی ماں اور بہن کو پکڑ لاؤ۔ وہ اودھم سنگھ کی غداری کی سزا اس کی ماں اور بہن کو دینا چاہتا ہے۔ بدھ سنگھ کے حکم سے دس بارہ سکھ اُس کی گاؤں کو روانہ ہو گئے تھے۔

سیّد احمد شہید نے اِدھر سے اسماعیل کے ساتھ دس بارہ مجاہدین بھیج دیئے۔ ان میں ہمت خان بھی تھا۔ یہ جماعت جب اس گاؤں پہنچی تو وہاں خوف وہراس طاری تھا۔ معلوم ہوا کہ بدھ سنگھ کے سپاہی پہلے پہنچ گئے ہیں۔ اسماعیل اور مجاہدین بھاگم بھاگ پہنچے۔ مکان کے باہر سکھ سپاہی کھڑے تھے۔ انہوں نے مجاہدین کو باہر ہی روک لیا اور ان میں خونریز معرکہ شروع ہو گیا۔ اسماعیل اور ہمت خان مکان میں داخل ہونے کی کوشش کر رہے تھے مگر ناکام رہے۔ آخر دونوں پچھواڑے سے اندر گئے۔

اندر کا یہ حال تھا کہ اسماعیل کی ماں تلوار کے زخموں سے مری پڑی تھی اور اُس کی بہن پریتم کور کے کپڑے پھٹے ہوئے اور بال بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے بتایا کہ سکھ سپاہی اندر آئے اور پریتم کور کو پکڑ کر اُس کے کپڑے پھاڑنے لگے۔ ماں نے تلوار نکال لی اور سکھوں پر حملہ کیا لیکن دو سکھوں نے اُسے ختم کر دیا۔ پریتم کور کو وہ بے آبرو کرنا چاہتے تھے کہ باہر شور اٹھا۔ اندر والے سکھ باہر گئے اور اسماعیل اور ہمت خان اندر چلے گئیں اس طرح پریتم کور کی آبرو محفوظ رہی۔ اسماعیل اور ہمت خان پچھواڑے سے ہی پریتم کور کو نکال لے گئے۔ مجاہدین میں سے دو تین شہید ہو گئے باقی نکل گئے۔

سیّد احمد شہید کے گاؤں میں لا کر اسماعیل نے اپنی بہن کو بتایا کہ وہ اب اودھم سنگھ نہیں اسماعیل ہے۔ اُس نے جب بہن کو بتایا کہ وہ کیوں مسلمان ہوا ہے تو بہن نے بھی مسلمان ہونے کی خواہش ظاہر کی۔ سیّد احمد شہید نے اُسے مسلمان کر لیا اور اس کا نام زینب رکھا۔ زینب جوان لڑکی تھی۔ اسماعیل کی خواہش پر ہمت خان اور زینب کی شادی کر دی گئی۔ سیّد احمد شہید نے قندھار کے ایک مجاہد کی بیٹی کو اسماعیل سے منسوب کر دیا لیکن اسماعیل نے کہا کہ وہ اگلی لڑائی کے بعد شادی کرے گا۔ تھوڑے ہی عرصے بعد سیّد احمد شہید نے اٹک پر حملہ کیا جو خادے خان والیٔ ہند کی غداری کی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکا۔ اسماعیل اس حملے میں شہید ہو گیا۔

قاضی عبدالعلیم اثر افغانی نے اپنی کتاب ”روحانی رابطہ“ میں لکھا ہے کہ سیّد احمد شہید نے اسماعیل کی لاش دیکھی تو اُن کے آنسو بہہ نکلے۔ انہوں نے کہا۔ ”آخر میرے جیلے نے شہادت کا سہرا باندھ ہی لیا“۔

غزل

شازیہ محسن

مرے دل کے نگیں کی تراش کیسی ہے
اِس آئینے پہ نہ جانے خراش کیسی ہے

میں اپنا رنگ کہیں جنگل میں کھو آئی
ہوائے موسمِ گل اب تلاش کیسی ہے

مری خاک بھی کب سے بکھر چکی ہو گی
مرے گھر میں پھر آخر یہ لاش کیسی ہے

ترے بغیر بھی رہتی ہوں اس خرابے میں
عجیب لوگ ہیں یہ بود و باش کیسی ہے

یہ زندگی تو مکمل وجود رکھتی تھی
زمیں پہ آ کے مگر پاش پاش کیسی ہے

بچھڑنے والے بچھڑ بھی گئے مگر شازیہ
بجھی بجھی سی نظر میں تلاش کیسی ہے

غزل

نازیہ لیاقت

اے حُسنِ کائنات! پریشانی میں آ
تُو بھی مری طرح کبھی ویرانی میں آ!

محرابِ وقت میں یا حریمِ خیال میں
اے حسنِ لازوال ذرا فانی میں آ

ذوقِ عبودیت تو یہ ایں شانِ دلبری
داغِ سجود بن کے ہی پیشانی میں آ

پی کر فنا کا جام، لٹا کر متاعِ گل
مجھ جیسے بے مثال میں لاثانی میں آ

بن کر خیال و فکر کا اِک لفظ شش جہات
بے حرف و صوت ہو کے بھی سو معنی میں آ

رازِ درونِ ذات کا ہو جائے انکشاف
لوح و قلم کی ایسی جہانبانی میں آ

نازیہ! متاع جاں کو لٹا کر بنام دوست
تو کارواں میں، بے سرو سامانی میں آ

مانا کے منہ سے بڑی بھیانک اور دل ہلانے والی آواز نکلی
اس نے یکدم پنڈت کا ہاتھ اپنے منہ میں لے کر اس میں
دانت گاڑ دیئے۔ پنڈت کے حلق سے دلدوز کراہ نکلی

قسط:5 ☆ محمد رضوان قیوم

ان کی نگاہوں کے سامنے دیپا اور مانا زمین پر ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہے تھے۔ سنتو تائی بھی گھبرائی ہوئی وہاں پہنچ گئی تھی۔

"کیا ہوا بیٹی؟" مکیش کے منہ سے دھاڑ سی نکلی۔ لگتا تھا وہ ابھی رو دے گا۔

"پتا جی...... پتا جی! وہاں...... وہاں......" اس نے رسوئی کی جانب اشارہ کیا۔

"ارے مجھے تو وہاں کچھ نظر نہیں آ رہا"۔ مکیش نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "کیا ہے وہاں؟"

سنتو تائی اور لالہ جی نے پوچھا کہ بیٹا کیا ہوا ہے تم نے کیا دیکھا؟

"ماتا جی! وہ رسوئی میں بڑے بڑے دانتوں اور کالے رنگ والی خوفناک عورت ہے"۔ مانا نے کہا۔ "وہ کہہ رہی ہے کہ تم سب جلد اس حویلی کی بھٹی میں کوئلے کی مانند جلو گے"۔ وہ یہ کہہ کر نیم بے ہوش ہو گیا۔

"ہائے رام، ہائے رام!" سنتو تائی نے اپنا سینہ پیٹنا شروع کر دیا۔

"ارے یونہی وقت ضائع کرتے رہو گے"۔ ابا نے کہا۔ "ہمیں فوری طور پر دیپا اور مانا کو ہسپتال لے جانا چاہیے"۔

"ہاں، ہاں تم صحیح کہتے ہو"۔ لالہ جی نے کہا۔ "چلو ان دونوں کو اٹھا کر سرکاری ہسپتال لے کر جایا جائے"۔ ابا نے مانا اور مکیش نے دیپا کو گود میں اٹھایا۔ دونوں کو قریبی سرکاری ہسپتال کی ایمرجنسی میں لے کر گئے۔ ڈاکٹروں نے ان کا اچھی طرح سے معائنہ کیا۔ انہوں نے اپنی رائے دی کہ میڈیکل کے لحاظ سے انہیں کوئی بھی بیماری نہیں ہے اور یہ ہر لحاظ سے ٹھیک ہیں۔ لگتا ہے ان کے دماغ پر خوف سوار ہے۔ اسی دوران ہسپتال میں اہل محلہ جس جس نے سنا وہ وہاں پہنچ گیا۔

ہسپتال سے دونوں کو جب گھر لایا گیا تو وہاں بھی اہل محلہ اور دیگر ارد گرد کے لوگ حویلی آ گئے۔ وہاں موجود جتنے لوگ تھے وہاں اتنی ہی رنگ برنگی باتیں ہونے لگیں۔ وہاں موجود ایک بڑھیا نے سنتو تائی کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی کہ اُسے شک ہے کہ دیپا کے کنوار پنے ہی سے کوئی ہوائی مخلوق اس پر عاشق ہے۔ سنتو تائی تو پہلے ہی آخری حد تک جاہل اور کانوں کی کچی تھی۔ اس نے واویلا کرنا شروع کر دیا کہ اس حویلی میں جو نحوست آئی ہے اور میرے بیٹے مانا پر جو اوپری اثرات ہیں ان کا اصل سبب یہ کمبخت میری بہو ہی ہے۔ مجھے پکا یقین ہے کہ اس کے پتا، ماتا نے ہمیں آسیب زدہ لونڈیاں متھے مار دی۔

"ہائے، بھگوان انہیں نرک میں پھینکے۔ بھگوان کرے ان کے جسم پر کوڑھ چلے"۔ اس نے جاہل عورتوں کی طرح بد دعائیں دینا شروع کر دیں۔ مکیش جو وہاں کھڑا سنتو تائی کی جلی کٹی باتیں بڑی خاموشی اور صبر سے سن رہا تھا، اس نے ابا کو اپنے قریب بلاتے ہوئے کہا کہ آپ سمدھن جی کو کہیں کہ ہم ان کی ماں کی جگہ عزت کرتے ہیں، وہ میری بیٹی کو بے شک حویلی کے اندر لے جا کر زندہ جلا دیں، مار کاٹ دیں لیکن لوگوں سے بھری حویلی میں میری بیٹی پر اتنا بھونڈا الزام لگا کر اس کو ذلیل نہ کریں۔

"مکیش جی آپ دل میلا نہ کریں"۔ ابا نے اس کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "آپ کو ان کی گرم دماغی کا تو بخوبی علم ہی ہے"۔ مکیش نے ایک ٹھنڈی آہ لی اور منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگا۔

"میں اپنی آنکھوں سے یہ منظر نہ ہی دیکھوں تو اچھا ہے"۔ مکیش نے کہا۔ "ورنہ ہو سکتا ہے اپنی بیٹی کی تذلیل دیکھ کر میرا دماغ خراب ہو جائے۔ اگر ایسا ہو گیا تو پھر بہت بُرا ہو گا"۔

"پتا جی بھگوان کے لئے ماتا جی کو میری اور مانا کی حالت کے بارے میں ذرا سا بھی نہ بتلانا"۔ دیپا نے باپ سے کہا۔ "وہ ویسے ہی دل کی مریضہ ہیں"۔

لالہ بھی اُن کے پاس آ گیا۔ اس نے سنتو تائی کی جانب غصہ سے گھورتے ہوئے کہا۔ ”تُو اپنے کمرے میں دفع ہو اور بیٹی دیپا تم شانت ہو جاؤ۔ بھگوان نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا“۔

”سمدھی جی! میں چاہتا ہوں کہ اپنے گاؤں لوٹ جاؤں“۔ مکیش نے کہا۔ ”ویسے بھی مجھے نہیں لگتا کہ میرا یہاں اور کوئی کام ہے“۔

”نہیں نہیں، بھائی جی! ہمیں اس مصیبت کے وقت میں تنہا چھوڑ کر نہ جاؤ۔ ابھی ہمیں تمہاری بہت ضرورت ہے“۔ لالہ جی نے درخواست کرنے والے انداز میں کہا۔ ”پتہ نہیں نوشہ وکیل ہائی کورٹ سے حکم امتناعی لاتا ہے کہ نہیں اور دوسرے تم اپنی آنکھوں سے ماتا اور دیپا کی حالت دیکھ ہی رہے ہو“۔

”اچھا تو سمدھی جی میرے لئے کیا حکم ہے؟“ مکیش نے ہاتھ جوڑ کر پوچھا۔

”آپ ہماری خاطر چند روز رک جائیں“۔ لالہ جی نے کہا۔

”میں یہاں اپنے رشتہ دار کمل کے گھر ٹھہرتا ہوں“۔ مکیش نے کہا۔ ”جب بھی میری ضرورت ہو میں حاضر ہو جاؤں گا“۔

◆◆◆

چند روز بعد ہائی کورٹ میں عدالتی ڈگری کے خلاف حکم امتناعی کی شنوائی ہوئی تو ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ والے دو تجربہ کار بڈھے وکیل لائے جبکہ لالہ جی کی جانب سے نوشہ کمل وکالت کر رہا تھا۔

کمرہ عدالت میں جب اس کیس کی شنوائی شروع ہوئی تو متعلقہ جج نے دونوں فریقین کے دلائل سننے اور ثبوت دیکھنے کے بعد لوئر عدالت سے حویلی کے قبضہ از طرف ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ کے خلاف مشروط حکم امتناعی دیتے ہوئے لالہ کیدار ناتھ کو حکم دیا کہ وہ ہائی کورٹ میں حویلی کی ملکیت کے حق میں اپنے دعویٰ کے متعلق دستاویزی، شہادتی ثبوت فراہم کرے۔ نیز متعلقہ جج نے تنبیہ کی کہ وہ اس کیس کا فیصلہ اگلے 3 ماہ میں لازماً کر دے گا۔ لالہ جی کے لئے ہائی کورٹ سے مشروط حکم امتناعی ملنا خوشی اور پریشانی دونوں کا باعث تھا۔

وکیل نوشہ کمل نے اُسے عدالت کے باہر صاف صاف بتایا کہ لالہ کیدار ناتھ یہ چمتکار ہی ہو گا کہ آپ اس حویلی پر تادیر اپنا قبضہ برقرار رکھ سکیں۔ میں قانونی داؤ پیچ کے ذریعہ حویلی کے کیس کو صرف طول دے سکتا ہوں اور دوسرے آپ پر دھرم لعل سے قانونی ہنگامہ اور بھائی شنکر دیال سے مقدمہ بازی الگ معاملات کو نمٹ سکتا ہوں۔

لالہ کے چہرے پر پریشانی اور خوشی دونوں کے اثرات نمایاں تھے۔

”بھگوان بھلی کرے گا، تم فی الحال حویلی چلو“۔ مکیش نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

ہائی کورٹ سے مشروط آرڈر ملنے سے حویلی کے باسیوں کو یہ راحت ملی کہ انہوں نے اس کے خالی ہونے کے خوف کی وجہ سے جو سامان ایک جگہ اکٹھا کیا تھا۔ وہ دوبارہ سے اپنی مقررہ جگہ لگا دیا گیا تھا لیکن ابھی انہوں نے ہائی کورٹ کے حکم کے مطابق کئی ضروری دستاویزات اور شہادتیں پیش کرنی تھیں۔

اس نے ایک بار پھر مکیش، ابا اور مولدر سنگھ کو مشورہ کے لئے اپنی حویلی میں بلوایا۔ مکیش نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں اور میں تمہاری ہائی کورٹ میں طلب کیے گئے متعلقہ کاغذات کی تیاری اور شہادتوں میں مدد کروں گا۔

ابا خاموش رہے انہوں نے لالہ کو کوئی خاص مشورہ نہ دیا لیکن مولدر سنگھ نے لالہ جی کو کہا کہ تم مکیش کی بے عقل کام چلاؤ باتوں پر غور نہ کرو۔ بلکہ ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ اور بھائی شنکر دیال سے کچھ دو کچھ لو کی بنیاد پر کوئی ڈیل کر کے

اپنے اوپر آئی مصیبتوں سے جان چھڑاؤ لیکن لالہ جی نے اس تجویز سے اتفاق نہ کیا۔

"میں حویلی کا ایک انچ حصہ بھی ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ اور بھائی شنکر دیال کو نہ دوں گا"۔ لالہ جی نے دوٹوک لہجے میں کہا۔ "چاہے میں مالی طور پر ٹکے ٹکے کو محتاج کیوں نہ ہو جاؤں"۔

مولدر سنگھ اور مکیش کے درمیان اس معاملہ پر اتنا بحث و مباحثہ ہوا کہ دونوں کے درمیان تلخ کلامی تک نوبت آ گئی۔

"اچھا سمدھی جی!" مکیش نے بحث کو سمیٹتے ہوئے کہا۔ "آپ ابھی چند روز آرام کریں اور میرا خیال ہے کہ مجھے بھی یہاں آئے ہوئے کافی روز ہو گئے ہیں۔ مجھے گاؤں جانا چاہیے۔ میں چند روز بعد دوبارہ آؤں گا اور ہم صورت حال کا جائزہ لے کر اگلا قدم اٹھائیں گے"۔

"ہاں مکیش جی! آپ صحیح کہتے ہیں"۔ ابا نے تائید کرتے ہوئے کہا۔ "لالہ! تو فی الحال چند روز آرام کر۔ تجھے بخار چڑھنے سے پہلے بخار کی گولی نہیں کھانی چاہیے"۔

مکیش واپس اپنے گاؤں چلا گیا۔ اُدھر لالہ بڈھے مقدمہ باز مولدر سنگھ کے ساتھ مل کر ہائی کورٹ کے لئے مطلوبہ کاغذات کی تلاش، تیاری اور مؤثر شہادتوں کے بندوبست میں جت گئے۔ لالہ جی کے پاس حویلی کا پی ٹی او (پرمننٹ ٹرانسفر آرڈر) تو موجود تھا لیکن اس کے پاس وہ صوبائی کمرشل سرٹیفکیٹ موجود نہ تھا جس کے تحت اس نے حویلی کے نیچے دکانیں کھولی ہوئی تھیں اور دوسرا بڑا مسئلہ پکی شہادتوں کے لئے بندوں کی تلاش تھی۔

چند روز تو خیر خیریت سے گزرے پھر ایک روز لالہ کی حویلی کی رسوئی کے دروازے کی چوکھاٹ کے اوپری حصہ میں ایک ایسا پُراسرار چھوٹا سا شعلہ بھڑکا جس کی رنگت سبز اور سرخی مائل تھی۔ اُسے دیکھ کر حویلی کے رہنے والوں نے خوف کے مارے چیخیں مارنا شروع کر دیں۔ وہ شعلہ خود بخود ایک منٹ کے لئے بھڑکا اور بجھ گیا۔ دوسری عجیب اور دلچسپ بات یہ ہوئی کہ جب اُس پُراسرار شعلے کے بجھنے کے بعد اس چوکھٹ کا بغور جائزہ لیا گیا تو اس لکڑی میں آگ لگنے یا جلنے کا بالکل بھی نشان نہ تھا۔ اس پُراسرار منظر کو دیکھنے والوں نے خوف کے مارے پرارتھنا کرنا شروع کر دی۔

ماتا نے سنتو تائی کو بتلایا کہ اس نے اس شعلہ کے بھڑکنے سے پہلے رسوئی کے اندر ایک لمبے قد کی عورت کا ہیولہ دیکھا تھا۔

لالہ نے وہاں کھڑے سب کو سختی سے یہ الفاظ کہے کہ میں اس مسئلہ پر چند جہاندیدہ افراد سے مشورہ کروں گا لیکن خبردار اس واقعہ کے بارے میں تم میں سے کسی نے اپنی زبان کھولی یا کسی کو بتلایا، یاد رکھو! اس بارے میں جس جس کو پتا چلے گا وہ نہ صرف رنگ برنگی باتیں کرے گا بلکہ ہماری جگہ جگہ جگ ہنسائی ہوگی۔

"مجھے حویلی کے اوپری کمرے میں ڈر لگتا ہے"۔ دیپا نے خوف زدہ ہوتے ہوئے کہا۔ "میں اب وہاں نہیں ٹھہروں گی"۔

ماتا نے بھی سہمے ہوئے انداز میں دیپا کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ "پتا جی! میں بھی اب اوپر نہیں بلکہ نیچے رہوں گا"۔

"نہ بابا نہ، میں تو اوپر رسوئی میں قدم بھی نہیں رکھوں گی"۔ سنتو تائی نے بھی اپنے خوف کا اظہار کر دیا۔

"تم سب لوگوں کا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا؟" لالہ جی نے بھناتے، جھنجلاتے ہوئے کہا۔ "تم نے یہ سوچا ہے کہ اس حویلی میں اوپری منزل میں اکلوتی رسوئی ہے جہاں ہم سب کے لئے کھانا پکتا ہے اور اس سے ملحقہ کمرے میں کھانا کھایا جاتا ہے۔ تم میں سے اوپر کوئی نہیں جائے گا تو کھانا کون پکائے گا؟"

"پتاجی! جو بھی ہو میں نے اب ایک لمحہ بھی اوپر نہیں رہنا"۔ دیپا نے صاف انکار کرتے ہوئے کہا۔

"ارے تم لوگوں کے دلوں میں خواہ مخواہ کا وہم پیدا ہو گیا ہے"۔ لالہ جی نے ان کو دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔ "بھگوان پر بھروسہ کر کے تم اوپری منزل میں رہو، میں شام کو مندر سے پنڈت موتی لعل کو بلا کر رسوئی اور اوپری حصہ میں منتا کرواتا ہوں"۔ (منتا: بلائیں دور بھگانے والی ہندو عبادت ہے)۔

شام کو لالہ کیدار ناتھ مندر سے پنڈت کو حویلی میں لے آیا۔ اس نے رسوئی کی چوکھٹ اور حویلی کے مختلف کمروں میں جا کر بُری آتماؤں کو بھگانے کے لئے کچھ منترا اور بھجن پڑھے اور دھونی دی۔ اپنے مخصوص عملیات کے بعد اس نے دیپا اور مانا کو اپنے قریب بلا کر جب ان کے ماتھے کو پکڑ کر کچھ عمل پڑھنا چاہا تو مانا کے منہ سے بڑی بھیانک اور دل ہلانے والی آواز نکلی اس نے یکدم پنڈت کا ہاتھ اپنے منہ میں لے کر اس میں دانت گاڑ دیئے۔ پنڈت کے حلق سے دلدوز کراہ نکلی اور وہ اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی وقت دیپا کے منہ سے ایک خوفناک غراہٹ بلند ہوئی اور وہ بھی پنڈت کو بھنبھوڑنے لگی۔ پنڈت ذبح ہوتی گائے کی طرح ڈکرانے لگا۔ پنڈت کا واویلا سن کر لالہ جی اور تائی سنتو نے بڑی مشکل سے پنڈت کو ان دونوں سے چھڑایا۔ پنڈت کا ہاتھ خون سے لتھڑا ہوا تھا اور مسلسل خون بہہ رہا تھا۔

"چھوڑوں گی نہیں تجھے"۔ دیپا نے خونخوار لہجے میں کہا۔

"تم سب مرو گے"۔ مانا نے فلک شگاف انداز میں کہا۔ "یہاں آگ لگے گی...... تم سب کی چتا یہیں جلے گی"۔ پھر وہ دیوانہ وار قہقہے لگانے لگا۔

اسی دوران رسوئی کے فرش پر ایک سرخی مائل شعلہ نمودار ہوا تو وہاں موجود سب لوگوں نے چیخ و پکار شروع کر

مصروف زندگی: مصروف زندگی میں نماز پڑھنا انتہائی دشوار ہوتا ہے لیکن نماز پڑھنے سے دشوار زندگی آسان ہو جاتی ہے۔

بہترین استاد: آپ کی آخری غلطی آپ کا بہترین استاد ہوتا ہے۔

بحث: فضول بحث کرنے سے آپ اپنا بہترین دوست کھو دیتے ہیں۔

دی۔ چند لمحوں میں اہل محلہ اور ارد گرد کے لوگ شور و غل سن کر حویلی کے اندر ڈنڈے کلہاڑیاں لے کر آ گئے۔

باہر سے آتے لوگ بھی رسوئی کے فرش پر پُراسرار شعلہ دیکھ کر ششدر رہ گئے۔ مسلمانوں نے کلمہ کا ورد شروع کر دیا اور ہندو اپنے منتر جاپ پڑھنے لگے۔ ان میں سے اکثریت تو خوف کے مارے بھاگ گئی۔

"لالہ! تو مان نہ مان تیری حویلی میں کسی بری آتما یا کسی اوپری مخلوق کا سایہ ہے"۔ ایک پڑوسی نے رائے دی۔ "تیری بہو اور بیٹا اس پلید آتما کے قبضے میں ہیں"۔

"میرا تو خیال ہے یہ پاگل ہو گئے ہیں"۔ دوسرے نے کہا۔ "اِنہیں پاگل خانے میں داخل کروا دے"۔ وہاں اس قسم کی تلخ باتیں، جملے گونجنے لگے۔ رسوئی کے فرش پر ابھرنے والا شعلہ حسب معمول اپنے آپ بجھ گیا جبکہ حویلی میں موجود چند لوگ زخمی پنڈت کو اٹھا کر ہسپتال لے گئے۔

دیپا، مانا اور حویلی کے پُراسرار واقعات کی خبر اگرچہ لالہ نہیں چاہتا تھا کہ کسی باہر والے کو ملے لیکن پنڈت کے زخمی ہونے اور رسوئی کے فرش میں آگ لگنے کی خبر ہر ایرے غیرے میں پھیل گئی۔

پھر سے نت نئی باتوں اور مشوروں کا لالہ کو سامنا کرنا پڑتا۔ ادھر حویلی میں سنتو تائی ہر ایک آنے جانے والے کو

یہ سنا رہی تھی کہ مجھے یقین ہے کہ ہماری مصیبتوں اور مشکلات کا اصل سبب میری بہو ہے۔ کوئی اوپری مخلوق اس کے کندھوں پر سوار ہو کر ہمارے آنگن میں وارد ہوئی۔ دیپا سنتو تائی کی اس بات کا کوئی جواب نہ دیتی بس روتی رہتی تھی۔

تین روز بعد گاؤں سے مکیش اور اس کی بیوی حویلی پہنچے۔ ان کی شکل دیکھتے ہی سنتو تائی نے ان پر کوسنوں اور چبھتی باتوں کے نشتر داغنے شروع کر دیئے کہ تم نے اپنی آسیب زدہ بیٹی ہمارے گلے ڈال دی۔ دیپا کی ماں چند لمحہ بت بنی مسلسل سنتو تائی کی جلی کٹی سنتی رہی لیکن ایک وقت ایسا بھی آیا کہ وہ پھٹ پڑی۔

''سدھن جی! بس بس بہت ہوگئی''۔ اس نے غصے سے کہا۔ ''معاف کرنا آپ کی حویلی میں بھائیوں کی لڑائی اور مقدمات کا عتاب دیپا کی شادی سے پہلے ہی تھا۔ میری بیٹی اور آپ کے بیٹے پر یہ پُراسرار دورے اب پڑنے لگے ہیں''۔

''تجھ دو ٹکے کی عورت کی اتنی مجال جو میرے سامنے ایسی گستاخی کرے''۔ سنتو تائی نے آپے سے باہر ہوتے ہوئے کہا۔ ''ہائے رام، دیکھو آج کل گھٹیا خاندان کے لڑکی والے ہم رئیس لڑکے والوں پر بھاری پڑنے کی کوشش کر رہے ہیں...... میں مانتی ہوں کہ اس حویلی میں کلدیپ کی شادی سے پہلے مقدمات، جھگڑے تھے لیکن اب جو حویلی میں پُراسرار آگ لگ رہی ہے اور دوسری طرف تیری بیٹی اور میرے معصوم بیٹے مانا پر اوپری اثرات رونما ہو رہے ہیں۔ مجھے کسی نے بتلایا ہے کہ تیری بیٹی دیپا کے کنوارپنے کے زمانہ سے کوئی اوپری مخلوق اس پر عاشق تھی''۔

''سدھن جی! آپ اپنی حد سے بڑھ رہی ہیں''۔ دیپا کی ماں نے ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''بلکہ اپنی امارت کے زعم میں بڑی رعونت کا مظاہرہ کر رہی ہیں۔ ہم نے اپنی بیٹی زبردستی آپ کے ہاں نہیں بیاہی۔ آپ خود چل کر اپنے بیٹے کے رشتہ کے لئے آئے تھے۔ تب آپ کو ہمارا گھٹیا خاندان نظر نہیں آیا تھا''۔

مکیش نے اپنی بیوی کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ''تو اپنی زبان کو بند رکھ، میں سدھی جی سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ (لالہ ہونقوں کی طرح یہ سارا تماشا دیکھ رہا تھا)

''سدھی جی! ہم بقول سدھن جی کے گھٹیا، نیچ لوگ ہیں''۔ مکیش نے لالہ جی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''معاف کرنا، ہم غریب ضرور ہیں لیکن بے ضمیر اور گھٹیا ذہنیت کے حامل نہیں ہیں۔ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ہماری بیٹی کے منحوس قدم آپ کی حویلی میں پڑے ہیں اور اس کے اوپر کوئی بُری آتما ہے تو ہم دونوں خاندانوں کے لئے یہی بہتر ہے کہ ہم اپنے رشتہ داری کے ناطہ کو خوش اسلوبی سے ختم کرلیں''۔

''نہیں نہیں...... مکیش! تم ایسی سخت بات نہ کرو''۔ لالہ جی نے گھبرا کر کہا۔

''سدھی جی! آپ تحمل سے میری بات سنیں''۔ مکیش نے لالہ جی سے کہا۔ ''میں اپنی بیٹی کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔ میں یہ ہرگز برداشت نہیں کر سکتا کہ جمیری پتری سدھن جی کی الٹی سیدھی بے معنی طنزیہ باتوں کے طعنے سہے''۔

''دیپا تُو ابھی انہی تن پر لگے کپڑوں میں ہمارے ساتھ گاؤں چل''۔ مکیش کی بیوی نے یہ جملہ کہا تو دیپا رونے لگی۔

''ماتا جی! میں یہاں اپنے پتی اور اپنی ساسو ماتا اور پتا جی کے ساتھ بہت خوش ہوں''۔ دیپا نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

''اری میں نے تجھے اپنے پیٹ سے جنا اور تیرے پتا نے تجھے پالا پوسا ہے''۔ دیپا کی ماں نے حیران ہو کر کہا۔ ''ہم تیرے اصل ماتا پتا ہیں اور تُو ان کے گن گا رہی

ہے"۔

"لیکن اب میرے حقیقی ماتا پتا یہی ہیں"۔ دیپا نے فرماں برداری سے کہا۔

"اری جذباتی باتیں نہ کر یہ حویلی کے رئیس تجھے اپنی جوتی تلے کسی چیونٹی کی مانند مسل دیں گے"۔ مکیش نے کہا۔

"مسلنے دیں"۔ دیپا نے کہا۔ "پتاجی! آپ نے خود ہی تو میری رخصتی کے وقت مجھے کہا تھا کہ بیٹی تم نے ہر حال، جلتے ٹھنڈے دنوں میں اپنے سسرال والوں، خاوند کی خدمت کرنی ہے اور تیری وہاں سے ارتھی اٹھنی چاہئے۔ آپ بھگوان کے واسطے یہاں سے جائیں"۔

دیپا نے ہاتھ جوڑتے ہوئے جب یہ جملہ کہا تو سنتو تائی کے چہرے پر چھائے غصے کے تاثرات غائب ہو گئے۔ اُس نے ایک لمحے کے لئے روتی دیپا کی جانب دیکھا اور جذبات میں چند قدم آگے بڑھ کر یکدم دیپا کو اپنے سینے سے لگا کر بولی۔

"بیٹی! تُو نے آج واقعی ایک صحیح بچی بہو ہونے کا سچا مظاہرہ کیا ہے۔ مجھے معاف کر دے میں نے تجھے اپنی پریشانی اور گرم مزاجی میں نہ جانے کیا کیا اول فول بک دیا ہے۔ بھگوان مجھے معاف کر دے۔ تُو بھی مجھے معاف کر دے"۔ دیپا سنتو تائی کے سینے سے لگ کر شدت سے رونے لگی تو لالہ جی نے بھی جذبات میں آگے بڑھ کر اُس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

"ارے ہم تجھے اپنے بیٹے اور اپنی مشترکہ پسند سے لائے تھے"۔ لالہ جی نے کہا۔ "تُو کبھی اپنے دل میں یہ بات نہ لانا کہ تیرا کسی بھی برے حالات میں اس حویلی سے رشتہ ٹوٹے گا"۔ مکیش اور اس کی بیوی حیرت سے بت بنے ہوئے ایک جانب جا کر کھڑے ہو گئے۔

"دیپا بیٹی! اپنی ماتا کو اپنے کمرے میں لے جا کر اُن کی اچھی طرح سیوا کر"۔ لالہ جی نے کہا۔ "میں نے

سچے رشتے

سچے رشتوں کی مثال پانی جیسی ہے بے رنگ، بے شکل، بے ذائقہ، بے جگہ لیکن ہمیشہ زندگی کے لئے نہایت اہم۔

مکیش جی سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں"۔ لالہ جی نے مکیش کو الگ کمرے میں لے جا کر ان کے سامنے مسائل کا پنڈار کھولتے ہوئے ان کے حل کے لئے مشورہ مانگا۔

"میں اور باتیں تو بعد میں کروں گا"۔ مکیش نے ایک لمبی سانس کھینچتے ہوئے کہا۔ "لیکن پہلے میں ہاتھ جوڑ کر آپ سے بنتی (درخواست) کرنا چاہتا ہوں"۔

"ہاں، کہو کیا بات ہے؟" لالہ جی نے کہا۔

"سمدھی جی! جس طرح آپ کو اپنی حویلی پر لگے مقدمات اور اس میں ہونے والے پُراسرار واقعات کی فکر ہے۔ اسی طرح مجھے بھی اپنی بیٹی کے وجود سے لپٹے پُراسرار سائے کی شدید فکر ہے...... آپ اپنے بیٹے کا علاج جہاں سے مرضی کروائیں لیکن میں اپنی بیٹی کا علاج ایک مستند اور ماہر جوتشی ڈھونند سے کراؤں گا"۔

لالہ نے کچھ لمحہ سوچا اور اسے جواب دیا کہ وہ پہلے دیپا کا علاج ڈھونند سے کرائے۔ اگر دیپا کا مسئلہ حل ہو گیا تو پھر ماتا کا علاج بھی وہیں سے کرالیں گے۔

"تو کیا مجھے اجازت ہے کہ میں حویلی اور دیپا کے بُرے اثرات کو زائل کرنے کے لئے ڈھونند جوتشی کو حویلی بلا لوں؟"

"ہاں، تم اپنے بندے کو بلوا لینا یار!" لالہ جی نے جھنجھلاہٹ میں کہا۔

شام کو مکیش حویلی میں ڈھونند جوتشی کو لے کر آیا۔ وہ پستہ قد، کالی رنگت اور چالیس کے درمیان کی عمر کا لگ رہا تھا۔ اس نے پنڈتوں کی طرح پیلے رنگ کا چغہ پہنا ہوا تھا۔

لالہ جی نے اس کے گھٹنے ادب سے چھوتے ہوئے

اسے نمستے کیا تو اس نے بڑی ناراضگی کا اظہار کیا۔
"میں کوئی اتنا بڑا گرو گیانی نہیں ہوں جو آپ میرے گوڈوں کو چھو کر اتنی تعظیم دے رہے ہیں"۔ اس نے کہا۔ "میں تو صرف وہ کوبتل جوتشی ہوں جس نے اپنے گرو سدھار جوتشی سے جادوئی کاٹ کا عمل سیکھا ہے"۔
"یہ کوبتل کیا ہے؟" لالہ جی نے بڑے تجسس بھرے انداز میں پوچھا۔
"کوبتل سے مراد یہ ہے کہ کوئی بھی گرو اپنے شاگرد کو اپنا گیان (علم) مشروط طور پر اسے منتقل کرتا یا سکھلاتا ہے"۔ دھونند نے لالہ کیدار ناتھ کو بتلایا۔ "مجھے میرے گرو نے اس شرط پر اپنا گیان سکھلایا ہے کہ میں کسی سے تعظیما اپنے چرن، گوڈے نہ چھواؤں اور نہ ہی کسی سے اپنے عملیات وغیرہ کا دھیلہ پائی وصول کروں"۔
"تو آپ اپنی بسر اوقات کیسے کرتے ہیں؟" لالہ جی نے اس سے پوچھا۔ "اور آپ نے یہ گیان کیوں سیکھا؟"
"میرے گاؤں میں میرے پتا کی چھوڑی ہوئی اچھی خاصی زرعی زمین ہے"۔ دھونند نے جوابا کہا۔ "اس سے مجھے سالانہ اناج مل جاتا ہے کہ میں گزر اوقات اچھی کر لیتا ہوں اور دوسرا سوال کہ میں نے یہ جوتشی اور جادوئی کاٹ کا اپنے گرو سے گیان کیوں سیکھا۔ دراصل مجھے بچپن ہی سے جادوئی عمل، اُس کے توڑ اور جوتشی بننے کا شوق تھا۔ اگرچہ میرے پتا نے اپنے تئیں مجھے پڑھایا اور بعد میں ایک سکول میں ٹیچر بھی بھرتی کروایا لیکن میں نے اپنے شوق کے حصول کے پیچھے اپنی لگی لگائی سکول کی نوکری چھوڑ کر مشہور زمانہ جوتشی اور ہر قسم کے جادوئی کاٹ کے ماہر سے کوبتل (مشروط) یہ گیان سیکھا"۔
"سمرھی جی!" مکیش نے لالہ کیدار ناتھ کو ایک طرف لے جا کر کہا۔ "اس سے ہم نے اپنے مطلب کا کام نکالنا ہے اور آپ میرا وشواش کریں یہ بڑے کام کا آدمی ہے۔ اس سے الٹے سیدھے سوالات نہ کریں، یہ چڑ جائے گا۔ میں بڑی مشکل سے اسے یہاں لے کر آیا ہوں"۔
"مشکل سے مگر یہ تیرے ساتھ کیسے آ گیا؟" لالہ جی نے پھر تفکرانہ انداز میں اُس سے پوچھا تو جوابا مکیش نے کہا۔ اس سوال کا جواب میں آپ کو بعد میں دوں گا، آپ فی الحال اس کے پاس جائیں۔
دھونند نے اپنی پُرتجسس اور کھوجتی نظریں حویلی کے اوپری منزل پر گاڑھتے ہوئے پوچھا۔ "اوپری منزل کے کمروں میں کتنے باسی رہائش پذیر ہیں؟"
"جی اوپری منزل کے دو کمروں میں سے ایک میری بہو اور بیٹے کے استعمال میں ہے اور دوسرے میں میرا بیٹا مانا رہتا ہے۔ یعنی تین افراد ہیں"۔ لالہ جی نے اسے بتایا۔
"لیکن میرے حساب میں اوپری منزل میں پانچ افراد ہیں"۔ دھونند نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔
"پانچ افراد؟" لالہ جی نے حیرت بھرے لہجہ میں چونک کر کہا۔
"جی ہاں!" دھونند نے آہستگی سے کہا۔ "میرے حساب سے اوپری منزل میں ایک بڑھیا اور ایک کم عمر بچہ بھی رہتا ہے"۔
"لیکن اوپری منزل میں کوئی کم عمر بچہ اور بڑھیا نہیں رہتی"۔ لالہ جی نے پورے یقین سے کہا۔
"اور نچلی منزل میں کتنے بندے رہتے ہیں؟" دھونند نے پوچھا۔
"میں، میری پتنی اور بیٹی یعنی تین"۔
دھونند نے ایک لمحے کے لئے اپنی آنکھیں بند کیں اور پھر انہیں جھٹکے سے کھول کر بولا۔
"ہاں، یہاں آپ صحیح ہو۔ نچلی منزل میں واقعی تین افراد کا بسیرا ہے۔ میرا حساب بھی یہی کہتا ہے...... اچھا باقی باتیں بعد میں ہوتی رہیں گی۔ تم پہلے ان کو میرے پاس بلاؤ

جن پر سایہ کا اندیشہ ہے"۔

دیپا اور مانا کو اس کے سامنے لایا گیا۔ سنتو تائی بھی وہاں آ گئی۔ دھونند نے سب سے پہلے دیپا کو اپنے پاس بلا کر اُس کے ہاتھوں کو بڑی دیر تلک گہری سانس کھینچ کر سونگھا اور پھر اُس نے اسی انداز سے مانا کے ہاتھوں کو سونگھا۔

دھونند جی! آپ نے کیا پایا؟" یہ سوال سنتو تائی نے پوچھا۔

"خبردار! مجھ سے ابھی کوئی سوال نہ پوچھنا"۔ دھونند نے بڑی سختی سے جواباً کہا۔ "مجھے ابھی اپنا کچھ ابتدائی کام کرنے دیں۔ میں خود وقت آنے پر آپ کو بتلاؤں گا بلکہ دکھاؤں گا کہ اس حویلی میں موجود غیر مرئی مخلوق کی کیا حقیقت ہے؟ لیکن میں پہلے ذرا حویلی کی اس رسوئی کا معائنہ کرنا چاہتا ہوں جہاں دیپا اور مانا کو کوئی پُراسرار کالی بڑھیا نظر آئی اور جس چوکھٹ پر پُراسرار شعلہ بھڑکتا ہے"۔

دھونند کو پوری حویلی کے چپہ چپہ، کمروں بالخصوص رسوئی کے پاس اس چوکھٹ پر لے جایا گیا جہاں اکثر پُراسرار شعلہ نمودار ہو کر بجھ جاتا تھا۔ سب دھونند کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ دھونند کی عادت تھی وہ جس جگہ جاتا وہاں کھڑے ہو کر اپنے ہاتھ میں پکڑی دو چھڑیوں کو اس جگہ مار کر کسی اجنبی زبان میں کچھ پڑھتا اور پھر اس جگہ تھوکتا اور پھر کچھ لمحے بعد اس جگہ کو غور سے دیکھتا اور آگے چل پڑتا۔

پھر دھونند دوبارہ رسوئی کے اندر گیا۔ وہاں اس نے کافی دیر تک کچھ پڑھا اور پھر واپس آ کر اس نے سب گھر والوں کو کہا کہ سب میرے پاس جمع ہو کر حلقہ بنا کر میری باتیں غور سے سنیں اور درمیان میں کچھ نہ بولیں۔

"میں نے تم سے دو بڑی اہم باتیں کرنی ہیں"۔ اس نے کہا۔ "پہلی تو یہ کہ میں نے اس حویلی میں پُراسرار مخلوق کی موجودگی کو بھانپ لیا ہے اور یہ واقعی رسوئی کے

رابطہ

رشتوں کی بقا کے لئے رابطے ضروری ہیں کیونکہ بھول جانے سے تو اپنے ہاتھوں سے لگائے درخت بھی سوکھ جاتے ہیں۔ (حضرت علیؓ)

آخری کونے جہاں کوئلوں کا بنا چولہا موجود ہے وہاں بسیرا کئے ہوئے ہے۔ مجھے فی الحال ایک اچھی عمر کی چڑیل کا ادراک ہوا ہے لیکن میرا یقین یہ بھی ہے کہ اس جگہ کوئی ایک اور چھوٹی مخلوق بھی ہے"۔

"اس کا مطلب ہے"۔ کلدیپ نے گھبرائی حالت میں پوچھا۔ "اس حویلی میں دو پُراسرار مخلوقوں کا ڈیرا ہے"۔

"ہاں تمہارا خیال بالکل صحیح ہے"۔ دھونند نے کہا۔ "میری گیانی نگاہیں اس امر کی چغلی کھا رہی ہیں کہ واقعی اس حویلی میں ایک نہیں دو پُراسرار قوتیں موجود ہیں"۔

"میرا تو دل ہول رہا ہے۔ ہائے رام یہ ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟" سنتو تائی نے حسب عادت یہ بات چلا کر کی۔

"ماتا جی! یہ سینہ کوبی پاگل پنا بند کرو"۔ دھونند نے انہیں ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "اور جیسا کہ میں نے تم سب سے بنتی کی ہے کہ خاموشی سے میری باتیں سنو درمیان میں نہ ٹوکو"۔

لالہ جی نے غصیلی نگاہوں سے سنتو تائی کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "بت بنی کھڑی رہ کر دھونند جی کی باتیں سن"۔

"دوسری میں نے تم لوگوں کے سامنے یہ حقیقت بیان کرنی ہے"۔ دھونند نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "تمہارا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ دیپا کے وجود پر اس کے کنوارپنے سے ہی کوئی اوپری سایہ اپنا ڈیرا ڈالے ہوئے ہے۔ رہا سوال مانا کا کہ اس کو اس پُراسرار مخلوق نے اپنا ہدف کیوں بنایا۔ سوال کا مختصر جواب یہ ہے کہ اس حویلی

میں انسام نامی چڑیل موجود ہے۔ انسام چڑیل کے اندر جناتی خصوصیات موجود ہوتی ہیں یعنی یہ نر اور مادہ دونوں خصوصیت کی حامل ہے اور یہ اُن معصوموں پر آسانی سے حاوی ہوتی ہے جن کا رتم کمزور ہوتا ہے۔ اب آپ پوچھو گے کہ رتم کیا ہوتا ہے۔

رتم دراصل ہر انسان میں ایسی قدرتی طاقت کی ڈھال ہوتی ہے جس کی بناء پر کوئی بھی انسان قدرتی طور پر کسی غیر مرئی مخلوق کی شر انگیزی سے محفوظ رہتا ہے، بالخصوص دیپا اور مانا کا رتم انتہائی کمزور ہے۔ ہاں اب آپ لوگوں کو میری طرف سے اجازت ہے مجھ سے کسی بھی قسم کا سوال پوچھیں لیکن پہلے بڑے مجھ سے بات کریں"۔

"دھونند جی! آپ نے ہمیں یہ نہیں بتلایا کہ یہ پُر اسرار مخلوق کب سے ہماری حویلی کی رسوئی میں اپنا ڈیرا جمائے ہوئے ہے؟" لالہ جی نے پوچھا۔ "یہ کیسے ہماری مصیبتوں میں اضافہ کرنے کے لئے یہاں آ گئی اور آخری بات یہ کہ اس کا توڑ کیا ہوگا؟"

"میں فی الحال آپ کو آپ کے تینوں سوالوں میں سے تیسرے سوال کا جواب دے سکتا ہوں"۔ دھونند نے کہا۔ "وہ یہ کہ یہ میرا آپ سے وعدہ ہے کہ میں آپ کی حویلی میں موجود اس پُر اسرار مخلوق کو بھگانے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ اگرچہ یہ کام بڑے جوکھم اور بلیدان پر مشتمل ہوگا اور بلیدان بھی اس راہ میں ایسا دینا ہوگا جس کا آپ نے سوچا بھی نہ ہوگا...... رہا لالہ جی آپ کے بقیہ دو سوالات کا جواب کہ یہ مخلوق کب آئی، کیسے آئی، کیوں آئی تو اس کا جواب میں آپ کو اپنے رات کے عمل کے بعد صبح بتلاؤں گا۔ سر دست میں آپ کے اوپری دونوں سوالات کے جواب دینے سے قاصر ہوں"۔

"اچھا تو اب ہمیں کیا کرنا چاہئے؟" کلدیپ نے اس سے پوچھا تو دھونند اس کے بجائے لالہ کیدار ناتھ کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔

"لالہ جی! میں نے آپ کو حویلی میں موجود پُر اسرار مخلوق کی موجودگی کی نشاندہی کر دی ہے۔ اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ میں اس حویلی پر آئی پُر اسرار مخلوق سے چھٹکارا دلانے کے عمل میں اپنا کردار ادا کروں یا نہ کروں"۔

"ہاں، ہاں کیوں نہیں دھونند جی!" لالہ جی نے کہا۔ "ہمیں آپ کے گیان پر پورا وشواس ہے۔ آپ ہی نے ہمیں اس مصیبت سے چھٹکارا دلانا ہے۔ ہماری طرف سے آپ کو اجازت آپ جو اس حویلی کے لئے بہتر سمجھیں، وہ کریں"۔

"لالہ جی! آپ نے بے شک مجھے حویلی میں موجود پُر اسرار مخلوق کے خلاف عمل کرنے کی اجازت دے دی ہے"۔ دھونند نے سنجیدگی سے کہا۔ "لیکن آپ کو میرے عمل کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے چند کڑے تقاضے پورے کرنے ہوں گے"۔

"کیسے تقاضے؟" لالہ جی نے اس کی جانب سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میں نے جیسا کہ پہلے ہی آپ کو بتلایا ہے کہ میں کومل جوتشی ہوں"۔ دھونند نے کہا۔ "میں نہ کسی سے اپنے نیک عمل کا کوئی دھیلہ لیتا ہوں اور نہ ہی کسی سے اپنی تعظیم کرواتا ہوں لیکن آپ نے اگر مجھ سے اپنا مقصد حاصل کرنا ہے تو سب سے پہلے آپ کو مجھے اپنی حویلی کی حدود میں ایک علیحدہ کمرہ دینا ہوگا جہاں میں نے اپنے عملیات سے اس حویلی میں موجود پُر اسرار مخلوق کو کھدیڑنا ہے لیکن یہ کام طویل ہوگا اور دوسرے جیسا میں کہوں گا ویسا تم لوگوں کو کرنا ہوگا اور تیسری شرط یہ ہے کہ میں آپ کو ایک دن کا وقت دیتا ہوں آپ اچھی طرح مشورہ کر کے یہ سوچ لیں کہ جب میں اپنا عمل شروع کروں تو اسے بھگوان کے واسطے درمیان میں تڑوانا نہیں ورنہ یہ نہ صرف آپ کے پریوار، اس حویلی بلکہ میرے لئے بھی عذاب اور مصیبت کا

باعث ہوگا اور آپ مجھے اپنے فیصلے سے جلد آگاہ کریں تا کہ میں اپنا راستہ لوں"۔

"اچھا دھوند جی! میں آپ کو آج شام ہی اپنے فیصلے سے آگاہ کر دوں گا"۔

شام کو لالہ جی ہمارے گھر محلہ کے دو بزرگوں اندو کمار اور بیرال سنگھ کو لے کر آئے۔ اس میٹنگ میں لالہ نے دیپا، ماتا کی دماغی حالت، حویلی کی رسوئی میں لگنے والی پُراسرار آگ اور دیگر مسائل کے علاوہ دھوند کی جانب سے پُراسرار مخلوق کی نشاندہی اور اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے اس کی شرائط کا ذکر کیا۔

"آپ سب میرے قابل اعتبار مخلص پڑوسی ہیں"۔ لالہ کیدار ناتھ نے بڑی مایوس، پریشان کن آواز میں کہا۔ "مجھے کوئی ایسا حل بتلاؤ جس کی بناء پر میں اس گرداب سے نکل پاؤں"۔

ابا نے اسے مشورہ دیا کہ اگر دھوند میں واقعی تیری حویلی میں موجود نادیدہ پُراسرار مخلوق کو بھگانے کی صلاحیت ہے تو تجھے لازماً اسے اپنی حویلی میں اس کے عمل کرنے کے لئے کوئی علیحدہ کمرہ دے دینا چاہئے لیکن ایک بار اس کی اچھی طرح تصدیق کروالے کہ وہ واقعی ان پُراسرار واقعات کو سمجھنے اور اس کی کاٹ کرنے والا مستند انسان ہے کہ نہیں"۔

"ہاں، بھائی عظیم صحیح کہتے ہیں"۔ درمیان میں اندو کمار نے ابا کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ "ایسا نہ ہو کہ وہ کوئی نوسر باز ہی ہو"۔

"لیکن اس کی گارنٹی تو مکیش دے رہا ہے"۔ لالہ نے کہا۔ "بھگوان جانے وہ روپے میں کتنے آنہ سچا ہے؟"

"بیرال سنگھ! تم اس معاملہ میں کیا کہتے ہو؟" ابا نے اُسے پوچھا۔

"میرے ذہن میں دو باتیں ہیں"۔ بیرال سنگھ نے بڑے تفکرانہ انداز میں کہا۔ "پہلی تو یہ کہ دھوند جو اپنے آپ کو اتنا بڑا گیانی اور پُراسرار مخلوق کی کاٹ کا ماہر کہتا ہے۔ وہ کسی غرض سے مکیش کے کہنے پر یہاں آیا ہے۔

لالہ! تُو ایسا کر کہ مکیش سے یہ چند باتیں پوچھ کہ دھوند تیرے کہنے پر یہاں آیا ہے اور وہ کتنے عرصہ میں اس حویلی کو پُراسرار مخلوق کے وجود سے پاک کرے گا؟"

اندو کمار نے کہا کہ بہتر یہی ہے کہ ابھی مکیش کو یہاں بلا کر تمام باتیں کلیئر کر لی جائیں۔

ابا نے مجھے بھیج کر مکیش کو میٹنگ میں بلایا اور یہی سوال اس سے پوچھے۔

"میں دھوند کو اس کے پُرکھوں سے جانتا ہوں"۔ مکیش نے کہا۔ "اس نے واقعی مایہ ناز جوتشی سدھار سے بڑی کڑی تپسیا کر کے گیان حاصل کیا ہے۔ دھوند میرا تابعدار اس لئے ہے کہ اُسے میرے پتا کی سفارش کی بناء پر سدھار جیسے معتبر جوتشی نے اپنا شاگرد بنایا تھا۔ میں اس کے سر پر کھڑے ہو کر اس سے جلد سے جلد کام کرواؤں گا اور رہا سوال اسے اس کے کام کے عوض لینے دینے کا وہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں اور ویسے بھی یہ کوئی مسئلہ ہے۔ اس نے اپنے کام کو جگ سیوا کے تحت کرنا ہے"۔

"مکیش جی! آپ کو بخوبی علم ہے کہ لالہ کتنے مسائل کا شکار ہے"۔ بیرال سنگھ نے کہا۔ "اب آپ اپنی نگرانی میں اور ذمہ داری سے دھوند سے کام کروائیں"۔

دھوند کو حویلی کی اوپری منزل پر رسوئی کے بالکل ساتھ رہنے کے قابل ایک ایسا عارضی کمرہ بنوا دیا گیا جس میں اس کے سونے بیٹھنے، عملیات کے لئے وافر جگہ تھی۔

لالہ نے مکیش کو کہا کہ دھوند سے کہو کہ وہ اگلے پندرہ روز میں اس حویلی کی رسوئی میں موجود چڑیل اور پُراسرار بچہ نما مخلوق کو بھگائے۔ دھوند نے سب سے پہلے ماتا کو اپنے پاس بلا کر اُسے کہا کہ ایک پانی کی بھری بالٹی میں کھڑا ہو جا اور جب تلک میں تجھے نہ کہوں تُو نے اس بالٹی سے ہلنا نہیں ہے۔

''یہ مجھ سے نہ ہوگا''۔ مانا نے کہا۔

''یہ تجھے ہر حال میں کرنا پڑے گا، یہی تیرے لئے بہتر ہے''۔ دھونند نے مانا کو یہ بات سختی سے کہی تو وہ آنکھیں بند کئے پانی سے بھری بڑی بالٹی میں کھڑا ہو گیا۔ دھونند نے اپنا عمل شروع کیا تو بالٹی کے پانی میں سے دھواں سا اٹھتا محسوس ہوا۔

''پتا جی پانی گرم ہونے کی وجہ سے میرے پاؤں جل رہے ہیں''۔ اچانک مانا چلانے لگا۔ ''ارے یہ مجھے کیا ہو رہا ہے، میری نگاہوں کے سامنے ایک کالی بڑھیا کا ہیولا بن رہا ہے''۔

''کدھر ہے؟'' فکر بھری آواز میں لالہ نے اُس سے پوچھا۔

''بھگوان کے واسطے دھونند جی! مجھے بالٹی سے نکالو میرے پاؤں بُری طرح جل رہے ہیں''۔ مانا فریاد کرنے لگا۔

''ابے چھوکرے! چند سیکنڈ دھیرج (برداشت) کا مادہ رکھ''۔ دھونند نے کہا۔ ''میں تیرے وجود سے گندی روح کو نکال کر ہی دم لوں گا''۔

''میرا بچہ مر جائے گا۔ ارے بھگوان کا خوف کر میرے بچے پر اتنا ظلم نہ کر۔ تُو یہاں سے چلا جا ہم نے تجھ سے کوئی توڑ نہیں کروانا''۔ سنتو تائی نے وہاں کھپ ڈالنا شروع کر دی۔

''لالہ جی! اپنی ناسمجھ پتنی کو کہیں کہ کمرے میں چلی جائے۔ یہ میرے عمل کو ضائع کر رہی ہیں''۔

لالہ کیدار ناتھ سنتو تائی کا ہاتھ پکڑ کر کمرے میں لے گیا۔

ادھر مانا کا بالٹی میں بخود بخود گرم ہوتے پانی میں کھڑے برا حال ہو رہا تھا۔ مانا بڑا جبر کئے ابلتے پانی میں کھڑا رہا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اُس کی ٹانگیں لڑکھڑانے لگیں۔

''اب میں گر جاؤں گا''۔ مانا نے روتی آواز میں کہا۔

''اچھا اچھا دو منٹ اور صبر کر لے''۔ دھونند دو، دو منٹ کہہ کہہ کر اسے تسلی دیتا رہا تقریباً پندرہ منٹ بعد دھونند نے مانا کو بالٹی سے نکلنے کا کہا۔

بالٹی سے نکلتے ہی مانا زمین پر دھڑام سے گر کر نیم بے ہوش ہو گیا۔ اس کے پاؤں پہلے بالکل برف کی طرح سفید اور پھر کچھ دیر بعد ہلکے نیلے سے پڑ گئے تھے۔

''یہ تُو نے میرے بچے کے ساتھ کیا کیا؟'' لالہ جی نے گھبرا کر دھونند سے پوچھا۔

''لالہ جی! میں جو کچھ بھی کشٹ کر رہا ہوں آپ کے فائدے ہی کے لئے کر رہا ہوں''۔ دھونند نے جواباً کہا۔ ''میں نے مانا کے وجود سے چمٹی بری مخلوق کو کھدیڑ دیا ہے لیکن تنکا گھبرا گیا اس لئے ابھی کچھ کسر باقی ہے''۔

''اب بھی کسر باقی ہے؟'' لالہ نے اس کی جانب طنزیہ طور پر دیکھ کر کہا۔

''اگر آپ نے مجھے اسی طرح کی طنزیہ باتیں کرنی ہیں تو میں ابھی سے اپنا کام ادھورا چھوڑ کر چلا جاؤں گا''۔ دھونند نے سرخ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن میں اپنے من سے چاہتا ہوں کہ تم لوگ اس مخلوق کے عتاب سے چھٹکارا حاصل کر سکو''۔

لالہ جی نے اس کا یہ غصیلا جملہ سنا تو اس نے فوراً اپنا انداز بدلتے ہوئے کہا۔ ''ارے وہ دراصل پتا کی حیثیت سے بچے کی تکلیف کو نہ دیکھ سکا''۔

''میں تھوڑی دیر بعد اس کا حل بتلانے کے ساتھ تمہارے اس سوال کا جواب دوں گا۔ جس میں تم نے مجھ سے پوچھا تھا کہ اس حویلی میں یہ پُر اسرار انتام نامی چڑیل اور بچہ نما جن کیسے داخل ہوا''۔ دھونند نے کہا۔

''ہاں، ہاں ہمیں اس انکشاف کا بڑی بے صبری سے انتظار ہے''۔ لالہ جی نے تجسس بھرے لہجے میں کہا۔

''بھلا پتا تو چلے کہ ہماری خوشیوں کا حاسد دشمن کون ہے؟''
''اچھا مانا کو اچھی طرح سے صاف پانی سے اشنان کرواؤ اور یاد رہے اس کے پاؤں پر جہاں نیلا رنگ ابھر آیا ہے وہاں کسی قسم کا حکیمی، ڈاکٹر مرہم، پوڈر دوائی نہیں لگانی بھگوان نے چاہا تو اس کے وجود سے انسام جلدی اپنا شکنجہ چھوڑ دے گی''۔

دھونند حویلی کی نچلی منزل میں آیا اور اس نے سنتو تائی اور لالہ کے سامنے یہ انکشاف کیا کہ اس کے گیان کے مطابق اس حویلی کا سکون برباد کرنے کے لئے کسی لال بالوں والی عورت نے کسی سفلی عمل کرنے والے کی مدد سے اس حویلی کی رسوئی میں انسام نامی چڑیل اور جن بچہ داخل کیا ہے۔

''ہائے رام، یہ جوتشی تو ہو بہو شنکر دیال کی پتنی کا حلیہ بتلا رہا ہے''۔ سنتو تائی نے چلا کر کہا۔ ''بھگوان اس کا بیڑا غرق کرے''۔

لالہ نے ایک ٹھنڈی آہ لیتے ہوئے دھونند سے سوال کیا کہ اب تم نے کیا کام کرنا ہے؟

''میں اس حویلی میں موجود کئی مسائل کو ایک ایک کر کے بڑی محنت سے حل کروں گا''۔ دھونند نے جواباً کہا۔ ''میں سب سے پہلے مانا پر چھائی کالی عورت سے لڑ رہا ہوں۔ لالہ جی! آپ جلد اپنی آنکھوں سے میرا کام دیکھ لیں گے لیکن میرے اگلے عمل میں مانا کو آج سے زیادہ تکلیف ہو گی۔ مجھے اس امر کا دلی افسوس ہے کہ اس معصوم بچے کو اس عمل سے تکلیف پہنچتی ہے لیکن میرا ایسا کرنا مجبوری ہے۔ میرے حساب سے میں نے اس کے جسم میں چمٹی گندی مخلوق کے پنجے اکھاڑ دیئے ہیں۔ اب میں اپنے اگلے قدم میں مانا کے جسم کو اپنے عمل سے مکمل طور پر صاف کروں گا۔ میں یہ کام ایک آدھ دن بعد کروں گا۔ وہ اس لئے کہ اب وہ اگلے مرحلے تکلیف برداشت نہ کر سکے گا''۔

(یہ سنسنی خیز کہانی جاری ہے)

دیوار برلن کا کوئی نام ونشان باقی نہیں رہا لیکن اسے جدائی، علیحدگی اور تفریق کے استعارے کے طور پر آج تک استعمال کیا جاتا ہے۔

فرزانہ نگہت

دوسری جنگِ عظیم کے بعد فاتحین روس اور امریکہ نے شکست خوردہ جرمنی کو دو حصوں مشرقی و مغربی جرمنی میں تقسیم کر دیا تھا۔ اس تقسیم سے اس کا دارالحکومت برلن بھی جو دونوں حصوں کے درمیان واقع تھا، دو حصوں مشرقی و مغربی برلن میں تقسیم ہوگیا تھا۔ ان دو حصوں کے درمیان ایک لمبی چوڑی دیوار کھڑی کر دی گئی جو دیوار برلن کہلاتی تھی۔ یہ دیوار دو نظریات کیمونزم اور جمہوریت کے مابین تفریق کی علامت تھی، برسہا برس تک کھڑی رہی۔

مشرقی جرمنی میں جو روس کے زیر اثر تھا، کیمونسٹ نظریات پھلتے پھولتے رہے۔ وہاں کیمونسٹ حکومتیں آتی جاتی رہیں جبکہ مغربی جرمنی میں ایک سچی جمہوری ملک کی حیثیت سے اپنا وجود قائم رکھے رہا۔ یہاں تک کہ دونوں حصوں کے باشندوں اور حکومتوں کی مرضی سے 1996ء میں یہ دیوار ڈھادی گئی۔ اس وقت روسی حکومت بے حد کمزور پڑ چکی تھی۔ افغانستان کی جنگ نے اس کی معاشی حالت بالکل تباہ کر دی تھی جس کے سبب اس کے لئے مشرقی دیوار والے مقبوضات پر اپنا قبضہ برقرار رکھنا ممکن نہ رہا تھا۔ وسط ایشیائی ریاستوں کے روسی استبداد سے چھٹکارا پانے کے ساتھ ہی مشرقی یورپی ممالک بھی روسی شکنجے سے تدریجاً رہائی پاتے چلے جا رہے تھے۔ مشرقی، مغربی جرمنی کے ادغام کا سبب بھی یہی روسی شکنجے کا ڈھیلا ہونا تھا۔ جرمنی کے یہ دونوں حصے آپس میں متحد و مربوط ہو کر پہلے جیسا "ڈیموکریٹک ری پبلک آف جرمنی" بن گئے اور برلن بھی ایک متحد اور کھلا شہر بن گیا لیکن یہ اب جمہوریہ جرمنی کا دارالحکومت نہیں رہا۔

اب جمہوریہ جرمنی جنگِ عظیم سے پہلے کا جرمنی بن چکا ہے اور برلن اس کا انتہائی ترقی یافتہ شہر۔ کیمونزم کا نام و نشان کبھی کا مشرقی حصے سے مٹ چکا ہے۔ دیوار برلن کا کوئی نام ونشان باقی نہیں رہا لیکن اسے جدائی، علیحدگی اور تفریق کے استعارے کے طور پر آج تک استعمال کیا جاتا ہے۔

یہاں ایسی ہی ایک دیوار برلن کا ذکر کیا جا رہا ہے جس کا بظاہر کوئی حقیقی وجود نہیں لیکن اس کے غیر مرئی وجود کو بخوبی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ یہ دیوار برلن دنیا کے امیر اور غریب ممالک کے درمیان کھڑی ہے اور فی الحال اس کے ڈھائے جانے کے دور دور تک کوئی امکانات نہیں دکھائی دیتے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہی دیوار برابر بلند اور چوڑی ہی ہوتی چلی جا رہی ہے۔ اسے ڈھانے کی مخلصانہ یا نیم دلانہ جتنی بھی کوششیں کی جا رہی

ہیں وہ بے کار ثابت ہو رہی ہیں۔

دنیا کے اکثر ممالک کے حالات ایسے ابتر ہیں کہ حیرت ہوتی ہے کہ وہاں انسان آخر کس طرح اب تک زندہ چلے آ رہے ہیں۔ مثلاً براعظم افریقہ کے اکثر ممالک۔ بھوک اور فاقہ مستی کی جیتی جاگتی تصویریں صرف وہیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ وہاں لوگ ننگی زمین پر سوتے ہیں جس پر ہر طرح کے حشرات رینگتے پھرتے ہیں۔ وہاں پینے کا پانی نہیں، بجلی نہیں۔ دنیا کے اس خطے میں سورج بھی جلد ہی غروب ہو جاتا ہے یعنی شام چھ بجے۔ یوں اس وقت سے لے کر صبح چھ بجے تک ایک شخص کو مکمل تاریکی میں رہنا پڑتا ہے۔ ایک فلیش لائٹ ایک ڈالر میں آتی ہے اور سینی گال کے کسی شخص کے پاس یہ خریدنے کے لئے ایک ڈالر بھی نہیں۔

ہمارے کرہ ارض میں دو معاشرے ہیں جو متضاد ثقافتوں یا تمدنوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ایک ثقافت صارفیت اور تعیشات کی ہے۔ دولت کی ریل پیل اور خوشحالی کی اور دوسری غربت، تہی دستی، فکر فردا، خالی پیٹ اور مواقع کی عدم دستیابی کی۔ ان دونوں ثقافتوں کے درمیان خلیج اتنی چوڑی اور نمایاں ہے کہ جب آپ دنیا کا سفر کریں گے تو ان کے مابین تناؤ اور مخاصمت واضح طور پر محسوس کریں گے۔

بھوک اور افلاس انتہائی شرم ناک عوامل شمار ہوتے ہیں۔ غریب آدمی اپنی غربت اور بدحالی پر شرمندگی اور تذلیل محسوس کرتا ہے۔ جن لوگوں سے نسل ہا نسل سے غربت اور افلاس بھری زندگیاں گزاری ہیں وہ کچھ کر دکھانے کے قابل نہیں ہوتے۔

افلاس کی ایک اور خاصیت شہروں اور دیہاتوں میں رہنے والوں کے مابین کشاکش ہے۔ تیسری دنیا کے ممالک میں زراعت انتہائی پست درجے پر پہنچی ہوئی ہے کیونکہ حکومتیں شہروں ہی کی فلاح و بہبود کی طرف توجہ دیتی ہیں اور اشیائے خورد و نوش کی قیمتوں پر کنٹرول کر کے انہیں اتنا سستا بنا دیتی ہیں کہ کسانوں کو کوئی منافع حاصل نہیں ہوتا اور وہ کاشت کاری چھوڑ کر شہروں کا رخ کرنے لگتے ہیں۔ وہاں انہیں اپنی زندگی دیہاتی زندگی سے زیادہ بہتر معلوم ہونے لگتی ہے۔ وہاں ان کے لئے روزگار کے مواقع بھی ہوتے ہیں اور کچھ دیگر سہولیات بھی مہیا ہوتی ہیں۔ ان کے شہر منتقل ہونے کے سبب شہروں میں کچھ آبادیاں وجود میں آ جاتی ہیں۔ یوں نئے اور پرانے رہائشیوں کے مابین مناقشت جنم لیتی ہے۔

یہ غربت و افلاس کے عام خدوخال ہیں جو اعصابی و ذہنی تناؤ و دباؤ، جارحیت اور مفادات کے ٹکراؤ کی عکاسی کرتے ہیں۔ غریب معاشرے منظم انداز میں کوئی کام نہیں کر سکتے کیونکہ وہ اندرونی کشاکش، کھینچا تانی اور مناقشتوں سے پہلے ہی توڑ پھوڑ کا شکار ہوتے ہیں۔

تیسری دنیا کے ممالک کا گھمبیر ترین مسئلہ ناانصافی اور طبقاتی عدم توازن ہے۔ وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم اور بالادست طبقے کی لوٹ مار اس کی بڑی وجہ کہی جا سکتی ہے۔ اعداد و شمار کے مطابق چھ ارب لوگوں میں سے اسی کروڑ لوگ افلاس اور فاقہ مستی کی زندگی گزار رہے ہیں جبکہ درحقیقت چار ارب لوگوں کی دو تہائی تعداد غربت و افلاس میں مبتلا ہے۔

یہاں کرنے کا اہم ترین کام یہ ہے کہ ان فاقہ کشوں کو خوراک کیسے مہیا کی جائے؟ بین الاقوامی تنظیمیں ان فاقہ مست لوگوں کو خوراک مہیا کرنے کا کام کر رہی ہیں۔ انہیں چاول اور اناج مہیا کئے جاتے ہیں۔ دیگر اشیائے خورد و نوش کے علاوہ کپڑے، ادویات اور گھریلو استعمال کی چیزیں بھی مہیا کی جاتی ہیں۔

بھوک کا تعلق انتہائی خراب و خستہ قسم کے گزارن کے حالات تعلیم کا فقدان، بیماری، خاندانی روابط معاشرتی ڈھانچے کے عدم وجود اور کامیابی یا منافع کے

غائب امکانات کے نہ ہونے اور غیر پیداواریت سے ہے۔

ہم اکثر ٹی وی پر غربت و افلاس کے مارے ملکوں کے بدحال فاقہ مست لوگوں کو بین الاقوامی فلاح و بہبود کی تنظیموں سے اشیائے خورد و نوش و دیگر اشیائے ضرورت وصول کرتے دیکھتے ہیں لیکن صرف اتنا کر لینے سے ان لوگوں کے کسی قسم کے مسائل حل نہیں ہوا کرتے سوائے اس کے کہ انہیں کچھ وقت کے لئے پیٹ بھر لینے اور تن ڈھانکنے، علاج معالجہ کے لئے کچھ مل جاتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کے لئے زندگی گزارنے کے لئے وسائل مہیا کئے جائیں، انہیں کام کی جگہوں پر بھیجا جائے، اوزار و آلات فراہم کئے جائیں۔ مشرقی ممالک میں بالعموم یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ اگر کسی زمین پر عرصۂ دراز تک کاشت کاری نہ کی جائے تو وہ بنجر ہو جاتی ہے اور غربت کے مارے کسانوں کے پاس نہ ہل بیل ہوتے ہیں، نہ بیج اور نہ کھاد۔

وسائل کی منصفانہ تقسیم اور جدید ترین ٹیکنالوجی کے استعمال سے بھوک کو تو کافی حد تک محدود کیا جا سکتا ہے لیکن ہم غربت کو کیسے کم کر سکیں گے؟

تیسری دنیا کے ممالک میں معیارِ تعلیم پست سے پست ہوتا جا رہا ہے کیونکہ بچوں کو مہنگی سٹیشنری خرید کر دینا ہر باپ کے بس کی بات نہیں۔ اکثر افریقی ممالک میں ایسے بچے بھی دیکھنے میں آتے ہیں جو بھیک میں کھانے پینے کی چیزیں نہیں مانگتے بلکہ پین مانگتے ہیں کیونکہ وہ سکول تو جاتے ہیں لیکن ان کے پاس لکھنے کے لئے پین نہیں ہوتا۔

ایسے معاشرے نئی تبدیلیوں اور اختراعات کو بے دلی سے ہی قبول کرتے ہیں۔ اگر میرے پاس ایک لاکھ روپے ہیں اور میں نے ننانوے ہزار کی سرمایہ کاری کی ہے اور اس میں نقصان اٹھایا ہے تو پھر بھی میرے پاس دس ہزار بچ رہے ہیں لیکن اگر میں نے پوری رقم کی سرمایہ کاری کی ہے اور یہ ڈوب گئی ہے تو یہ میرے لئے واقعی بڑی نقصان کی بات ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مسئلہ صرف سرمایہ کاری کا نہیں بلکہ دلچسپی، غرض، نیک اندیشی اور خیر خواہی کا ہے۔ جن کا یہاں فقدان دکھائی دیتا ہے۔

ترقی یافتہ دنیا کے مفادات خود غرضی، بے نیازی، مطلب پرستی کے حاشیے کے گرد لپٹے ہوئے ہیں۔ یہ تیسری دنیا کے ملکوں کو جاہلوں، وحشیوں اور غیر مہذب لوگوں کا معاشرہ سمجھتے ہیں۔ اس دیوارِ برلن کے پار سے جو خبریں ان تک پہنچتی ہیں وہ جنگوں، جرائم، دہشت گردی، مہاجرت، قحط کی ہوتی ہیں۔ یعنی ایسی چیزیں جنہیں یہ ترقی یافتہ ممالک اپنے لئے شدید خطرہ سمجھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ یہ ممالک کبھی ان کے ہم پلہ نہ ہوں اور یہ میدان میں ہمیشہ ان کے دست نگر اور محتاج بن کر رہیں۔ یہ ہرگز اس دیوارِ برلن کو نہیں ڈھانا چاہتے۔

اگر ہم حقیقت تسلیم کر لیں کہ دنیا کے تمام لوگ جغرافیہ، تاریخ، آب و ہوا اور تہذیب و تمدن کے تفاوت کے باوجود آبرومندانہ طور پر جینے کا حق رکھتے ہیں تو ہم ان لوگوں کو جو غربت و افلاس کے کلچر میں پلے بڑھے ہیں احساسِ کمتری، توہین و تذلیل سے نجات دلانے کا ثواب کما سکیں گے۔ نئے نظریات کہ کس طرح مزید آزادی حاصل کی جا سکتی ہے اور ترقی کا نیا نظریہ اس کلچر کے اندر پیدا کیا جانا چاہئے۔ اس کے لئے لوگوں کو دانشوروں اور سیاستدانوں کی ایک نئی نسل کی ضرورت ہے۔ انہی کی طرح کے جنہوں نے انہیں سیاسی آزادی عطا کی لیکن اس کا مطلب بہرکیف یہ نہیں ہے کہ ترقی یافتہ دنیا غربت و افلاس کی دنیا کو بھول جائے اور اس کی مدد سے ہاتھ کھینچ لے۔

★★★

بیٹھے لیٹے اس کی آنکھیں اور سماعتیں روشنی کی جانب ہی نگران رہیں۔ تھوڑی ہی دیر بعد روشنی والا قریب آ گیا، وہ اکیلا تھا۔ تابش نے جلدی سے سر جھکا کر سانس روک لی، حالانکہ آنے والے کے قدموں اور لباس سے اٹک کر سرکنڈے اچھا خاصا شور کر رہے تھے۔

''چھوٹے صاحب!......'' ٹارچ والے نے اس کے چھپنے کی جگہ سے چند قدم آگے بڑھ کر درمیانی آواز میں پکارا۔ وہ سلطان تھا۔

تابش حقیقتاً حیرت سے اچھل پڑا، مگر اس کے دل کے کسی گوشے میں ایک انجانا سا خوف موجود تھا اس لیے وہ دم سادھے پڑا رہا۔

چند قدم مزید لے کر اس نے دوبارہ۔ ''چھوٹے صاحب!'' پکارا۔

تابش نے آہستہ سے سر اٹھا کر سورج نگر کی طرف دیکھا مگر اسے کوئی سرگرمی دکھائی نہ دی۔ جرأت کا اظہار کرتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا، اور آہستہ سے بولا۔

''چچا سلطان! میں یہاں ہوں۔'' سلطان نے اس کی آواز نہیں سنی تھی کہ اس نے ایک مرتبہ پھر اسے پکارا۔

''چچا سلطان!''

وہ سرعت سے پیچھے مڑا اور اگلے لمحے وہ اس کے پاس تھا۔

''چھوٹے صاحب! چھوٹے صاحب! آپ ٹھیک تو ہیں نا؟''

''فی الحال تو یہی لگتا ہے......'' وہ تھکی تھکی آواز میں بولا۔

''اچھا چلو میرے ساتھ......گھر جا کر باتیں ہوں گی۔''

''چچا! وہاں خطرہ ہے؟'' وہ خوف زدہ تھا۔

''نہیں......اب وہ نہیں لوٹیں گے۔'' سلطان نے اسے تسلی دی۔ ''ان کی نظر میں آپ یہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔''

تابش خاموشی سے اس کے ہمراہ ہو لیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ گھر پہنچ گئے تھے۔

سلطان نے سب سے پہلے اپنی بیوی کو کھانے لانے کا کہا۔

''نہیں چچا! مجھے بھوک نہیں ہے۔''

''تھوڑا سا کھا لو......'' سلطان مصر ہوا۔ اور تابش جی نہ چاہنے کے باوجود زبردستی کھانے لگا۔

''چھوٹے صاحب! اب بتاؤ کیا ہوا تھا؟'' اس کے کھانا کھانے سے فارغ ہوتے ہی سلطان پوچھنے لگا۔

جواباً تابش نے مختصر الفاظ میں اسے ساری کہانی سنا دی۔

''میں نے آپ کو منع کیا تھا؟''

''سارا قصور اسی کا ہے۔'' تابش اپنی غلطی ماننے پہ تیار نہیں تھا۔

''چھوٹے صاحب! میں نے آپ کو منع کیا تھا، کہ اس کے زیادہ قریب نہ ہونا؟'' سلطان نے اپنی بات دہرائی اس کا لہجہ مؤدبانہ ہونے کے باوجود کافی سخت تھا۔

''چچا سلطان! یقین مانو میری غلطی اتنی ہے کہ میں اسے سمجھانے کے لیے اس کے قریب ہوا، ورنہ آپ مجھے بچپن سے جانتے ہیں، میں کبھی ایسا نہیں تھا؟''

''اچھا اب آرام کریں، صبح اس بارے بات ہو گی......آپ نہیں جانتے ہم کتنی بڑی مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔'' سلطان کے لہجے میں شامل تشویش نے تابش کو لرزا دیا تھا۔ گو اسے پہلے سے بھی معاملے کی سنگینی کا اندازہ تھا مگر ایک مبہم سی امید جو چچا سلطان کے ملنے پر اس کے دل میں جاگی تھی اسے سلطان کی تشویش نے حرف غلط کی طرح زائل کر دیا تھا۔

''چچا سلطان! مجھے آرام کیسے آ سکتا ہے؟'' تابش کی گھبراہٹ میں اضافہ ہو گیا تھا۔

''چھوٹے صاحب! پریشان ہونے سے مسائل کم نہیں ہوتے۔''

''چچا! مجھ سے جو جانے انجانے میں غلطی ہوئی ہے...... کہیں اس کا خمیازہ میرے والدین کو نہ بھگتنا پڑے؟''

''اس بارے آپ کو پہلے سوچنا چاہیے تھا ......عورت کی محبت نے مرد کو ہمیشہ نقصان ہی پہنچایا ہے۔''

''مگر اب پچھتانے سے تو بات نہیں بنے گی نا؟'' تابش شاید خود کو تسلی دینا چاہتا تھا۔

''چھوٹے صاحب! میں تمھاری ہاں میں ہاں ملا کر شاید تمھیں اور خود کو وقتی طور پر مطمئن کر دوں مگر، حقیقت یہی ہے کہ ہم ایک بہت بڑی مصیبت میں پھنس گئے ہیں اور پھنسنے کے بعد صرف پچھتایا ہی جا سکتا ہے۔''

تابش لرز کر بولا۔ ''چچا سلطان! آپ مجھے ڈرا رہے ہیں۔''

''نہیں حقیقت بیان کر رہا ہوں۔''

''ہر مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل ہوتا ہے۔'' اس نے دامنِ امید دراز کیا۔

سلطان اس کی امیدوں کا گلا گھونٹتا ہوا بولا۔ ''مگر اس مسئلے کے تمام ممکنہ حل ہمارے لیے ناقابلِ عمل ہیں۔''

''مثلاً......؟''

سلطان نے پوچھا۔ ''چاروں بھائیوں کو قتل کر سکتے ہو؟''

جواباً اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''والدین کو ساتھ لے کر کسی دوسرے ملک میں فرار ہو جاؤ......کوئی ایسا دور دراز خطہ جہاں یہ موذی نہ پہنچ سکیں۔'' سلطان نے ایک اور حل بتایا۔

تابش مایوسی سے بولا۔ ''ممکن نہیں ہے۔''

''آپ کے رشتہ داروں میں کوئی ایسے جغادری غنڈے، بدمعاش موجود ہوں جو، ان چاروں بھائیوں کو منہ توڑ جواب دے سکیں؟''

تابش کا سر ایک مرتبہ پھر دائیں بائیں ہلا۔

''میری نظر میں بس یہی حل تھے......اگر تمھاری نظر میں کوئی اور ترکیب ہو تو بتاؤ؟'' سلطان نے گویا اپنی بات ثابت کر دی تھی۔

''ہم پولیس کے پاس بھی تو جا سکتے ہیں؟''

''کیا کہو گے پولیس کو؟'' سلطان نے دل چسپی سے پوچھا۔

''یہی کہ مجھے اور میرے والدین کو ان بھائیوں سے خطرہ ہے۔''

''پہلی بات تو یہ کہ چاروں بھائیوں نے پولیس کو ملنا ہی نہیں ہے، دوسرا، پولیس ہمیں ہمیشہ کے لیے حفاظت مہیا نہیں کر سکتی، اور سب سے اہم یہ کہ پولیس والے جرم ہونے کے بعد، مجرم کو کچھ کہنے کے حق دار ہوتے ہیں۔''

''اگر ہم دونوں مل کر ان کی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کریں؟''

سلطان نے نفی میں سر ہلایا۔ ''تمھیں دیکھتے ہی انھوں نے گولی پہلے چلانی ہے، بات بعد میں کریں گے۔''

''آپ اکیلے بھی تو میرے وکیل بن کر جا سکتے ہیں؟''

''گویا......ان کے سامنے اعتراف کر لوں کہ، اس حادثے کے بعد بھی میں آپ سے مل چکا ہوں، وہ ایک منٹ میں مجھ سے تمھارے چھپنے کی جگہ اگلوا لیں گے۔''

''آپ میرے لیے ذرا سی تکلیف برداشت نہیں کر سکیں گے؟'' تابش کے لہجے سے شکوہ عیاں تھا۔

''تھوڑی کیا......؟ بہت زیادہ تکلیف اور اذیت برداشت کر لیتا، اگر بیوی، بچوں والا نہ ہوتا؟......''

سلطان نے وضاحت کی۔ ''بے قصور بیوی اور معصوم بچوں اپنی آنکھوں کے سامنے تڑپتے دیکھنا بہت مشکل مرحلہ ہوتا ہے......اور چھوٹے صاحب معاف کرنا یقیناً میں یہ قربانی نہیں دے پاؤں گا۔''

''کیا ممکن ہے کہ یہ بات میں امی ابو تک پہنچا کر ان سے مشورہ لے سکوں؟''

''نہیں......'' سلطان نے ایک مرتبہ پھر نفی میں سر ہلایا۔ ''مجھے ان موذیوں نے گاؤں سے نکلنے پر سارے کنبے کی موت کا مژدہ سنایا ہوا ہے اور اگر تم نکلے تو مشکل ہے کہیں جا سکو......وہ سارے رستوں کی نگرانی کر رہے ہیں۔''

''کسی تیسرے کو بھی بھیجا جا سکتا ہے؟''

''اس بات کی کیا گارنٹی کہ وہ تیسرا ان موذیوں کا آدمی نہیں ہوگا؟ ......ان کا نام سن کر تو یوں بھی پورے علاقے میں ہمارا ساتھ کوئی نہیں دے گا۔''

''چچا! اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ میری موت یقینی ہے ......کیونکہ میں بھی تو یہ نہیں چاہوں گا کہ امی جان اور ابو جان میرے گناہ کی سزا بھگتیں۔''

تابش کا مایوسی بھرا لہجہ سن کر سلطان نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا......

''اللہ پاک کوئی راہ دکھلا دے گا چھوٹے صاحب! میرا مقصد آپ کو حقیقت سے روشناس کرنا تھا، نہ کہ مایوس کرنا۔''

''جب ہم خود اپنے لیے سارے رستے بند کر لیتے ہیں، پھر سب کچھ خدا پہ چھوڑ کر بے فکر ہو جاتے ہیں اور ہوتا وہی ہے جو ہم نہیں چاہتے۔'' تابش قنوطی ہونے لگا تھا۔

سلطان نے اسے بازو سے پکڑ کر اندرونی کمرے کی طرف لے جاتا ہوا بولا۔ ''چھوٹے صاحب! آپ اس وقت آرام کریں، چند گھنٹوں کی نیند ہمیں اس قابل ضرور کر دے گی کہ ہم کوئی بہتر حل ڈھونڈ لیں۔''

''نیند کس کم بخت کو آئے گی چچا!''

''نہ آئے ......آپ بس آنکھیں بند کر کے لیٹ جائیں......اگر دماغ کو آرام کی ضرورت ہوئی تو آپ کی پراگندہ سوچیں اسے جاگنے پر مجبور نہیں رکھ سکیں گی؟''

تابش سر ہلاتا ہوا چارپائی کی طرف بڑھ گیا۔ اور چچا کے کہنے کے بموجب وہ خود کو زیادہ دیر نہیں جگا پایا تھا۔ گو نیند میں بھی وہ بھیانک پرچھائیوں کو اپنے تعاقب میں دیکھتا رہا، مگر پھر بھی نیند نے اسے سکون بخشا تھا۔ جاگنے پر اس کی طبیعت کافی بہتر تھی۔

گھر کا واحد واش روم صحن میں تھا۔ فریش ہونے کے لیے اسے لازماً کمرے سے باہر نکلنا پڑتا۔ اس نے اپنے کمرے کا دروازہ ہلکا سا کھول کر ساتھ والے کمرے میں جھانکا......وہاں کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ وہ کمرے سے نکل آیا اور پھر صحن میں نکلنے سے پہلے اس نے صحن کی سن گن لینا بھی ضروری سمجھا۔ سلطان اور اس کی بیوی اسے کچن میں نظر آئے۔ بیرونی دروازے کی کنڈی بھی اندر سے بند تھی۔ وہ باہر نکل کر واش روم کی طرف بڑھ گیا اور فریش ہو کر وہ دوبارہ اپنے کمرے میں آ گیا۔ وہ بمشکل چارپائی پر بیٹھ سکا تھا کہ سلطان کمرے میں داخل ہوا۔

''چھوٹے صاحب! سنائیں...... طبیعت کیسی ہے؟''

''فی الحال تو ٹھیک ہے چچا سلطان ......البتہ مستقبل کا کوئی پتا نہیں۔''

''میں ساری رات آپ کے مسئلے ہی پر سوچتا رہا۔''

''کوئی سلجھاؤ نظر آیا؟'' تابش نے امید بھرے لہجے میں پوچھا۔

سلطان نے پوچھا ''پہلے یہ بتائیں ......تمہیں امیمہ پر کتنا بھروسا ہے؟''

''بھروسا......؟ میں سمجھا نہیں؟'' تابش کے لہجے میں حیرانی تھی۔

''کیا وہ لڑکی تمھارے لیے کوئی قربانی دے سکتی ہے؟''

''کیسی قربانی چچا؟'' تابش کی حیرت برقرار تھی۔

''دیکھو چھوٹے صاحب! میں نے بہت سوچا...... کرامت کی ماں سے بھی مشورہ کیا۔ اگر امیمہ آپ سے شادی کرنے پر تیار ہو جاتی ہے تو شاید......''

''وہ تیار ہے چچا سلطان! مشکل تو میرے لیے ہے، میں اپنے والدین کو کیسے راضی کروں گا؟''

''وہ تب کی بات تھی چھوٹے صاحب! اب شاید وہ بھی تیار نہ ہو؟''

''اچھا فرض کیا وہ تیار ہو جاتی ہے، تب مسئلہ کیسے حل ہوگا؟''

''دیکھو ......شادی ہونے کی صورت میں وہ چاروں درندے کبھی بھی اپنی بہن کے سہاگ کو کچھ نہیں کہیں گے ......البتہ، اپنے والدین کو کیسے راضی کرتے ہیں یہ آپ پہ منحصر ہے۔''

سلطان کی بات نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اگر امیمہ بھائیوں کی غیر موجودگی میں اس سے نکاح کر لیتی تو یقیناً اس کے بھائیوں کو انتقام لینے سے باز رکھا جا سکتا تھا۔ یہ سوچ حوصلہ بڑھانے والی تھی، مگر جب تھوڑی دیر سوچنے کے بعد وہ، سلطان سے مخاطب ہوا تو اس کے لہجے سے ہنوز پریشانی عیاں تھی۔

''چچا سلطان! ہو سکتا ہے، یہ بات انھیں مزید آتش پا کر دے؟''

انھیں جتنا بھی غصہ کیوں نہ آئے وہ اپنی بہن کے خاوند کو قتل کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔'' سلطان کا لہجہ اعتماد سے پر تھا۔

اسی وقت سلطان کی بیوی شہناز، چھابے میں روٹیاں اور سالن کی پلیٹ لے کر اندر داخل ہوئی، کیونکہ ناشتے کا ٹائم گزر چکا تھا۔ برتن تابش کے سامنے رکھ کر وہ باہر نکل گئی۔

''چچا! مجھے یقین نہیں آ رہا۔''

''اچھا پہلے کھانا کھا لو۔'' سلطان نے کہا۔ ''رات بھی آپ نے بمشکل چند نوالے لیے تھے......اس طرح بھوکا رہنے سے مسئلے کا حل نہیں نکلا کرتا۔''

تابش کو بھی اچھی خاصی بھوک محسوس ہو رہی تھی وہ خاموشی سے کھانے کو جُت گیا۔ اس کے کھانے سے فارغ ہونے تک شہناز چائے بنا لائی تھی۔ اپنے خاوند اور تابش کے ہاتھ میں چائے کے کپ پکڑا کر وہ دوبارہ باہر نکل گئی۔

''تو پھر؟'' چائے کا سپ لیتے ہوئے سلطان مستفسر ہوا۔

''چچا سلطان! باقی سب تو ٹھیک ہے......میں ابو جان کو کیسے مطمئن کروں گا؟''

''ضرورت ہی کیا ہے......؟'' چچا سلطان نے منہ بنایا۔ ''انھیں امیمہ کے بھائی مطمئن کر دیں گے اگر آپ ان کے ہتھے نہ چڑھے اور آپ ان کے قابو آ گئے تو آپ بھی ان کے مطمئن کرنے کے طریقہ کار سے واقف ہو جائیں گے۔''

''مجھے سمجھ نہیں آ رہی میں کیا کروں؟'' تابش نے جھنجلا کر سر پکڑ لیا تھا۔

''بتا تو دیا ہے؟''

''اگر وہ شادی پر تیار نہ ہوئی پھر؟......میرا مطلب ہے بھائیوں کی اجازت کے بغیر تو وہ شادی نہیں کر سکتی نا؟''

''یہ بھی آپ کا دردِ سر ہے......ویسے سوچا جائے تو یہی آزمائش کی گھڑی ہے، اسے اگر آپ سے محبت کا دعویٰ ہے، تو یہ قربانی دینا اس کے لیے مشکل نہ ہوگا؟''

''اس سے ملاقات کیسے ہو سکے گی؟......ممکن ہے اس کے بھائی اسے کسی کے حوالے کر گئے ہوں۔'' تابش گویا اس سے متفق ہو گیا تھا۔

''وہ گھر ہی میں ہے......میں صبح اس سے مل کر آیا ہوں، بھائیوں نے اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا ہے اور اس وقت چاروں گھر سے باہر گئے ہوئے ہیں۔''

''میں جانتا ہوں وہ کہاں ہیں ......لیکن کیا میرا یہاں سے باہر جانا مناسب رہے گا؟''

''نہیں ......'' سلطان نے نفی میں سر ہلایا۔''بلکہ اسے یہاں آنا پڑے گا۔''

''اگر کسی نے اسے دیکھ لیا؟''

''ساتھ میں ہی ان کا گھر ہے......مگر پہلے آپ کوئی فیصلہ تو کر لیں؟''

تابش نے سر جھکا لیا......پھر چند لمحے سوچنے کے بعد بولا۔''چچا سلطان! آپ اس بارے کوئی مشورہ نہیں دیں گے؟''

''یہ میرا مشورہ ہی تھا چھوٹے صاحب ......اس کے علاوہ کوئی رستا نہیں ہے۔''

''چچا! اگر ڈیڈی نے امیمہ کو بطور بہو قبول نہ کیا تو......؟''

''ہونہہ!......'' سلطان نے گہری سانس لی۔ ''چھوٹے صاحب! والدین کی ناراضی تمہارے مختصر خاندان میں کسی کی موت ہو جانے سے بہتر ہے۔''

''صحیح کہا......میں تیار ہوں۔''

''اور یاد رکھنا......آپ والدین کی اکلوتی اولاد ہیں ......آخر کب تک وہ آپ سے ناراض رہ پائیں گے۔'' سلطان نے اس کی ہمت بڑھائی۔

''چچا! اب میری قسمت کا فیصلہ امیمہ کے ہاتھ میں ہے......ویسے وہ مان جاتی ہے تو نکاح وغیرہ کی تقریب کیسے ہو پائے گی؟''

''یہ سب مجھ پہ چھوڑ دو؟'' سلطان کے چہرے پر خوشی کے آثار نمودار ہوئے اور وہ گھر سے باہر نکل گیا۔ تابش سوچوں میں گھر گیا تھا۔ اس کی زندگی عجیب چوراہے پر آ گئی تھی۔ ہر رستا ایک سوالیہ نشان کی طرح اس کی سوچوں پر ہتھوڑے برسا رہا تھا۔''امیمہ کو نہ اپنایا اور بھاگ گیا تو والدین کی زندگی کو خطرہ تھا، اگر والدین کے پاس چلا گیا تو اس کی اپنی زندگی کو خطرہ تھا، امیمہ سے شادی کر لیتا، والدین کی خفگی اور ہمیشہ کے قطع تعلق کا خدشہ، پولیس میں رپٹ لکھواتا تو پولیس بھلا کب تک اسے حفاظت مہیا کرتی۔ والدین اس کے لیے باڈی گارڈ کا بندوبست کر سکتے تھے مگر یہاں بھی یہی سوال اٹھتا تھا آخر کب تک......''

سلطان کے لوٹنے تک وہ انھی سوچوں میں کھویا رہا ......اور پھر اسے سب سے بہتر رستا امیمہ سے شادی کرنا ہی لگا......اگر اس شادی سے ان موذیوں سے پیچھا چھوٹ رہا تھا تو وہ گھاٹے میں نہیں تھا۔ اس نے شادی تو کرنی ہی تھی پھر امیمہ میں کیا کمی تھی ......بلکہ یہ پہلی لڑکی تھی جو اسے پسند آئی تھی۔

سلطان جلد ہی امیمہ کو ساتھ لیے لوٹ آیا تھا۔ امیمہ کو اس کے پاس چھوڑ کر وہ باہر نکل گیا۔ تابش جانتا تھا کہ وہ کس لیے باہر نکل گیا ہے، یقیناً وہ چاہتا تھا کہ تابش شرمائے بغیر امیمہ کو شادی کے لیے راضی کر سکے اور ایسا اس کی موجودی میں ممکن نہیں تھا۔

☆☆☆

''آپ نے مجھے کیوں بلایا ہے جی؟'' جب سلطان کے کمرے سے نکلنے کے بعد بھی وہ خاموش بیٹھا رہا تو امیمہ نے آہستہ سے پوچھا۔

''بس یونہی ......ملنا تھا۔'' اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیسے اپنا مطمح نظر بیان کرے، حالانکہ وہ جانتا تھا کہ امیمہ خود اس سے شادی کی خواہش مند ہے۔

''پہلی ملاقات کا تنازعہ ابھی ختم نہیں ہوا اور آپ نے پھر بلا لیا؟......اگر اس بار بھائیوں نے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تو شاید زندہ زمین میں گاڑھ دیں۔''

''محترمہ! مجھے زندہ گاڑھنے کے لیے تو وہ اب بھی ڈھونڈ رہے ہیں......حالانکہ انصاف یہ تھا کہ وہ ہم دونوں کو قتل کرتے یا دونوں کو چھوڑ دیتے۔''

''یہ ان کا مسئلہ ہے......؟'' امیمہ بے پرواہی سے بولی۔

''کیا......کیا؟......ان کا مسئلہ......آپ اس سے مسئلے بالکل لاتعلق ہیں؟'' تابش نے زہر خند لہجے میں پوچھا۔

''میری اہمیت ہی کیا ہے......؟ کیا میرے کہنے سے بھائی لوگ اپنے ارادے سے باز آجائیں گے؟'' اس نے صاف الفاظ میں اپنی بے بسی ظاہر کی۔

''امیمہ صاحبہ! یہ کہہ کر آپ نہ تو اپنے جرم پر پردہ ڈال سکتی ہیں اور نہ اپنی ذمہ داری سے جان چھڑا سکتی ہیں؟''

''کون سا جرم؟......اور کیسی ذمہ داری؟'' اگر وہ انجان بننے کی اداکاری کر رہی تھی تو بہت لاجواب اداکاری تھی۔

''کیا...... ان ملاقاتوں کا میں اکیلا ذمہ دار ہوں؟''

''ایسا کب کہا میں نے؟''

''تمھارے بھائی تو یہی سمجھتے ہیں؟''

''انھیں میں نے کہا ایسا سمجھنے کو؟''

''تم انھیں سمجھا سکتی ہو۔''

''بڑوں کو سمجھایا نہیں، بتایا جاتا ہے......اور اگر میں انھیں بتا بھی دوں تو زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ آپ کے ہمراہ وہ میرا گلا بھی کاٹ دیں گے۔''

''گویا اپنے گلے کو کٹنے سے بچانے کے لیے تم چپ رہو گی......اور جس سے محبت کی دعوے دار تھیں اسے بے یارو مددگار چھوڑ دو گی؟'' تابش کے لہجے میں غصے سے زیادہ شکوے کا عنصر نمایاں تھا۔

''ایسا بس آپ سمجھتے ہیں؟'' وہ سرکنڈوں کے بنے موڑھے پر بیٹھی تھی...... اٹھ کر اس کی چارپائی پر آن بیٹھی۔

''تو کیا غلط سمجھتا ہوں؟''

''ہاں۔''

''بھلا وہ کیسے؟''

آپ جیسا کہیں، میں کرنے کو تیار ہوں...... کسی بات سے انکار کیا ہے؟''

''ٹھیک ہے......اگر ایسا ہے تو مجھ سے شادی کر لو؟'' تابش نے ایک دم دھماکا کیا۔

''کیا......؟'' اس کا لہجہ حیرانی سے پر تھا۔ پھر گویا سنبھلتے ہوئے بولی۔ ''بابو! یہ وہ تمنا ہے کہ روزانہ جس کے خواب دیکھتی ہوں......مگر بھائی کیسے مانیں گے......وہ تو دیکھتے ہی آپ کی جان کے درپے ہو جائیں گے؟''

''یہ شادی آپ کے بھائیوں کی غیر موجودی میں ہوگی۔''

''نن......نہیں......ایسا بھلا کیسے ہو سکتا ہے، وہ ہم دونوں کو جان سے مار دیں گے۔'' امیمہ ایک دم خوفزدہ ہو گئی تھی۔

''تو مار دیں......محبت کی ہے تو سزا بھی اکٹھے بھگتیں؟......اور یہی محبت کا فلسفہ ہے۔''

''صحیح کہتے ہو......'' امیمہ نے قریب ہو کر اپنا سر اس کے کندھے پر رکھ دیا۔ ''میں تیار ہوں، زیادہ سے زیادہ جان سے ہی مار دیں گے نا......؟ اور تمھیں پانے کے لیے جان کی قربانی دینا مہنگا سودا نہیں۔''

اس وقت پہلی بار تابش کو محسوس ہوا کہ وہ اسے بہت زیادہ چاہتی ہے۔ اور پہلی بار ہی تابش اپنے فیصلے پر

دلی طور پر مطمئن ہوا تھا۔
''میں جانتا تھا تم انکار نہیں کرو گی؟'' وہ پرسکون سا ہو گیا۔
وہ مسکرائی۔ ''اتنے مان کی وجہ؟''
''پتا نہیں......''
''اچھا...... یہ بتاؤ ہم شادی کیسے کریں گے......؟ اور کیا سلطان چچا کو پتا ہے اس بات کا؟''
''سارا انتظام سلطان چچا ہی کرے گا۔''
''بھائی لوگوں سے یہ بات کیسے چھپائیں گے؟''
''چھپائیں گے نہیں ......ان کے سامنے لائیں گے؟''
''کیا مطلب؟......سامنے لائیں گے......ہم بس بھاگ جائیں گے، کہیں دور جا کے چھپ جائیں گے ......گھر میں کچھ زیور پڑے ہیں اور تمھاری کار بھی موجود ہے یہ سب بیچ کر آپ کوئی کاروبار کر لینا۔'' امیمہ نے سارا منصوبہ ترتیب دے دیا۔
''اچھا خیال ہے ......اور میرے والدین کہاں جائیں گے؟''
''انھیں کیا ہوا؟''
اگر ہم بھاگ گئے تو تمھارے موذی بھائی لازماً انھیں نقصان پہنچائیں گے۔ ہمارے کیے کا بدلہ وہ ان سے لیں گے۔''
''ایسا تو نہ کہیں؟......وہ میرے بھائی ہیں۔'' وہ شکوہ کناں ہوئی۔
''تو کیا کہوں؟...... مجھے قتل کرنے میں انھوں نے کوئی قصر نہیں چھوڑی تھی حالانکہ سارا قصور ان کی اپنی بہن کا تھا۔''
''کیا کیا ہے میں نے؟''
''واہ! معصومیت تو دیکھو بھولی میم صاحبہ کی ......مجھے اس رستے پر لانے والی پوچھ رہی ہے کیا کیا ہے میں نے؟''
وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔ ''کیوں؟......آپ مجھ سے عمر میں کم تھے یا تعلیم میں، کہ میں آپ کو اس رستے پر لے آئی ہوں؟''
''بھول گئیں ......؟ میں نے کتنا منع کیا تھا کہ یہ ٹھیک نہیں ہے اگر پکڑے گئے یا کسی نے دیکھ لیا تو بہت برا ہوگا......اور وہی ہوا۔''
''ہاں سارا قصور میرا ہی ہے۔'' امیمہ نے منہ پھلا لیا تھا۔
''اچھا اب رونا شروع نہ کر دینا۔'' تابش ہنس کر بولا۔
''بابو! جو مرضی ہے کرو...... مجھے ہمیشہ اپنے ساتھ پاؤ گے، ہر مشکل، ہر مصیبت، ہر آفت کو جھیلنے کے لیے تمھارے شانہ بشانہ رہوں گی ......جو کھلاؤ گے کھا لوں گی، جو پلاؤ گے پی لوں گی، جو پہناؤ گے پہن لوں گی، جہاں رکھو گے رہ لوں گی ......نہ تو مجھے شیش محل درکار ہے اور نہ شاہانہ زندگی ...... تمھارا ساتھ مانگا ہے اور تمھارے ساتھ ہی رہنا ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنا سر تابش کے کندھے پر رکھ دیا تھا۔
''دیکھ...... لو امیمہ! بعد میں مجھے نہ کوستی رہنا ...... ہماری شادی پر تمھارے بھائیوں کا ردعمل کیا ہوگا اس بارے کچھ کہنا بعید ہے؟......اس لیے ایک بار پھر سوچ لو۔''
''سوچ لیا اور فیصلہ بھی سنا دیا......اب میں پیچھے ہٹوں گی اور نہ آپ کو پیچھے ہٹنے دوں گی۔''
''اوکے ......میں چچا سلطان کو بتا دوں۔'' تابش مطمئن انداز میں کمرے سے باہر جانے لگا۔

☆☆☆

اگلے چند گھنٹوں میں ان کا نکاح ہو چکا تھا۔ نکاح خوان اور گواہوں کے علاوہ چچا سلطان نے کسی کو نہیں بلایا

تھا ۔ نکاح نامے پر امیمہ کی عمر انھوں نے اٹھارہ سال لکھوائی تھی حالانکہ اس کی عمر بمشکل سولہ سال ہوئی تھی ۔ نکاح خوان اور گواہوں کو رخصت کر کے سلطان نے گھر کا دروازہ اندر سے کنڈی کیا اور تابش کے کمرے میں آ گیا ۔ شہناز اور امیمہ بھی وہیں آ گئے تھے ۔ نکاح کے بعد جہاں امیمہ کے چہرے پر خوشی کے تاثرات ہویدا تھے وہیں ایک شرمیلی مسکراہٹ بھی اس کے ہونٹوں پر کھل رہی تھی ۔ سلطان کے دونوں بچے بھی خوب اٹھکیلیاں کر رہے تھے ۔ بہت تمیزدار اور سلجھے ہوئے بچے تھے ۔ امیمہ کو دونوں بوا کہہ کر بلاتے تھے ۔ شہناز نے انھیں بھی نئے کپڑے پہنائے تھے ۔

شہناز نے دونوں کو مبارک باد دی ۔

سلطان نے کہا ۔ "چھوٹے صاحب! آپ کی شادی عجیب وغریب حالات میں ہوئی ہے، مگر یاد رکھنا ...... یہ وجہ اس کی اہمیت سے پر اثر انداز نہیں ہو سکتی ۔ آپ دونوں نے ہر دکھ، سکھ میں ہمیشہ اکٹھے رہنے کا معاہدہ کر لیا ہے، جس میں زیادہ ذمہ داری آپ پر عائد ہوتی ہے کیونکہ عورت نسبتاً کمزور اور نازک مخلوق ہے ۔ یہ ایک ایسا بندھن ہے جو بظاہر "قبول ہے" کے دو الفاظ سے جڑا ہے اور طلاق جیسے چھوٹے سے لفظ سے ٹوٹ جاتا ہے مگر اس کے ساتھ یہ اتنا مضبوط بھی ہے کہ موت جیسی ازلی حقیقت بھی اسے نہیں توڑ سکتی، جیسا کہ علماء سے سنا ہے کہ جنتی خاوند اور بیوی وہاں پر بھی میاں بیوی ہی رہیں گے ۔ باقی عورت کے لیے ماں باپ کا گھر ویسے ہی پرایا ہو جاتا ہے، البتہ والدین اگر آپ کو دھتکار دیں تو اس گھر کا دروازہ ہمیشہ آپ کے لیے کھلا رہے گا، امیمہ نے بہت بڑا رسک لیتے ہوئے تمھارا ہاتھ تھاما ہے اور اب اپنی ذمہ داری سمجھتے ہوئے اس کا ہر طرح سے خیال رکھنا، اسے کبھی اکیلا نہ چھوڑنا اور زندگی کے کسی موقع پر بھی اسے احساس نہ ہونے دینا کہ تمھارا دائن

تھامنے کا فیصلہ غلط تھا۔"

"سلطان چچا! تقریر اچھی کر لیتے ہیں۔" تابش نے مزاحیہ انداز اپنانے کی کوشش کی مگر اس کے ہونٹوں پر زخمی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "مگر یاد رہے اب تک امیمہ کے بھائیوں کا مسئلہ درمیان میں ہے، آیا وہ بطور بہنوئی مجھے قبول کرتے بھی یا......؟"

"اللہ تعالیٰ کرم فرمائے گا ...... فی الحال تو آپ آرام کریں میں انہیں بلوا لیتا ہوں، جو ہوگا دیکھا جائے گا؟" سلطان نے اسے تسلی دی۔

تابش نے تجسس سے پوچھا۔ "کیا آپ جانتے ہیں وہ کہاں ہوں گے؟"

"نہیں ......" سلطان نے نفی میں سر ہلایا۔ "مگر گوٹھ میں اس کا ایک مخصوص آدمی موجود ہے جو ہر وقت ان بھائیوں سے رابطے میں رہتا ہے۔ میں اسی سے ملنے جا رہا ہوں۔"

تابش مستفسر ہوا۔ "کیا کہو گے اسے؟"

"آپ کے مل جانے کی خوش خبری سناؤں گا...... بس بھاگے چلے آئیں گے۔"

چچا سلطان کی واپسی تک وہ وہیں بیٹھا رہا۔ امیمہ کو شہناز تابش کے کمرے میں لے گئی تھی۔ تابش دونوں بچوں سے گپیں کرنے لگا۔

سلطان نے واپسی میں زیادہ دیر نہیں لگائی تھی۔

"چلیں جی کل صبح تک ظہور برادران پہنچ جائیں گے۔" کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے اعلان کیا۔

"کیا کہہ رہا تھا ان کا آدمی؟" تابش نے اشتیاق سے پوچھا۔

"یہی کہ دو تین گھنٹوں تک ان کے پاس اطلاع پہنچ جائے گی اور صبح سویرے وہ یہاں پہنچ جائیں گے۔"

تابش نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔ سلطان نے اپنی بیوی کو آواز دینے لگا......

"کرامت کی ماں! کچھ کھانے پینے کا بندوبست کرو، کافی بھوک لگی ہے۔"

"سب کچھ تیار ہے جی ...... بس کہنے کا انتظار تھا۔" وہ تابش کے کمرے سے نکل کر باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی۔ کھانا ان کے سامنے دھر کر وہ امیمہ اور اپنا کھانا کمرے میں لے گئی۔

وہ جیسے ہی کھانے سے فارغ ہوئے شہناز برتن سمیٹنے لگی۔ برتن دھو کر وہ دونوں بچوں کو سلانے لگی۔

سلطان نے ہنستے ہوئے کہا۔ "چھوٹے صاحب! اب آپ جائیں، دلہن انتظار کر رہی ہوگی۔"

"چچا! میرا خیال ہے......؟"

"آپ! اپنے خیال کو رہنے دیں۔" سلطان قطع کلامی کرتا ہوا بولا۔ "ساری فکریں اور اندیشے جھٹلا کر حال کی اس گھڑی سے خوشیاں کشید کریں ...... کل کس نے دیکھی ہے؟"

تابش نے پھیکی مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھا۔ "چچا! خوشی کا تعلق موڈ سے ہوتا ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں......

جیسا موڈ ہو ویسا منظر ہوتا ہے
موسم تو انسان کے اندر ہوتا ہے

"شادی کی خوشی اپنی جگہ ...... مگر ابھی تک دو سخت مراحل رہتے ہیں ...... جانے امیمہ کے بھائیوں کا ردعمل کیا ہوگا؟ ...... اور اگر انھوں نے اس شادی کو قبول کر لیا تو امی ابو کی رضامندی کا پہاڑ سامنے ہوگا ...... جب تک یہ مرحلے طے نہیں ہو جاتے میں چاہ کر بھی خوش نہیں ہو سکتا۔"

"چھوٹے صاحب! ہمیشہ معاملے کا مثبت پہلو سامنے رکھا کریں۔"

"مجھے تو اس معاملے میں مثبت پہلو نظر نہیں آ رہا۔"

"ماضی کی غلطیوں کو سامنے رکھیں ...... آپ

امیمہ کے بھائیوں کے ڈر سے بھاگے بھاگے پھر رہے تھے، اور اب ان کا سامنا کرنے کے لیے خود بلا لیا ہے.....گویا آپ نے اپنی غلطی کو سدھار لیا ہے......
آپ ان سے کہہ سکتے ہیں کہ آپ امیمہ کے ساتھ اس لیے تنہائی میں موجود تھے کہ آپ نے اسے اپنی زندگی کا ساتھی چنا ہوا تھا۔ باقی میں جانتا ہوں آپ نے ہمیشہ والدین کا کہا مانا ہے اور نیک بخت اور فرمان بردار اولاد کو ایسا ہی کرنا چاہیے مگر یہ بھی سوچو شادی کرنا زندگی کے دوسرے معاملات سے یکسر مختلف ہے ......عورت نہ تو لباس ہے کہ پسند نہ آئے تو بدل دیا جائے اور نہ مکان ہے کہ توڑ کر طرز تعمیر بدل دیا جائے ۔ اگر آپ کے والدین کی پسند کی ہوئی لڑکی آپ کو پسند نہ آئی تو سوچو آپ کی زندگی میں کتنا بڑا خلا رہ جاتا ......اور اتنا تو میں بھی جانتا ہوں جو شخص پہلی شادی اپنی پسند کی نہیں کر سکتا وہ دوسری شادی کرنے کی جرأت بھی نہیں رکھتا۔‘‘

’’آپ کا مطلب ہے، کہ جو کچھ ہوا اچھا ہوا......؟‘‘

’’ہاں ......کیونکہ ماضی پر پچھتانے کی غلطی صرف بیوقوف کیا کرتے ہیں۔‘‘

’’چچا سلطان! جب تک امیمہ کے بھائیوں سے ملاقات نہیں ہو جاتی مجھے سکون نہیں مل سکتا۔‘‘

’’اپنی بہن کے سہاگ کو قتل کرنے والا کوئی جانور ہی ہو سکتا ہے؟‘‘

’’امیمہ کے بھائی بھی جانور ہی ہیں چچا!‘‘

’’نہیں صاحب! اگر آپ بنظر انصاف دیکھیں تو ان کے ردعمل کی توجیہہ کرنی مشکل نہیں ہے، اگر آپ اپنی بہن کے ساتھ کسی غیر مرد کو دیکھتے تو کیا کرتے؟‘‘

’’ان کی بہن بھی قصوروار تھی؟‘‘

’’اپنوں کے قصور معاف کرنا مشکل نہیں

ہوتا......یوں بھی جب غصے کے اخراج کے لیے غیر میسر ہوتو اپنوں کی جان چھوٹ جایا کرتی ہے، پھر امیمہ ان کی اکلوتی بہن بھی تو ہے جسے وہ تمام بیٹی کی طرح چاہتے ہیں۔"

"غیر تو میں اب بھی ہوں؟"

"نہیں......اب آپ ان کی بہن کا سہاگ ہیں۔"

"چچا! میرا خیال ہے مجھے یہیں آپ کے پاس سو جانا چاہیے......منہ دکھائی وغیرہ کے لیے کوئی تحفہ تو ہے نہیں میرے پاس؟"

"بیوقوف مت بنو......عورت کے لیے سب سے بڑا تحفہ اس کے شوہر کا پیار اور وہ تحفظ ہوتا ہے جس کی یقین دہانی شوہر پہلی رات کرتا ہے۔" سلطان نے اسے سمجھایا۔

"چچا!......"

سلطان نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ "چھوٹے صاحب! آپ چلیں......یہ نا ہو وہ بچی کچھ غلط سمجھ بیٹھے، کہ آپ نے یہ شادی صرف اپنی جان بچانے کے لیے کی ہے۔"

اور سلطان چچا کی اس بات نے تابش کو حجلہ عروسی میں جانے پر مجبور کر دیا۔ ہلکے سے دروازہ کھٹکھٹا کر وہ اندر داخل ہوا......چارپائی پر بیٹھی امیمہ آہٹ پا کر سمٹ گئی تھی۔ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ اس کی طرف بڑھنے لگا۔

☆☆☆

وہ رات اس کی زندگی کی یادگار رات تھی......اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ امیمہ اسے اتنی محبت دے گی...... امیمہ کی محبت نے اسے اتنا حوصلہ بخشا کہ اس کے دل میں والدین اور امیمہ کے بھائیوں کا سامنا کرنے کی جرأت پیدا ہو گئی تھی۔ وہ اس شادی سے دلی طور پر مطمئن ہو گیا......صبح اٹھ کر وہ بمشکل فریش ہو پایا تھا کہ، دروازہ زور زور سے دھڑ دھڑایا گیا۔ سلطان کے۔ "آتا ہوں بھئی۔" کے جواب میں بھی آنے والے نے دستک کا عمل جاری رکھا تھا۔

"کتنے بدتمیز اور اجڈ ہیں یہ لوگ بھی۔" تابش کے ذہن میں سوچ ابھری۔ وہ دستک کے انداز سے سمجھ گیا تھا کہ امیمہ کے بھائی پہنچ گئے ہیں، مگر حیران کن طور پر اس کے دل سے خوف غائب ہو چکا تھا۔

"کہاں ہے وہ خبیث؟" دروازہ کھلتے ہی وہ چاروں دندناتے گھر میں گھس آئے تھے۔

"ایک منٹ ظہور! میری بات سنو؟" سلطان نے ہمت کا مظاہرہ کرتے ان کے سرغنہ کو پکارا۔

"بات کو چھوڑو سلطان! ہمیں بتاؤ اس موذی کو کہاں چھپایا ہے؟" یہ کہنے والا سراج تھا۔

"میں آپ کے بڑے بھائی سے مخاطب ہوں۔" سلطان نے اس کی درشتی کو درخو اعتناء نہیں سمجھا تھا۔

"کیا بات ہے؟" ظہور نے گویا بادل نخواستہ پوچھا۔

"ظہور صاحب! اب وہ آپ کا بہنوئی ہے۔" سلطان نے ایک دم دھماکا کیا۔

"کیا......؟؟؟" چاروں بھائیوں نے بیک زبان پوچھا۔

"ہاں......یہ سچ ہے، چھوٹے صاحب نے کل امیمہ سے نکاح پڑھوالیا ہے۔ یہ ہے نکاح نامہ۔" سلطان نے جیب میں رکھا نکاح نامہ ان کے بڑے بھائی کی طرف بڑھایا۔

شاہ جہان نے بھیانک آواز میں پوچھا۔ "سلطان! اس حرکت کا انجام جانتے ہوئے؟"

سلطان بے پرواہی سے بولا۔ "جو بھی ہو......آپ کی بہن بھی برابر کی مجرم ہے۔ اور ہم اس ناکردہ گناہ کی سزا کاٹنے کے لیے تیار ہیں۔"

''پہلے تو تمہارا نمبر ہے نا؟'' منظور نے اس کی طرف رائفل تانی۔

''نہیں منظورے!'' ظہور نے رائفل کی نال پر ہاتھ رکھ کر نال نیچے جھکا دی۔ ''مسئلہ الٹ گیا ہے۔''

''ہم الٹا سیدھا نہیں جانتے بھیا!'' سراج نے آنکھیں نکالیں۔

''تو کیا بہن کو قتل کر دو گے؟'' ظہور نے انھیں غصیلے لہجے میں جھڑکا۔

''وہ بعد کا مسئلہ ہے...... پہلے ان دونوں کو تو کیفر کردار تک پہنچائیں۔'' شاہ جہان نے بھی ظہور کا ساتھ نہیں دیا تھا۔

''بعد کا کیسے......؟ بہن کے سہاگ کو قتل کرنے کے بعد کیا باقی رہ جائے گا...... اس نے نکاح باندھ کر اپنی غلطی سدھارنے کی کوشش کی ہے، اس کا مطلب یہی ہے کہ اگر ہم اس کے قتل کے درپے نہ ہوتے تو وہ باقاعدہ طور پر امیمہ کا رشتا طلب کرنے آتا۔

''آپ سچ کہہ رہے ہیں ظہور بھائی۔'' تابش جرأت کا اظہار کرتے ہوئے کمرے سے باہر نکل آیا۔

''میں نکالتا ہوں تیرا سچ۔'' سراج نے غصے سے پھنکارتے ہوئے اپنی رائفل کا رخ اس کی سمت موڑا۔ مگر اس بار بھی ظہور نے رائفل کی نال نیچے جھکا دی۔

''سراجے! سوچ کر...... کہا جو ہے معاملہ بدل گیا ہے؟''

''بھیا! یہ بے غیرت ہمارے سامنے دندناتا پھرتا رہے گا؟'' سراج نے غصیلے لہجے میں پوچھا۔

ظہور نے ہاتھ گھمایا اور ''چٹاخ'' کی آواز سے ماحول گونج اٹھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ غرایا۔

''بکواس کی ہے کہ، تمہاری بہن کا شوہر ہے...... اسے عزت دو...... سمجھ نہیں آ رہی...... تمہارے جیسے ڈاکوؤں کی بہن کا ہاتھ تھاما ہے اس نے......''

سراج گال پہ ہاتھ رکھ کر خاموشی سے نیچے دیکھنے لگا۔ شاہ جہان ہونٹ کاٹتا ہوا بولا۔

''بھیا! اگر اس نے ہمیں عزت دینی تھی تو اپنے والدین کو لاتا...... اس طرح بغیر بزرگوں کے نکاح کرنا............؟''

''اس کی وجہ بھی آپ لوگ ہیں۔'' سلطان نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ لوگ اس کی جان کے درپے ہو گئے تھے۔ اگر یہ والدین تک جانے کی کوشش کرتا تو ضرور جان سے جاتا۔''

''اب تک اس شادی کا کسی کو بھی پتا نہیں ہے...... امید ہے میں دو تین دن کے اندر والدین کو یہاں آنے پر راضی کر لوں گا۔ اور ہم یہ شادی کی تقریب دوبارہ منعقد کر لیں گے؟'' ظہور کی گفتگو نے تابش کے اندر اعتماد پیدا کر دیا تھا۔

ظہور نے پوچھا۔ ''امیمہ کہاں ہے؟''

اسی وقت دروازے کے پیچھے چھپی امیمہ چھوٹے قدم بھرتی سامنے آئی، اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ ظہور نے آگے بڑھ کر اس کا جھکا ہوا سر اپنی چھاتی سے لگایا۔ اور پیار سے بولا۔

''میری گڑیا پریشان کیوں ہے؟''

''بھیا! آپ مجھ سے خفا ہیں نا؟'' اس کے لہجے میں ندامت کا اثر نمایاں تھا۔

''نہیں...... بالکل نہیں...... بس افسوس اس بات کا ہے کہ یہ ہماری ذمہ داری تھی، جسے نبھانے کا تو نے موقع ہی نہ دیا۔

''بھیا میں............''

''صفائی پیش کرنے کی ضرورت نہیں گڑیا!'' ظہور نے اسے بات مکمل نہیں کرنے دی تھی۔ ''میں جانتا ہوں، ایک بے گناہ کی جان بچانے کے لیے تو نے یہ قدم اٹھایا، یقیناً ہم بہت زیادہ جذباتی ہو گئے تھے، اگر اس وقت تم

سے پوچھ لیتے تو ساری صورت حال سامنے آجاتی۔"
"میرا خیال ہے اندر بیٹھ کر یہ باتیں کرنا زیادہ مناسب رہے گا؟" سلطان نے مشورہ دیا۔
"ایسا ہی ہے۔" ظہور نے اس کی تائید کرتے ہوئے قدم اندر کی جانب بڑھا دیئے۔ امیمہ کو اس نے اب تک ساتھ لگایا ہوا تھا۔ باقی بھائیوں نے بھی اس کی تقلید میں اندر داخل ہو گئے۔ ظہور کے راضی ہوتے ہی تمام کی زبانیں بند ہو گئی تھیں۔

☆☆☆

تابش کے سر سے آدھا بوجھ اتر گیا تھا۔ امیمہ کے بھائی ایک دم بدل گئے تھے لگتا ہی نہیں تھا یہ وہی خون خوار اور وحشی لوگ ہیں جو ایک رات پہلے اس کے تعاقب میں خون آشام درندوں کی طرح بھاگ رہے تھے۔ اب صرف والدین کی رضامندی باقی تھی۔ گو ظہور نے تو کہہ دیا تھا کہ تابش کو اپنے والدین وہاں بلانے کی ضرورت نہیں ہے، مگر تابش انہیں عزت دینا چاہتا تھا۔ اس معاملے میں سلطان بھی اس سے متفق تھا۔
"چھوٹے صاحب! آپ فکر نہ کریں میں محمود صاحب سے خود بات کروں گا۔" اس وقت امیمہ کے بھائی چلے گئے تھے اور وہ وہاں اکیلے تھے۔ امیمہ اور شہناز باورچی خانے میں گھسی تھیں۔ امیمہ کے بھائیوں کا رویہ حیران کن حد تک بدل گیا تھا، وہی جو اس کی جان کے درپے تھے، اب بہت عزت اور شفقت سے پیش آرہے تھے۔
"چچا! وہ اتنی آسانی سے نہیں مانیں گے۔ بلکہ، ڈر ہے کہ وہ فی الفور مجھے عاق کر دیں گے۔"
"نہیں......" سلطان نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ اتنا ظلم نہیں ڈھا سکتے؟"
"وہ بس اپنی بات منوانا جانتے ہیں......"
"ہاں......آپ کو ماننے کی عادت جو ہے

......ورنہ دستور یہی ہے کہ والدین، اولاد کی ہر بات مانتے ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ والدین کے دل میں اولاد کی محبت بھری ہوتی ہے......اولاد کے دل میں جتنی زیادہ محبت کیوں نہ ہو؟......والدین کی محبت سے اس کا پلڑہ ہلکا ہی ہوتا ہے۔"
"شاید! ایسا ہی ہو؟......مگر میں نے کبھی تقابل نہیں کیا؟"
"تقابل ہو ہی نہیں سکتا......کیونکہ محبت ناپنے کا کوئی پیمانہ ہی مقرر نہیں ہے۔"
"میرا خیال ہے کل واپس چلنا چاہیے؟"
سلطان نے کہا۔ "میرا بھی یہی خیال ہے......اور کل پہلے میں محمود صاحب سے بات کروں گا اس کے بعد آپ مل لینا؟"
"آپ بھلا کیا بات کریں گے؟"
"یہی کہ، امیمہ میری چھوٹی بہن ہے، چھوٹے صاحب کو سورج نگر کی سیر کراتی رہی ہے، اسی دوران دونوں نے ایک دوسرے کو پسند کیا اور شادی کر لی؟"
وہ کہہ سکتے ہیں......ان سے پوچھا بھی تو جا سکتا تھا نا؟"
"اس لیے نہیں پوچھا، کہ وہ اجازت نہیں دیں گے......اسی طرح ہمیں بھی نہیں بتایا بس مولوی صاحب کو کچھ خرچا پانی دیا اور اس نے نکاح پڑھا دیا۔" سلطان کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "یوں بھی پاکستانی مولوی پہلے بھی کچھ کم بدنام نہیں ہیں ہر کوئی اپنی غلطی ان کے سر ڈالتا ہے ایک ہماری خطا بھی ان کے سر چلی گئی تو کوئی فرق نہیں پڑے گا؟"
"اگر اصل بات بتا دیں پھر؟"
"نہیں......اس میں آپ کی سبکی ہو گی اور والدین کے سامنے آپ کا کردار غلط طور پر پیش ہو گا، امیمہ بھی ان کی نظروں سے گر جائے گی۔ ہو سکتا ہے صاحب پولیس

،غیرہ کی مدد لینے کی کوشش کریں، گو اس طرح وقتی طور پر تو یہ بات دب جائے گی، مگر امیمہ کے بھائی شاید یہ بات نہ بھلا سکیں پھر وہی بدلہ لینے کی بات اور سارے پھڈے، نہیں ...... یہ ٹھیک نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے چچا! جو آپ کی مرضی۔'' تابش اس کے ساتھ متفق ہو گیا تھا۔

☆☆☆

''کیا......؟ ...... یہ کیسے ممکن ہے؟'' سلطان کی بات سنتے ہی محمود خان ہتھے سے اکھڑ گیا تھا۔ ''اور کیا تم اسی مقصد سے تابش کو ساتھ لے گئے تھے؟''

''صاحب! میں مانتا ہوں کہ، قصور وار ہوں ...... لیکن اصل بات میں آپ کو بتا چکا ہوں، نوجوان خون ہم جیسوں کی پرواہ کب کرتا ہے......؟ سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کے ساتھ زندگی تو چھوٹے صاحب نے بتانی ہے؟''

''گویا اب تم مجھے زندگی گزارنے کا طریقہ سکھاؤ گے؟''

''صاحب ......! غریب ہونا کم عقلی کی نشانی نہیں ہے؟ ......اور میں صرف چھوٹے صاحب کی تائید کر رہا ہوں یہ نہیں کہ، میں نے اسے زبردستی شادی پر مجبور کیا ہے؟ ...... یا میری منشا یہی تھی ...... وہ خود پڑھا لکھا ہے، خوب جانتا ہے اسے کیا کرنا چاہیے؟ ...... میرا تو بس اتنا قصور ہے کہ اسے اپنا گاؤں دکھانے لے گیا، اب مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ وہاں کسی لڑکی کو پسند کر بیٹھے گا ...... حالانکہ آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں کہ وہ اس قسم کا بالکل نہیں ہے۔''

محمود خان نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا ...... چند لمحے سوچنے کے بعد اس نے پوچھا۔ ''وہ خود کہاں ہے؟''

''ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہے ...... آپ کا سامنا کرنے کی جرأت نہیں کر پا رہا تھا۔ مجھے بھیجا ہے تاکہ میں اس کی سفارش کر سکوں؟''

''اسے بلاؤ......؟''

سلطان موبائل فون نکال کر اس کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔ وہ یقیناً سلطان کی کال ہی کا منتظر تھا۔

''یس؟'' اس نے کال اٹینڈ کی۔

''چھوٹے صاحب! صاحب جی یاد کر رہے ہیں؟''

''موڈ کیسا ہے؟'' تابش نے بے صبری سے پوچھا۔

''کچھ کہہ نہیں سکتا۔'' سلطان نے صاف گوئی سے جواب دیا۔ ''بس آپ کو بلایا ہے۔''

''امی جان بھی موجود ہیں؟''

''نہیں ...... مالکن اپنے کمرے میں ہیں ...... صاحب سے لائبریری میں بات ہوئی ہے۔''

''اوکے میں آ رہا ہوں ...... اور بات تو وہی کی ہے نا جو طے ہوا تھا۔''

''جی جی۔'' سلطان جلدی سے بولا۔ اور تابش نے رابطہ منقطع کر دیا۔ دونوں نے آتے وقت مشورہ کیا تھا کہ وہ تابش کے والدین کو اصل بات کی خبر نہیں لگنے دیں گے ...... کیونکہ اس میں ایک تو تابش کی سبکی تھی اس کے ساتھ ساتھ امیمہ اور اس کے بھائی بھی تابش کے والدین کی نظروں سے گر جاتے۔ انھوں نے یہی طے کیا تھا کہ وہ محمود صاحب کو یہی بتائیں گے کہ ان دونوں نے ایک دوسرے کو پسند کیا اور شادی کر لی۔ اور شادی بھی سلطان اور امیمہ کے بھائیوں کی بے خبری میں کی۔

آدھے گھنٹے بعد تابش امیمہ کو ساتھ لیے وہاں پہنچ گیا۔ گاڑی پورچ میں کھڑی کرتے ہی وہ امیمہ کو ساتھ لیے لائبریری کی طرف بڑھ گیا۔

دروازہ آہستگی سے کھول کر وہ امیمہ کو ساتھ لیے
''سلام علیکم! میں اندر آ سکتا ہوں؟'' کہتے ہوئے اندر داخل ہوا۔

''وعلیکم سلام! آئیں جی تابش صاحب! آپ مرضی کے مالک ہیں، کیا ضرورت ہے اجازت کی؟'' محمود خان کے لہجے میں گہرے طنز کی آمیزش تھی۔

''تابش نے ہونٹ کاٹتے ہوئے جواب دیا۔
''پاپا! میں اپنے عمل پر ضرور شرمندہ ہوتا اگر اکیلا ہوتا ہے ...... مگر اب میرے ساتھ میری شریک حیات بھی شامل ہے اور اب اپنے فیصلے پر پچھتانا گویا اس کی محبت کا مذاق اڑانا ہے ...... اگر وہ صنف نازک ہوتے ہوئے اپنے چار سخت گیر بھائیوں کا سامنا کر سکتی ہے تو میں مرد ہو کر اپنے محبت کرنے والے مشفق والدین کا سامنا کیوں نہیں کر سکتا؟''

محمود اس جذباتی بلیک میلنگ میں آئے بغیر بولا۔
''یہ محبت اور شفقت تب تک ہوتی ہے جب تک اولاد فرمان بردار رہے؟''

وہ گلوگیر لہجے میں بولا۔''فرمان بردار اولاد کے ساتھ تو سخت گیر والدین کا رویہ بھی شفقت والا ہوتا ہے، مزہ تو تب ہے جب، مجھ جیسے من مانی کرنے والے بدتمیز کو گلے سے لگایا جائے۔''

اس سے پہلے کہ محمود صاحب کوئی جواب دیتے لائبریری کا دروازہ کھول کر تابش کی ماں پروین بیگم اندر داخل ہوئی۔

''تابش! میری جان ...... تم کس وقت آئے؟'' وہ بازو کھول کر محمود خان کے سامنے مجرم بنے کھڑے تابش کی طرف بڑھی۔

''آؤ بیگم! پہلے اپنی بہو سے مل لو ...... بیٹے سے تو ملتی ہی رہتی ہو۔''

''بہو ......؟'' پروین کے لہجے میں حیرانی تھی۔

''میں سمجھی نہیں؟'' اس نے تابش کے ساتھ کھڑی امیمہ کی طرف وزدیدہ نظروں سے دیکھا۔

''سلام ...... ماں جی!'' امیمہ جھجکتے ہوئے بولی۔

''وعلیکم اسلام بیٹی! تابش یہ ......؟''

''آپ کی بہو ہے۔'' محمود خان نے اس کا فقرہ مکمل کیا۔''برخوردار نے شادی کر لی ہے۔''

''سچ تابش!؟'' وہ حیرانی سے چیخی ...... اس کے لہجے میں غصے کے بجائے حیرانی بھرا جوش تھا۔

''جی مما!'' تابش سر جھکاتے ہوئے بولا۔

''اوہ ...... کتنی پیاری ہے میری بہو۔'' پروین بیگم نے کھینچ کر امیمہ کو گلے سے لگا لیا۔''اور یہ کیا مجرموں کی طرح پوچھ گچھ ہو رہی ہے میرے بیٹے بہو سے؟''

''تو کیا داد، دوں اس کے کارنامے پر؟ ...... تم شاید مذاق سمجھ رہی ہو ...... محترم نے سچ مچ شادی کر لی ہے بیگم صاحبہ!'' محمود خان نے جھلاتے ہوئے کہا۔

''اگر یہ جھوٹ ہے، تو میں اسے سچ کرنا چاہوں گی۔'' پروین، امیمہ کا ماتھا چومتے ہوئے بولی۔''بیٹی! اور اس کی باتوں کا برا نہ ماننا یہ ہے ہی ایسا ......''

انھیں آپس میں مصروف دیکھ کر سلطان وہاں سے کھسک لیا۔ اسے پتا تھا کہ اب محمود خان اور اس کی بیگم کی بحث شروع ہو جانی تھی۔

''بیگم! کیا تم بیٹے کے اس عمل کی تحسین کر رہی ہو؟''

''ہاں ...... اتنی پیاری بہو ڈھونڈ لایا ہے میرے لیے ...... سچ ساری زندگی بھی تلاشتی رہتی، تب بھی اس جیسی نہ ملتی؟''

پروین بیگم کی بات پر امیمہ شرما گئی تھی۔ اور پھر تھوڑی دیر بعد محمود خان نے بھی امیمہ کو گلے سے لگا لیا تھا۔

''برخوردار! تو نے دلہن تو اچھی ڈھونڈی مگر دلہن کو

گھر لانے کے طریقہ کار سے مجھے اختلاف ہے، اس لیے کل ہم واپس سورج نگر جا رہے ہیں برات لے کر...... بیگم آپ کو کوئی اعتراض؟''

''ہاں جی! کل نہیں ...... آج اور ابھی......''

''بچے تھکے ہوئے ہیں بیگم۔''

''انھوں نے پیدل نہیں جانا۔'' پروین، حتمی لہجہ میں کہتے ہوئے امیمہ سے مخاطب ہوئی۔ ''کیوں بیٹی! ابھی چلیں کہ نہیں؟''

''جی ماں جی! جیسے آپ کی مرضی؟'' امیمہ آہستہ سے بولی۔

''واہ جی واہ...... ابھی سے بڑی طرف داری ہو رہی ہے؟'' محمود خان ہنستے ہوئے بولا۔ ''بیگم صاحبہ! ایسا ہے کہ سلطان کو ابھی بھیج دیتے ہیں ہم لوگ صبح نکلیں گے...... کیونکہ کچھ عزیز و اقربا کو تو ساتھ لے لیں، اسی طرح بہو کے گھر والوں کو بھی تھوڑی سی تیاری کا موقع مل جائے گا۔''

''ٹھیک ہے جی! سلطان کو واپس بھیج دو مگر بہو ہمارے ساتھ واپس جائے گی۔''

محمود نے پوچھا۔ ''لوگ پوچھیں گے نہیں کہ بہو یہاں موجود ہے تو لینے کسے جا رہے ہو؟''

''کہہ دیں گے، سلطان کی بہن اسے ملنے آئی تھی، ہمیں پسند آ گئی...... بس رشتا لینے جا رہے ہیں۔''

''ٹھیک ہے بیگم صاحبہ! پہلے بھی کسی نے مانی ہے ہماری......؟ ایک بیٹے پر رعب جھاڑ لیتے تھے، اس نے بھی بغاوت کر دی ہے۔'' کہتے ہوئے محمود خان سلطان کی تلاش میں کمرے سے باہر نکل گیا، جبکہ پروین، امیمہ اور تابش سے ساری تفصیل سننے لگی تھی۔

☆☆☆

امیمہ کے بھائی خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے...... چاروں آنے والے مہمانوں کے سامنے بچھے جا رہے تھے، ان کے وہم و گمان میں بھی اس پذیرائی کا تصور موجود نہیں تھا۔ امیمہ اور تابش کے پہلے والے نکاح سے بس چند ہی بندے واقف تھے۔ محمود خان اور پروین کی خواہش پر دوبارہ نکاح پڑھایا گیا تھا۔

امیمہ کے بھائیوں نے مہمانوں اور گاؤں والوں کے لیے اچھی خاصی دعوت کا اہتمام کیا ہوا تھا۔ جب سلطان نے رات گئے پہنچ کر انھیں اگلے دن محمود خان کی آمد کی خوش خبری سنائی تھی تو چند لمحے تو انھیں یقین ہی نہیں آیا تھا۔ اور جب انھیں یقین ہو گیا کہ سلطان مذاق نہیں کر رہا تو وہ اسی وقت انتظامات میں جُڑ گئے تھے۔ اور پھر برات کے آنے تک وہ قریباً تمام ضروری انتظامات سے فارغ ہو چکے تھے۔

تابش کو اس بات پر حیرانی ہو رہی تھی کہ گاؤں کے قریباً تمام لوگ سلطان کو امیمہ کا بھائی کہہ کر بلا رہے تھے اور یہی حیران کرنے والی بات تھی کہ ایک رات میں اس نے کیسے تمام کو یہ پٹی پڑھا دی تھی کہ اسے محمود صاحب اور آنے والے تمام براتیوں کے سامنے امیمہ کا بھائی کہا جائے۔ چونکہ انھوں نے تابش کے والد کو اصل بات کی ہوا بھی نہیں لگنے دی تھی اس لیے چچا سلطان کو واپس بھیجتے وقت اس نے تاکید سے یہ ہدایت کی تھی کہ اس کے والد صاحب کو یہ پتا نہیں چلنا چاہیے کہ وہ امیمہ کا بھائی نہیں بلکہ صرف پڑوسی ہے۔ اور سلطان نے اس بات کا حق ادا کر دیا تھا۔

خورد و نوش کے بعد برات نے واپسی کی راہ لی۔ ظہور برادران نے بڑی کوشش کی کہ وہ رات وہیں پر گزار لیں، مگر محمود خان نے آئندہ کے وعدے پر معذرت کر لی تھی۔

''چلو بھئی سلطان میاں؟'' تابش کے والد نے واپس جاتے ہوئے خوشگوار موڈ میں ظہور سے باتیں کرتے سلطان کو پکارا۔

''نہیں صاحب! اب میں نے ریٹائرمنٹ لے لی ہے۔'' سلطان سر جھکاتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولا۔

''ریٹائرمنٹ کا کیا مطلب ہے جناب؟'' محمود خان حیران رہ گیا تھا۔

سلطان نے کہا ''صاحب! بہنوں کے گھر بھائی ملازم نہیں ہوا کرتے؟''

''میرا خیال ہے...... اس گھر میں کبھی بھی آپ کو نوکر نہیں سمجھا گیا؟'' محمود خان کے لہجے میں شکوہ در آیا تھا۔

''جانتا ہوں...... مگر اب میں معذرت چاہوں گا...... یوں بھی انشاء اللہ امیمہ آپ کو میری کمی محسوس نہیں ہونے دے گی۔''

''یعنی آپ فیصلہ کر چکے ہیں؟''

''جی حضور۔''

محمود خان نے آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''سلطان میاں! خوش رہو، اپنی بہن سے ملنے کے لیے کبھی کبھار آتے رہنا...... اور اتنی پیاری بہو ڈھونڈ کر دینے پر میں تہہ دل سے آپ کا شکر گزار ہوں۔''

سلطان فقط سر ہلا کر رہ گیا تھا۔ اسی وقت تابش آگے بڑھ کر اس کے گلے لگا اور کہا۔

''چچا سلطان! مجھے افسوس ہے کہ ہماری شادی کی وجہ سے آپ کی نوکری چلی گئی۔''

''ایسی شادی پر کئی نوکریاں قربان کر سکتا ہوں چھوٹے صاحب!''

''ویسے......؟ بہت محنت کی ہو گی آپ نے سب گوٹھ والوں کو سمجھانے کے لیے کہ وہ ابو جان اور دوسرے براتیوں کے سامنے آپ کو امیمہ کا بھائی کہہ کر بلائیں۔ اور پھر اس سے زیادہ محنت امیمہ کے بھائیوں کا حلیہ ٹھیک کرنے پر کی ہو گی، یقین مانو...... لگتا ہی نہیں ہے کہ یہ وہی درندے ہیں؟''

وہ اطمینان سے بولا۔ ''نہیں چھوٹے صاحب! جو بات حقیقت ہے، اس کے لیے کسی کو سمجھانے کی کیا ضرورت؟...... ہاں چھوٹے بھائیوں کا حلیہ درست کرنے کے لیے تھوڑی محنت ضرور کرنی پڑی مگر بہن کی شادی کی خوشی میں وہ آسانی سے رضامند ہو گئے۔''

''کیا مطلب؟'' تابش ششدر رہ گیا تھا۔

''مطلب یہ کہ امیمہ سچ مچ میری بہن ہے...... اور ہر بھائی کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کی بہن کو اچھا گھر ملے... لیکن میرے چھوٹے بھائیوں کا کردار ایسا نہیں تھا کہ میری بہن کو اتنے اچھے گھرانے میں رشتا ملتا، بلکہ میرے بھائیوں کا کردار اچھا ہوتا تب بھی امیمہ کو اتنا اچھا رشتا نہیں مل سکتا تھا... مجبوراً مجھے یہ سارا ڈراما ترتیب دینا پڑا۔''

''چچا سلطان؟'' تابش کا دماغ جیسے سن ہو گیا تھا۔

''مجھے معاف کر دینا بیٹا!'' سلطان نے زندگی میں پہلی بار اسے چھوٹے صاحب کے بجائے بیٹا کہہ کر پکارا تھا۔

اچانک تابش کے منہ سے قہقہہ برآمد ہوا۔

''چچا سلطان! کیا کہنے آپ کی منصوبہ بندی کے...... خیر امیمہ ایسی لڑکی نہیں ہے کہ میں اس کے بھائیوں کو تنگ کرنے کی جرأت کر سکوں...... وہ کیا کہتے ہیں......؟ سارا زمانہ ایک طرف اور جورو کے بھائی ایک طرف۔''

اس کی بات نے سلطان کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ بکھیر دی تھی۔ وہ تابش کی طبیعت سے اچھی طرح واقف تھا۔ وہ یقیناً امیمہ کے لیے ایک آئیڈیل شریک حیات تھا۔ بہن کی ذمہ داری سے بحسن خوبی نبٹنے کے بعد وہ بہت راحت محسوس کر رہا تھا۔

◆✻◆

موت کے ہرکارے

کہتے ہیں مہمان اللہ کی رحمت ہوتے ہیں مگر مرنے والوں کو معلوم نہیں تھا کہ وہ مہمانوں کے روپ میں موت کے ہرکارے ہیں۔

☆ دستگیر شہزاد
0300-9667909

62 سالہ سردار راحت اللہ ڈوگر سجان پور کے اصل باشندے تھے۔ روزگار کے سلسلے میں برسوں قبل وہ لاہور آ کر بس گئے تھے اور وہیں رہتے تھے۔ ڈوگر کے کنبے میں بیوی مریم ڈوگر کے علاوہ دو اولادیں تھیں۔ بیٹا غافر اسلام آباد میں سیٹ ہو گیا تھا اور بیٹی فضہ ملتان میں رہ رہی تھی۔ ڈوگر کامیاب اور سلجھے ہوئے بزنس مین تھے ہی اس کے علاوہ وہ مذہبی سماجی اور سیاسی دلچسپی بھی رکھتے تھے۔ وہ علاقہ سول لائن تنظیم کے خزانچی رہ چکے تھے۔ فرحت سیٹھیا اور سردار رحمت اللہ ڈوگر، سردار برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ ان دنوں کچھ سردار لاہور آئے ہوئے تھے اور انہی کے علاقے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اس لئے سرداروں کے ناشتے وغیرہ کے انتظام کے لئے فرحت سیٹھیا 19 فروری کی صبح راحت اللہ ڈوگر کے گھر پہنچ گئے۔ فرحت سیٹھیا کو عجیب تب لگا جب کوٹھی کا لوہے کا گیٹ کھلا ملا۔ عام طور سے گیٹ کھلا نہیں رہتا تھا۔ کسی کے آنے جانے پر ہی گیٹ کھولا جاتا تھا اور پھر بند کر دیا جاتا تھا۔ گیٹ کھولنے و بند کرنے کا کام نوکر عامر کیا کرتا تھا۔ سیٹھیا کھلے گیٹ سے اندر پہنچے تو حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا۔ صدر دروازہ بھی کھلا ہوا تھا۔ سیٹھیا نے ڈور بیل بجائی۔ راحت اللہ ڈوگر اور ان کے نوکروں کے نام لے کر آواز دی مگر کوٹھی میں کسی قسم کی ہلچل نہیں ہوئی۔ نہ کوئی پکار سن کر باہر آیا۔ سیٹھیا کو یہ سب بڑا عجیب اور غیر یقینی سا لگا۔ چونکہ سیٹھیا کا کوٹھی میں آنا جانا تھا اس لئے وہ اندر داخل ہو گئے۔ پوری کوٹھی میں گہرا سکوت چھایا ہوا تھا۔ سیٹھیا ایک ایک کمرے کو دیکھتے ہوئے راحت اللہ ڈوگر کے بیڈ روم میں پہنچے تو وہاں کا منظر دیکھ کر ان کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔

کرسی پر بندھے راحت اللہ ڈوگر خون سے نہائے ہوئے تھے۔ قریب جا کر دیکھا تو احساس ہوا کہ وہ زندگی کی بازی ہار چکے ہیں۔ پاس ہی زمین پر ان کے ڈرائیور چاند، کک ساقی خان اور نوکر عامر کی لاشیں پڑی تھیں۔ اب اور وہاں ٹھہرنے کا حوصلہ سیٹھیا کے اندر نہیں تھا۔ وہ کوٹھی سے باہر آئے اور موبائل سے ڈی پی او کو فون کر دیا۔ ڈی پی او کی طرف سے یہ اطلاع علاقائی تھانہ سول لائن کو دی گئی۔ وہاں سے انسپکٹر عقیل مغل ضروری پولیس فورس لے کر موقع پر پہنچ گئے۔

عقیل مغل نے دیکھا۔ بیڈ روم میں پانچ الماریاں تھیں جن میں چار کے تالے توڑے گئے تھے۔ الماریوں کا سارا سامان الٹ پلٹ تھا اور لاکر میں کوئی قیمتی چیز نہیں تھی۔ جلد بازی یا گھبراہٹ میں لٹیرے پانچویں الماری توڑ نہیں پائے تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ بدمعاش لوٹ کی نیت سے کوٹھی میں آئے تھے اور مالک سمیت تینوں نوکروں کا قتل کر دیا تھا۔ عقیل مغل نے لاشوں کا معائنہ کیا۔ انہوں نے دیکھا راحت اللہ ڈوگر کو کرسی سے باندھ گیا تھا۔ ان کے ہاتھ پیر ٹیپ سے بندھے ہوئے تھے اور منہ پر بھی ٹیپ چپکا ہوا تھا۔ جسم پر زخم تھے اور گلا کٹا ہوا تھا۔ تینوں نوکروں کے بھی گلے کٹے ہوئے تھے۔ گلے پر ایسے بھی نشان ظاہر ہو رہے تھے جیسے گلا گھونٹنے کی کوشش کی گئی ہو۔ سیٹھیا نے عقیل مغل کو یہ بھی بتایا کہ پچھلے کچھ دنوں سے مقتول کی بیوی رشتہ داری میں سجان پور گئی ہوئی تھی۔ سیٹھیا چونکہ فرحت اللہ ڈوگر کنبے کے دوست تھے اس لئے ان کے پاس سبھی کے نمبر تھے۔ انہوں نے ان سب کو فون کر کے حادثہ کی اطلاع دے دی اور بلا تاخیر لاہور پہنچنے کے لئے کہا۔

فرحت اللہ ڈوگر کے مقامی رشتہ داروں اور دوستوں اور بہی خواہوں کو بھی انہوں نے فون کر دیا۔

حادثہ کے بعد کتنی رقم کی لوٹ ہوئی تھی، یہ مقتول کی بیوی کے آنے پر معلوم ہو سکتا تھا۔ اس لئے پولیس نے موقع پر ضروری کارروائی کرنے کے بعد لاشوں کو پوسٹ مارٹم کے لئے بھیج کر کوٹھی کو سیل کر دیا۔ اسی دوران تھانہ

ٹاؤن لائن میں قتل اور ڈکیتی کی دفعات کے تحت مقدمہ قتل قائم کر لیا گیا۔ چونکہ اجتماعی قتل کیس و لوٹ کی یہ بڑی واردات تھی اس لئے یہ معاملہ کرائم برانچ کے سپرد کر دیا گیا اور انسپکٹر گلفام کی سرکردگی میں ایک تفتیشی ٹیم بنا دی گئی۔

حادثہ والے دن ہی دیر شام سے مقتول کے گھر والے لاہور پہنچنے لگے۔ لہٰذا کوٹھی کی حفاظت کے لئے لگائی گئی سیل 20 فروری کو گلفام نے توڑ دی۔ اس کے بعد پولیس کے ساتھ گھر والوں نے کوٹھی میں قدم رکھا۔ مریم ڈوگر نے ٹوٹی الماریاں دیکھ کر بتایا کہ نقدی و گہنوں سمیت لاکھوں کی لوٹ ہوئی تھی۔ صحیح صحیح وہ اس لئے نہیں بتا سکیں کیونکہ راحت اللہ ڈوگر اپنا پیسہ کبھی کسی ایک الماری میں نہیں رکھتے تھے۔ چونکہ گھر میں تھے اس لئے تحفظ کے لئے وہ الماری اور لاک بدلتے رہتے تھے۔

لٹیروں کا نشانہ بننے سے بچ گئی پانچویں الماری پولیس کی موجودگی میں کھولی گئی تو اس میں سات لاکھ روپے نقد اور تقریباً پندرہ کلوگرام چاندی اور کچھ زیور ملے۔ تفتیش سے پتہ چلا کہ راحت اللہ ڈوگر کا ڈرائیور 45 سالہ چاند لاہور کے ہی چونگی امر سدھو کا رہائشی تھا جبکہ گھریلو نوکر 18 سالہ عامر اور باورچی 30 سالہ ساقی خان پشاور کے رہنے والے تھے۔ سردار کنبے کے ممبروں نے بتایا کہ تینوں نوکر وفادار اور بھروسے مند تھے۔ نہ تو کبھی بے ایمانی کی تھی اور نہ کسی قسم کی شکایت کا موقع دیا تھا۔ مریم ڈوگر سے مقتول نوکروں کے گھروں کے پتے اور فون نمبر لے کر انہیں اطلاع بھیج دی گئی۔

پڑوسیوں سے سراغ نہ ملنے پر گلفام نے سردار کنبے اور ان کے بہی خواہوں کو تفتیش میں شامل کیا۔ ان میں چوہدری کا ابرار احمد بھی تھا۔ ابرار احمد رشتے میں سردار راحت اللہ ڈوگر کا بھائی لگتا تھا۔ ابرار احمد نے گلفام کو بتایا۔ سر! 18 تاریخ کی شام کو مریم ڈوگر کا مجھے فون آیا کہ

بعض اوقات کوئی ٹھہرا ہوا آدمی بھی ایسی بات کر جاتا ہے جس سے صدیوں کی رُکی ہوئی دانش خشک پتھریلی زمین میں چشمے کی طرح جاری ہو جاتی ہے۔

سبحان پور میں ان کی ٹیوٹا کار کی چابی گم ہو گئی ہے۔ کار کی دوسری چابی گھر پر ہے لیکن راحت اللہ ڈوگر صاحب نہ فون اٹھا رہے ہیں نہ گھر کا کوئی نوکر۔ آپ اپنے نوکر کو وہاں بھیج کر چابی منگوا دیں اور اسے کسی کے ہاتھ سبحان پور بھیج دیں۔ تب میں نے گٹو کو چابی لینے بھیجا تو کافی دیر تک گھنٹی بجانے کے بعد بھی دروازہ نہیں کھلا۔ تب گٹو نے مجھے فون کیا کہ راحت اللہ ڈوگر صاحب دروازہ نہیں کھول رہے ہیں۔ میں نے اُس سے کہا کہ وہ کچھ کام کر رہے ہوں گے۔ دوبارہ گھنٹی بجاؤ۔ گٹو نے جب دوبارہ گھنٹی بجائی تو کسی گھریلو فرد کے بجائے ایک لڑکی نے دروازہ کھولا۔ گٹو نے اس سے چابی مانگی۔ اس نے گٹو کو باہر ہی کھڑے رکھا اور چابی لا کر اُسے دے دی۔

”گٹو کہاں ہے؟“ گلفام نے پوچھا۔

”سر! گھریلو کام کے علاوہ وہ میری کار بھی ڈرائیو کرتا ہے۔“ ابرار احمد نے بتایا۔ ”کوٹھی کے باہر میری کار کھڑی ہے گٹو کار میں ہی ہوگا۔“

گٹو کو بلا لیا گیا۔ گلفام نے اس سے پوچھ گچھ کی۔ جس لڑکی نے دروازہ کھول کر تمہیں چابی دی تھی اُس پر شک کی تمہاری کیا بنیاد ہے؟

جب لڑکی نے دروازہ کھولا تو وہ کچھ گھبرائی ہوئی لگ رہی تھی۔ اس نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کیا بات ہے اور یہاں کیوں آئے ہو؟“

میں نے آنے کا سبب بتایا تو وہ بولی۔ ”تم یہیں رکو میں راحت اللہ ڈوگر سے پوچھ کر آتی ہوں“۔ اس کے بعد اس نے دروازہ بند کر دیا۔ دو تین منٹ بعد واپس آئی۔ مجھے کار کی چابی دی تو میں نے پوچھا۔ آپ کون

بڑے رشتہ دار چھوٹے گاؤں کے پاس سے گزرنے والی اس ریلوے لائن کی طرح ہوتے ہیں جو بیچ میں حائل ہو کر وہاں کے رہنے والوں کو قریبی شہر جانے والی پختہ سڑک سے منقطع کر دیتی ہے۔

ہیں؟ اُس پر اس نے آنکھیں نکال کر مجھے دیکھا۔ تم سے مطلب؟ اور پھر دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ اس کے بعد میں چابی لے کر چلا آیا تھا۔

صاف ظاہر تھا کہ واردات میں بدمعاشوں کے ساتھ لڑکی بھی شامل تھی۔ گلفام نے پوچھا۔ اس لڑکی کے بارے میں کچھ اور بتا سکتے ہو؟"

"سر! شکل و صورت اور پہناوے سے وہ اچھے گھر کی لگ رہی تھی"۔ گٹو نے کہا۔

"وتمہیں اس کی شکل یاد ہے۔ دوبارہ دیکھو گے تو اسے پہچان لو گے؟"

"سر جی! اس کی شکل میں برسوں نہیں بھول سکتا۔ اس کا فوٹو دیکھوں تب بھی پہچان لوں گا"۔

تب تک پوسٹ مارٹم کے بعد راحت اللہ ڈوگر کی لاش ان کے وارثوں کے سپرد کر دی گئی تھی۔ چاند کی لاش بھی اس کے گھر والوں نے لے لی تھی۔ چونکہ پشاور سے عامر اور ساقی خان کے گھر والے ابھی لاہور نہیں پہنچے تھے اس لئے ان کی لاشیں مردہ گھر میں محفوظ رکھوا دی گئیں۔

21 فروری کو گلفام اپنی ٹیم کے ساتھ راحت اللہ ڈوگر کے گھر پہنچے انہوں نے مریم ڈوگر سے ان کی فیملی البم مانگی۔ پولیس ٹیم یہ سمجھ چکی تھی کہ وہ لڑکی ڈوگر کنبے کی قریبی ہے۔ اس البم کو انہوں نے گٹو کو دکھایا تو اس نے ایک لڑکی کے فوٹو پر انگلی رکھ کر کہا۔

"صاحب! یہی تھی وہ لڑکی"۔

گلفام نے مریم ڈوگر سے پوچھا۔ "یہ لڑکی کون ہے؟"

مریم ڈوگر چونکیں۔ "یہ تو گل رعنا ہے۔ راحت اللہ ڈوگر صاحب کے بھانجے شہریار کے ساتھ اس کی شادی ہوئی تھی۔ گل رعنا کو اسمیک پینے کی عادت تھی۔ اس لئے شہریار سے اس کا جھگڑا ہوتا رہتا تھا۔ گل رعنا نے اسمیک تو نہیں چھوڑی شوہر کو ہی چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے میکے چلی گئی"۔

"آپ کے گھر گل رعنا کا آنا جانا تھا؟"

"شادی کے بعد شہریار کے ساتھ دو تین بار آئی تھی۔ شہریار کو چھوڑ کر چلی گئی تو اُس سے ہمارا بھی رشتہ نہیں رہ گیا تھا۔ میرے علم کے مطابق علیحدگی کے بعد گل رعنا یہاں نہیں آئی"۔

"گل رعنا کا پتہ بتایئے؟"

مریم ڈوگر نے پتہ نوٹ کرا دیا۔

گلفام نے اپنی ٹیم کے ساتھ گل رعنا کو تلاش کیا 21 فروری کو ہی دیر شام کو اسے اس کے گھر سے گرفتار کر لیا گیا۔ گل رعنا کو تھانہ سول لائن لا کر پوچھ گچھ کی گئی تو راحت اللہ ڈوگر کوٹھی میں ہوئی لاکھوں کی لوٹ اور اجتماعی قتل کی گتھی سلجھ گئی۔ واقعہ میں شامل اس نے اپنے ساتھیوں کے نام بھی بتا دیئے۔ بس اپنے ایک ماما قاسم کا نام چھپا گئی۔

گلفام نے گل رعنا سے اس کے ساتھیوں کے موبائل نمبر لے کر سرولانس پر لگوا دیئے۔ لمحہ لمحہ ان کی لوکیشن ٹریس کی جانے لگی۔ اس ٹریس لوکیشن کی بنیاد پر 22 فروری کو عید و نگر سے واردات میں شامل رحمان، حمزہ اور احمد بٹ کو گرفتار کر لیا گیا۔ ان میں سے رحمان گل رعنا کا بھائی، حمزہ ماما اور احمد بٹ رحمان کا دوست تھا۔ ان تینوں سے پوچھ گچھ کی تو معلوم ہوا کہ واردات میں گل رعنا کا ایک اور ماما زاہد بھی شامل تھا۔ اسی دن زاہد کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ گرفتار ملزموں سے پوچھ گچھ کی گئی تو واقعہ کا پورا سچ سامنے آ گیا۔

25 سالہ گل رعنا اپنے کنبے کے ساتھ اسلام پورہ لاہور میں رہتی تھی۔ اس کا باپ عدنان پیشہ سے پینٹر تھا۔ گل رعنا کا ایک چھوٹا بھائی 23 سالہ رحمان محض چھٹی کلاس تک پڑھا ہوا تھا اور سکول وین چلاتا تھا۔ اسے چھ ہزار روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ رحمان کے علاوہ گل رعنا کی ایک بہن تھی افشاں، اس کی شادی ہو چکی تھی۔ افشاں کی سسرال والے رحمت اللہ ڈوگر کے رشتے دار تھے۔

گل رعنا کے باپ عدنان کو اسمیک کی لت تھی۔ باہر تو وہ اسمیک پیتا ہی تھا گھر میں بھی وہ اسمیک کی پڑیا لا کر رکھ دیتا تھا اور نشہ اترتے ہی وہ گھر میں اسمیک پی لیتا تھا۔ بارہویں پاس کرنے کے بعد گل رعنا نے پڑھائی چھوڑ دی تھی اور اب وہ تناؤ میں رہتی تھی۔ یہ تناؤ اسے اپنے مستقبل کی طرف سے تھا۔ سوچتی تھی کہ آج کل شادی ایک کاروبار ہو کر رہ گئی ہے جو اپنی بیٹی بہن کی شادی میں جتنا زیادہ پیسہ خرچ کرتا ہے اسے اتنا ہی اچھا داماد ملتا ہے۔ بڑی بہن افشاں کا نصیب اچھا تھا جو امیر گھرانے میں بیاہ ہو گیا۔ اس کے باپ اور بھائی کی آمدنی زیادہ نہیں تھی۔ اس لئے اسے کوئی ایسا ویسا ہی دولہا ملے گا۔ انہی تناؤ کے دنوں میں ایک دن گل رعنا نے سوچا۔ میرے والد ٹینشن میں رہتے ہیں۔ اس لئے اسمیک پیتے ہیں اور نشہ ہوتے ہی ان کے چہرے پر چمک کے ساتھ مسکراہٹ چھا جاتی ہے۔ ضرور اسمیک غم اور پریشانی بھلا دیتی ہوگی۔ کیوں نہ اسمیک پی کر دیکھی جائے۔ گھر میں اسمیک کی پڑیاں رکھی ہی رہتی تھیں۔ اس لئے استعمال کا طریقہ بھی وہ باپ کو دیکھ کر جان گئی تھی۔ گل رعنا نے ایک پڑیا نکالی اور طریقے سے دیا سلائی سے سلگا کر گہری سانس میں سارا دھواں پھیپھڑوں میں بھر لیا۔ نشیلے دھوئیں نے فوراً اثر دکھانا شروع کر دیا۔ گل رعنا کا تناؤ دور ہو گیا اور وہ امنگوں، جوش اور چستی و پھرتی سے بھر گئی۔ بس اس دن سے گل رعنا کو اسمیک کا چسکا لگ گیا۔

جلد ہی یہ بات عدنان کو پتہ چل گئی کہ اس کے نشے کی خوراک سے گل رعنا نشہ کرتی ہے۔ گل رعنا لاڈلی بیٹی تھی۔ اس لئے اس نے بیٹی سے کچھ نہیں کہا اور خود اسمیک لا کر دینے لگا۔ کبھی کبھی تو باپ بیٹی ساتھ بیٹھ کر نشہ کرنے لگتے۔ بہت زیادہ نشہ کرنے کے سبب عدنان کھوکھلا ہو گیا تھا۔ متعدد بیماریوں نے بھی اس کے جسم میں مستقل طور پر بسیرا کر لیا تھا۔ اسی کی وجہ سے 2013ء میں اس کی موت ہو گئی۔ باپ کی موت کے چند ہفتوں بعد گل رعنا کی قسمت کی کھڑکی کھل گئی۔

دراصل افشاں نے خود کو ایک خوش اخلاق بہو ثابت کر دیا تھا، سبھی لوگ اس کی تعریف کرتے نہیں تھکتے تھے۔ افشاں کی سسرال کے رشتہ داری میں پتہ چلا کہ اس کی ایک چھوٹی بہن شادی کے قابل ہے۔ سبھی کا ماننا تھا کہ جب بڑی بہن ہنرمند، بااخلاق اور مہذب ہے تو چھوٹی بہن بھی ویسی ہی ہوگی۔ ان دنوں شہریار کے لئے لڑکی کی تلاش کی جا رہی تھی۔ شہریار اپنے کنبے کے ساتھ علی پارک میں رہتا تھا اور قریبی رشتے میں رحمت اللہ ڈوگر کا بھانجا لگتا تھا۔ رشتے داروں نے اس کے ماں باپ افشاں کی چھوٹی بہن گل رعنا کے بارے میں بتایا۔

> کوئی دیوار ہونی چاہئے۔ سو فیصد تعمیری سرگرمی، فارن ریڈ کا بہترین مصرف، سائے پر ٹیکس بھی لگایا جا سکتا ہے۔ شہر کی تجرباتی بنیادوں پر تقسیم ہو سکتی ہے۔ بحالت مجبوری اس کی طرف منہ کر کے تھوکا جا سکتا ہے۔ فائرنگ سکواڈ والے مطلوبہ آدمی کو اس کے ساتھ کھڑا کر سکتے ہیں اور بعدازاں مرنے والے کے لئے اس پر زندہ باد بھی لکھا جا سکتا ہے۔ دیوار گریہ کی طرح یہاں اپنی حماقتوں پر آنسو بہائے جا سکتے ہیں۔ دکھوں کا کوئی سامع نہ ہو تو ان کے اپلے بنا کر چپکائے جا سکتے ہیں۔

طرح شہریار کے ساتھ گل رعنا کی شادی ہو گئی۔ یہ ماہ جون 2013ء کی بات ہے۔

گل رعنا پہلے تناؤ دور کرنے کے لئے اسمیک کا استعمال کرتی تھی۔ اس کے بعد مزے کے لئے پینے لگی سہاگ رات ہوئی تو وہ نشے میں تھی۔ شہریار بے وقوف نہیں تھا۔ وہ جان گیا کہ دلہن نشے میں ہے۔ صبح جب اس نے گل رعنا سے اس بارے میں سوال کیا تو پہلے تو گل رعنا نے انکار کیا۔ پھر قبول کر لیا کہ وہ اسمیکی ہے۔ تو شہریار نے اُسے سمجھایا۔

"گل رعنا! پہلے کی بات اور تھی اب کی بات اور ہے۔ اب تم میری بیوی اور ایک بھلے گھر کی بہو ہو۔ کل کو ماں بھی بنو گی، تم نشہ کرو گی تو خود بدنام ہو گی اور کنبہ پر بھی اس کا بُرا اثر پڑے گا اب میری قسم کھاؤ کہ آئندہ تم اسمیک یا کوئی دوسرا نشہ نہیں کرو گی"۔

گل رعنا نے شوہر کی قسم کھا کر نشہ چھوڑنے کا وعدہ تو کر لیا لیکن اس پر قائم نہ رہ سکی۔ جس پر آئے دن اس کا شہریار سے جھگڑا ہونے لگا۔ جھگڑے بڑھتے گئے۔ انہی جھگڑوں کے نتیجے میں گل رعنا نے شوہر کا گھر چھوڑ دیا اور کبھی واپس نہ آنے کے لئے میکے لوٹ آئی۔

ان دنوں گل رعنا کے بھائی رحمان کا شبانہ نامی لڑکی سے دھواں دھار عشق چل رہا تھا۔ گل رعنا بھی بھائی کی محبت کی حمایتی بن گئی۔ اس کے بعد نومبر 2013ء میں رحمان نے شبانہ سے محبت کی شادی کر لی۔ شادی کے بعد خرچ بڑھے تو پارٹ ٹائم میں رحمان دوسری وین چلانے لگا۔ گل رعنا کے نشے کی تکمیل کے لئے رحمان ہی پیسہ دیتا تھا۔ رحمان کا ہاتھ تنگ ہوتا تو گل رعنا اپنے ننھال جا کر ماماؤں سے پیسہ لے آتی تھی۔ اس پیسے سے وہ ذاتی ضروریات کے ساتھ نشے کی لت بھی پوری کرتی تھی۔

گل رعنا کا ننھال ہاؤسنگ کالونی میں تھا۔ اس کے نانا اصغر علی کی سالوں پہلے موت ہو چکی تھی۔ ننھال میں

غزل

ساغر صدیقی

نہ خوفِ خُدا ہے نہ خوفِ خُدائی
بشر دے رہا ہے بشر کی دُہائی
نہ جانے کہاں کھو گئی ہے مروّت
بڑی دُور تک تو مرے ساتھ آئی
نگاہوں کے انداز بدلے گئے ہیں
وہی ہے مگر رسمِ جلوہ نُمائی
کسی کے مہکتے ہوئے گیسوؤں میں
شگوفوں نے سیکھی ہے شُعلہ نوائی
فضائے مقدر بدل دی ہے ساغر
نظر جب کبھی زندگی سے ملائی

نانی کے علاوہ تین ماما تھے زاہد، سہیل اور حمزہ۔ پچھلے کچھ عرصہ سے سہیل قتل کے کیس میں کوٹ لکھپت جیل میں بند تھا۔

33 سالہ احمد بٹ پیشے سے ڈرائیور تھا اور رحمان کا دوست تھا۔ اس اکیلے پر بیوی، دو بچوں، بیوہ بہن نازلی اور بوڑھے ماں باپ کی ذمہ داری تھی۔ چار ماہ قبل احمد بٹ کی نوکری چلی گئی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ 45 ہزار روپے کا مقروض ہو گیا تھا اور ہر وقت تناؤ میں رہتا تھا۔

ایک دن رحمان جس وین کو چلا رہا تھا۔ ٹکر لگ کر وہ ٹوٹ پھوٹ گئی اور سامنے والی دوسری کار کو بھی بھاری نقصان پہنچا۔ وہ کار ایک دبنگ آدمی کی تھی۔ اس نے رحمان، حمزہ اور احمد بٹ کو پکڑ لیا جو وین میں موجود تھے اور ان سے کار مرمت کے ہرجانے کے طور پر چالیس ہزار روپے مانگے۔ تینوں پھکو تھے لیکن اس آدمی کے خوف سے انہوں نے مذکورہ رقم جلد چکانے کا وعدہ کر لیا۔ اس کے بعد وہ تینوں گھر لوٹ آئے۔ گردن بچانے کے لئے چالیس ہزار روپے دینا ضروری تھا اور جالب ٹھیکیدار کی

ہن کی مرمت بھی کرانا تھی لیکن سوال یہ تھا کہ اتنی بڑی رقم کہاں سے آئے۔ مذکورہ تینوں سر جوڑ کر بیٹھے تو لوٹ کرنے کا منصوبہ بننے لگا۔ یہ بھنک گل رعنا کے کانوں میں پڑی تو وہ فوراً ان کے پاس آ بیٹھی اور بولی۔

"میں ایک ایسا گھر بتا سکتی ہوں جہاں لوٹ کرنے پر پچاس ساٹھ لاکھ کا مال ملنا ملتا ہے"۔ اس کے بعد گل رعنا نے رحمت اللہ ڈوگر کی امارت کا ایسا بیان کیا کہ اس کے گھر میں ہی لوٹ مار کرنے کا منصوبہ بن گیا اور پھر لاکھوں کا لالچ دے کر اس منصوبے میں زاہد کو بھی شامل کر لیا گیا۔

14، 15 اگست کو گل رعنا و زاہد نے رحمت اللہ ڈوگر کے گھر کی ریکی کی تو انہیں معلوم ہو گیا مریم ڈوگر سبحان پور میں کسی رشتے دار کے گھر گئی ہوئی تھیں۔ رحمت اللہ ڈوگر کے باہر آنے جانے کا وقت بھی انہوں نے معلوم کر لیا۔

17 اگست کو گل رعنا کی سربراہی میں چاروں ساتھی رحمت اللہ ڈوگر کے گھر پہنچ گئے۔ چونکہ ساقی خان اور عامر گل رعنا کو پہچانتے تھے۔ اس لئے انہوں نے کوٹھی کا دروازہ کھول دیا۔ وہ رحمت اللہ ڈوگر سے ملنے کے بہانے وہاں گئی تھی۔ گل رعنا کو پتہ تھا کہ رحمت اللہ ڈوگر کے بیڈ روم میں پانچ الماریاں ہیں۔ جن میں ہمیشہ موٹا مال رہتا ہے۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر انہوں نے دیکھا بیڈ روم میں لاک لگا ہوا تھا۔ لاک توڑنے کے لئے ڈرل مشین کی ضرورت تھی۔ جو ان کے پاس نہیں تھی۔ الماری توڑنے کے لئے اوزار بھی وہ نہیں لائے تھے۔ اس لئے آپس میں گپ شپ مشورہ کر کے اس دن ایکشن کا منصوبہ ملتوی کر دیا۔ اس کے بعد نوکروں سے گل رعنا دوسرے دن کا کہہ کر ان چاروں کے ساتھ کوٹھی سے چلی گئی۔

18 اگست کو گل رعنا چاروں ساتھیوں کے ساتھ پھر کوٹھی پر پہنچی۔ ساقی خان نے دروازہ کھولا اور انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھا لیا اور بتایا کہ رحمت اللہ ڈوگر

> مسئلہ تب پیدا ہوتا ہے جب بعض لوگ ہومیو پیتھی کے اس اصول کو اخلاقیات پر لاگو کرتے ہوئے سمجھ بیٹھتے ہیں کہ ورم کی طرح جرم کے مٹنے کے لئے بھی اس کا پوری طرح ابھر کر سامنے آنا ضروری ہیں۔

صاحب ایک ڈیڑھ گھنٹے میں آئیں گے۔ واردات کے لئے اتنا وقت کافی تھا۔ پانچوں نے آنکھوں آنکھوں میں اشارہ کیا۔ اس کے بعد جھپٹ کر ساقی خان کو دبوچ لیا۔ اس کے منہ پر ٹیپ چپکایا اور ہاتھ پیر باندھ دیئے۔ اس کام سے فارغ ہوئے تھے کہ گھریلو نوکر عامر آ گیا۔ ان پانچوں نے چاقو و کھلونا پستول دکھا کر اسے بھی قیدی بنا لیا۔ اس کے بعد لٹیروں نے ڈرل مشین سے بیڈ روم کے دروازے کا تالا توڑا اور اندر داخل ہو گئے۔ ساقی و عامر ان کی آنکھوں کے سامنے رہیں، اس مقصد سے انہیں بھی کھینچ کر بیڈ روم میں لے گئے۔ بیڈ روم میں پہنچتے ہی ڈرل مشین و دیگر اوزاروں سے الماریوں کے تالے توڑنے شروع کر دیئے۔ الماریوں کے لاکر میں جو نقدی، گہنے اور دیگر قیمتی سامان ملا انہیں بیگ میں رکھ لیا۔ سارا کام سکون سے ہو رہا تھا۔ تبھی دروازے پر ہارن بجا۔ گل رعنا سمجھ گئی کہ رحمت اللہ ڈوگر وقت سے پہلے لوٹ آئے ہیں۔ رحمت اللہ ڈوگر لوٹے ہیں تو یقیناً ڈرائیور چاند بھی ان کے ساتھ ہوگا۔ گل رعنا نے اپنے ساتھیوں سے دو اور لوگوں سے نپٹنے اور قید کرنے کے لئے تیار رہنے کا کہہ دیا۔

پہلے ہارن بجتا رہا پھر ڈور بیل بجنے لگی۔ ظاہر تھا کہ مالک اور ڈرائیور کار سے اتر کر دروازے پر آ پہنچے تھے۔ پانچوں لوگ ہتھیاروں سے لیس ہو کر صدر دروازے پر پہنچ گئے۔ گل رعنا نے دروازہ کھولا رحمت اللہ ڈوگر اسے دیکھ کر چونکے۔

"ارے گل رعنا تم، ساقی خان نے بتایا تھا کہ کل تم

اگر مانگنے والے کو ڈھنگ سے مانگنا آ جائے تو دینے والا
مانگنے سے پہلے ہی دینے کے لئے بے چین ہوتا
ہے۔

مجھ سے ملنے آئی تھیں۔ کوئی خاص بات ہے کیا؟'' گل رعنا مسکرائی اندر آ ئیے تو بتاؤں۔

بے چارے رحمت اللہ ڈوگر کو کیا معلوم تھا کہ یہ مہمان نہیں، موت کے ہرکارے ہیں۔ اپنی موت سے بے خبر۔

رحمت اللہ ڈوگر اور چاند نے جیسے ہی کوٹھی میں قدم رکھا دروازے کی اوٹ میں کھڑے رحمان، حمزہ، زاہد اور احمد بٹ نے اپنی چاقوؤں اور کھلونا پستول سے کور کر لیا۔

''خبردار! چیخنے چلانے یا کوئی اور چالاکی کرنے کی کوشش کی تو مارے جاؤ گے''۔ گل رعنا نے پھر دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

چاروں ان دونوں کو کور کئے ہوئے بیڈ روم میں لے گئے اور رحمت اللہ ڈوگر کو کرسی سے باندھ دیا۔ چاند کو بھی باندھ کے زمین پر ڈال دیا۔ اس کے بعد لٹیرے رحمت اللہ ڈوگر سے گھر میں موجود مال اور چابیوں کے بارے میں پوچھنے لگے۔ رحمت اللہ ڈوگر نے چابیوں کا پتہ نہیں بتایا تو جسم پر چاقو کے وار کر کے انہیں سنگین طور سے زخمی کر دیا۔ بوڑھے کمزور رحمت اللہ ڈوگر کی حالت اتنے سے ہی خراب ہونے لگی۔

رحمت اللہ ڈوگر کے چابیوں کا پتہ نہ بتانے پر ان لوگوں نے ساتھ لائے اوزاروں سے الماری توڑنا اور مال سمیٹ کر بیگ میں بھرنا جاری رکھا۔ تبھی ڈور بیل بجی۔ اس بار ان پانچوں کو گھبراہٹ ہوئی۔ رحمان، حمزہ، زاہد اور احمد بٹ ہتھیار سنبھال کر اوٹ میں کھڑے ہو گئے اور گل رعنا نے دروازہ کھولا۔ سامنے گڈو کھڑا تھا۔ گل رعنا نے اس سے آنے کا سبب پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ کار کی چابی لینے آیا ہے۔ گل رعنا نے پھر دروازہ اندر سے بند کر لیا اور چاند سے پوچھا۔ کار کی چابی کہاں ہے؟ چاند نے اشارے سے بتا دیا کہ چابی کہاں ہے۔ گل رعنا چابی گڈو کو دے آئی اور دروازہ پھر بند کر لیا اور سب پھر لوٹ مار میں مصروف ہو گئے۔ چاروں الماریوں سے انہیں کافی مال مل گیا تھا۔ اس لئے انہوں نے پانچویں الماری توڑنے کی ضرورت نہیں سمجھی اور ملے مال سے ہی اطمینان کر لیا۔

رحمت اللہ ڈوگر اور ان کے نوکروں کو زندہ چھوڑ دینے کا مطلب تھا اپنے لئے پھانسی کا پھندا تیار کرنا۔ اس لئے رحمان، حمزہ اور احمد بٹ نے باری باری سے گلا دبا کر اور کاٹ کر ان چاروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس کے بعد کوٹھی سے نکل بھاگے تھے۔ لاہور سے فرار ہو کر راہوالی چلے گئے۔ وہاں پر وہ علی پارک ہوٹل میں رکے۔

دوسرے دن ان پانچوں نے علی سرکا رخ کیا۔ وہاں پر وہ نیلم پیلس ہوٹل میں ٹھہرے۔ اس دوران وہ لاہور کے اپنے ذرائع سے حادثہ کے بارے میں معلومات لے رہے تھے۔ تیسرے دن جب انہیں پتہ چلا کہ پولیس اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مار رہی ہے تب وہ پانچوں لاہور لوٹ آئے تھے اور لاہور لوٹنے کے کچھ گھنٹے بعد ہی گل رعنا پکڑی گئی اور پھر رحمان، زاہد، حمزہ اور احمد بٹ بھی پولیس کی گرفت میں آ گئے۔

ملزموں کی نشاندہی پر پولیس نے لوٹ کا مال برآمد کر لیا۔ ملزموں سے سونے چاندی، ہیرے کے زیورات و کئی لاکھ روپے نقد برآمد ہوئے۔ کافی نقدی ملزمان خرچ کر چکے تھے۔ واردات میں استعمال ہونے والا چاقو اور کھلونا پستول بھی برآمد کر لی گئی۔

23 اگست کو پولیس نے پانچوں ملزموں کو عدالت میں پیش کیا جہاں سے انہیں جیل بھیج دیا گیا۔

□

مریض دوائی منگوانے کے لئے اپنا حوالہ نمبر ضرور لکھا کریں
رپورٹس اور خطوط پر اپنا موبائل نمبر لازماً لکھیں

دستِ شفاء

نوجوانوں کے ''پوشیدہ'' مسائل لاعلاج نہیں

ڈاکٹر رانا محمد اقبال (گولڈ میڈلسٹ)
0321-7612717
ڈی۔ایچ۔ایم ایس (DH.Ms)
ممبر پیرامیڈیکس ایسوسی ایشن پنجاب
ممبر پنجاب ہومیو پیتھک ایسوسی ایشن
شعبۂ طب ونفسیات

یہ آج سے تقریباً 4 سال قبل کی بات ہے جب میں نے ماہنامہ ''حکایت'' کے شعبہ طب و نفسیات سے ناطہ جوڑا۔ اس سے قبل ڈاکٹر صہیب بٹ صاحب تھے جو کہ اکثر عموی امراض کے کیس کرتے تھے مگر یہ اتفاق کی بات ہے کہ میں جب ادھر آیا تو میرے حصے میں تقریباً تمام کے تمام کیس مردانہ (Male) امراض کے بارے میں تھے۔ چنانچہ میں نے نہ صرف اس موضوع پر بہت سی کتب پڑھیں بلکہ بہت تحقیق اور تجزیے کئے اور دیکھا کہ اکثر کتب خصوصاً دیسی اور ہومیو پیتھک میں 80% نقالی اور 20% Exagerations کے سوا کچھ نہیں اور ''شفاء من جانب اللہ'' 100% کے فارمولے پر عمل ہو رہا ہے گویا معالج کا کوئی کردار نہیں یعنی مریض کو ایک ہی قسم کی رٹا مار کہ کتب پڑھ کر دوائی دے دیں اور پھر دعا ہی کرتے رہیں کہ یا مولا ہماری عزت اور شفاء صرف تیرے ہی ہاتھ میں ہے۔ ایک قباحت اور بھی ہے کہ ان لوگوں نے ایسے مسائل پر ''پوشیدہ'' کا ٹھپہ لگا رکھا ہے۔ چونکہ میں بھی بڑے سالوں سے ایسے ہی حالات کو دیکھتا رہا تھا اور محسوس کیا کہ مریضوں کو اس طریقہ کار کے تحت (بہت کچھ خرچ کرنے کے باوجود) صرف مایوسی کے سوا کچھ نہیں مل رہا تو میں نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ موجودہ کتب اور دیگر معلومات و مواد مریضوں کے کسی کام کا نہیں اور اس کے لئے ایک نئے طریقہ کار کی ضرورت ہے۔

چنانچہ میں نے اپنے اصول اور طریقے وضع کئے اور ان کے مطابق ادویات کی سیٹنگ (Setting) کی اور مریضوں کو ڈیل کرنا شروع کیا تو بہت ہی اچھے نتائج

آرہے تھے اور جن کیسوں میں مریضوں اور معالجوں دونوں کو مایوسی ملتی تھی بہت اچھے ہونے لگے۔ مگر میں کچھ وجوہات (خصوصاً Secrecy) کی بناء پر یہ کیس کسی کو نہ بتاتا تھا نہ شائع کرسکتا تھا۔ تاہم اب میں سوچتا ہوں کہ مریضوں کی بھلائی کے لئے ایک دو کیس دے ہی دوں۔ تاہم مریض کی شناخت گمنام رکھوں گا۔

پہلا اس سلسلے کا کیس پاکستان کے ایک نہایت ہی دور دراز علاقے ڈیرہ غازی خان کا تھا۔ تقریباً 3 سال قبل فون پر کسی نوجوان نے ٹائم لیا اور مجھے دفتر ''حکایت'' میں ملا۔ عمر تقریباً 25، 26 سال، لمبا قد، گورا رنگ اور نہایت خوش اخلاق۔ اس نے خصوصی طور پر کہا کہ چونکہ اس کا تعلق ایک نہایت اونچے اور معزز گھرانے سے ہے اس لئے اس کی شناخت اور معلومات ہر طرح صیغہ راز میں رکھی جائیں گی۔ وہ قدرے گھبرایا ہوا بھی تھا۔ تاہم میں نے اس کی ہر طرح تسلی کی یہاں تک کہ بعد میں اس کا جو بھی ریکارڈ تھا وہ بھی ختم کر دیا کیونکہ اگر معالج پر کسی کو اعتماد ہی نہ ہو تو علاج کیسے ہوسکتا ہے۔ میں نے پوچھا کہ اب وہ اپنا کیس بتائے۔ اس نے نہایت رنجیدہ لہجے میں بتایا کہ وہ کافی عرصہ سے کچھ ایسے کاموں میں مشغول رہا ہے جن کو غیر پسندیدہ ہی کہا جاسکتا ہے۔ میں نے کہا کہ آپ بے فکر ہو کر بتائیں میں آپ کے لئے جو بھی اچھا ہو سکتا ہے کروں گا۔ اس نے کہا کہ میں تفصیل کیا بتاؤں ہر طرح سے جنسی بے راہ روی کا شکار رہا ہوں۔ بس یہ سمجھ لیں کہ کوئی ایسا ویسا کام میں نے نہیں چھوڑا مگر اب مجھے احساس ہوا ہے کہ یہ سب غیر مناسب اور تباہ کن ہے۔ میں کسی ایرے غیرے ڈاکٹر و حکیم کے پاس نہیں گیا اور نہ ہی جاسکتا ہوں کیونکہ ان لوگوں پر مجھے اعتبار ہی نہیں۔

اس نے بتایا کہ اس کا جسم کھوکھلا ہو چکا ہے اور دل مردہ، ذہن ہر وقت غلیظ خیالات سے بھرا رہتا ہے، کچھ کرنے کو جی نہیں چاہتا، شادی کے نام سے خوف آتا ہے، ذرا سی بات پر دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے، شرم اور جھجک اتنی ہے کہ کسی سے آنکھ ملا کر بات نہیں کرسکتا۔ بعض اوقات خودکشی کرنے کو دل چاہتا ہے لیکن بزدل اتنا ہوں کہ یہ بھی کرنے کی ہمت نہیں۔ ہر وقت اپنے آپ کو لعنت ملامت کرتا رہتا ہوں اور عہد کرتا ہوں کہ تمام بُری عادات چھوڑ کر صاف ستھری زندگی گزاروں گا۔

''آپ کو خدا کا واسطہ ہے ڈاکٹر صاحب!'' اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ ''مجھے گناہوں کی اس دلدل سے نکال لیں۔ میرے باپ کی معاشرے میں بڑی عزت اور اثر و رسوخ ہے اور ان کو مجھ سے بڑی امیدیں ہیں''۔

میں نے ساری معلومات لیں اور مجھے یہ دیکھ کر پریشانی ہوئی (اگرچہ ان علاقوں میں یہ کوئی عجیب بات نہیں) کہ وہ ایڈکشن کا بھی شکار ہے اور میں یہاں یہ بات بھی واضح کر دوں کہ میڈیسن ایڈکشن کے شکار کا علاج کرنا از حد مشکل ہوتا ہے۔ بہرحال میں نے اب اس کا علاج تو کرنا ہی تھا۔ میں نے کہا کہ آپ میرے چھوٹے بھائیوں کی طرح ہو اور اس مسئلے کے علاج کے لئے آپ کو دو وعدے کرنا ہوں گے۔ اوّل یہ کہ اس کام کو دل سے بُرا سمجھو گے تو چھوڑ سکو گے اور دوم یہ کہ آئندہ اس گندے ماحول سے ہر صورت دور رہنا ہے ورنہ میرے پاس کوئی علاج نہیں کیونکہ میں صرف پیسے لینے کے لئے نہیں بیٹھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ اس کام سے تنگ آچکا ہے اور ہر صورت چھوڑنا چاہتا ہے۔ میں نے مزید سمجھایا کہ اس کام میں رقم، صحت اور عزت ہر چیز کا نقصان ہی نقصان ہے اور فائدہ کچھ بھی نہیں، تب اس نے پکا وعدہ کیا۔

میں نے اس کو ایک ماہ کی ادویات تجویز کر کے دیں اور ساتھ کچھ ہدایات لکھ کر دیں۔ ایک ماہ کے بعد پھر اس کا فون آیا۔ دوبارہ اس سے دفتر میں ملاقات ہوئی۔

میں خود اس کی صحت یابی دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ بھی بہت خوش تھا اور کہا کہ اب وہ بے معنی اور بُری عادات اس کو زیادہ تنگ نہیں کرتیں۔ میں نے ایک ماہ کی مزید ادویات تجویز کر دیں۔ اب وہ آیا تو %100 ایک بدلا ہوا انسان تھا اور خوشی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ مزید دو ماہ کی ادویات دی گئیں اور سارا کیس کلیئر ہو گیا اور آج وہ نوجوان اپنے خاندان کے ساتھ ایک خوشگوار زندگی بسر کر رہا ہے۔

کیس نمبر 2:۔ یہ عجیب وغریب کیس پاکستان کے ایک مشہور شہر سے تعلق رکھتا ہے۔ اس نوجوان کی عمر 26 سال ہے اور اس نے اپنی زندگی بڑی مشکلوں میں گزاری ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ ایک نہایت ہی غریب خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ ایک دن میرے کلینک میں آیا اور بڑی رازداری کی درخواست کی۔ میں نے اسے علیحدہ بٹھایا اور تفصیلاً بات کرنے کو کہا۔ اس نے بتایا کہ بوجہ گمراہی اس کی دوستی کچھ غلط قسم کے لوگوں سے ہو گئی اور اب وہ ان لمحات کو یاد کر کے پچھتاتا ہے کہ کاش وہ ایسے کاموں اور لوگوں سے دور ہی رہتا مگر اب پریشانیاں اور بدنامیاں اس کا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ بُرے لوگ اس کا تعارف بن چکے ہیں اور بُری عادتیں اس کا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ راتوں کو فحش خوابوں کے ساتھ مادہ تولید کا اخراج ہوتا ہے اور دن میں بھی بُرے خیالات آتے رہتے ہیں (یہ چونکہ میڈیکل ڈائجسٹ نہیں اور ایک فیملی میگزین ہے جو کہ گھروں میں پڑھا جاتا ہے اس لئے بہت سے سوال جواب اور تفصیلات نہیں دی جا سکتیں، معذرت کے ساتھ)۔

ایک نہایت ہی خاص بات جو قابل ذکر ہے وہ یہ تھی کہ وہ اپنی بُری عادات کا اس قدر عادی ہو چکا ہے کہ اب اس کے بغیر کسی پل قرار نہیں آتا، دوسری بات یہ کہ جونہی اس کے جسم کو کوئی چھوتا ہے تو وہ اپنے کنٹرول سے باہر ہو جاتا ہے اور پھر یہ فعل اس سے بلا سوچے سمجھے سرزد ہو جاتا ہے جبکہ بعد میں وہ بے حد شرمندہ، مغموم اور اداس ہو جاتا ہے اور کئی دن غمگین رہتا ہے اور اسی وجہ سے اس کی صحت دن بدن ختم ہو رہی تھی۔

میں نے اس کو بہت تسلی دی اور دو روز کے بعد آنے کا کہا تاکہ اس کا کیس اچھی طرح سٹڈی کر سکوں۔ دو روز کے بعد وہ پھر آیا اور میں نے کیس کا بہت تسلی کے ساتھ جائزہ لے لیا تھا کیونکہ ایسے کیس شاذ و نادر ہی رپورٹ ہوتے ہیں۔ تاہم میں نے بڑی احتیاط کے ساتھ 4 ادویات تجویز کیں اور 15 دن کے لئے دیں۔ 15 دنوں میں اس کی رات کی تکالیف میں کافی بہتری آئی اور ذہن بھی کنٹرول میں آنے لگا۔ میں نے اُسے کہا کہ خود کو زیادہ سے زیادہ معروف رکھے اور بُری صحبت سے ہر ممکن حد تک دور رہے ورنہ اس کی میں کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ نیز گرم تاثیر والی غذائیں بھی استعمال نہ کرے۔ سموسے، پکوڑے اور سوڈا واٹر بالکل بند کر دے۔ مجھے خوشی ہے کہ اس نے مکمل طور پر پرہیز کیا۔ اس کے بعد دوسرے امراض کے لئے ادویات دی گئیں جن سے اس پر خاصا اثر ہوا اور اس کی صحت نمایاں طور پر بہتر ہونے لگی۔ اس دوران اس کے گزشتہ وسابقہ دوست بھی رابطہ کرنے کی کوشش کرتے رہے کیونکہ وہ اپنا شکار چھوڑنے کو تیار نہیں تھے مگر خدا کے فضل وکرم اور میری طرف سے ہر قسم کی مدد اور حوصلہ دینے سے وہ ان نامعقول لوگوں سے چھٹکارا پانے میں بھی کامیاب رہا۔

جو ادویات اس سلسلے میں دی گئیں وہ میں نے خود تیار کی تھیں اور کیس کی مناسبت سے میں نے اس کورس کا نام Pak-I اور Pak-II رکھا ہے۔ جن لوگوں کو ضرورت ہو ادارہ ہذا سے طلب کر سکتے ہیں۔ ساتھ احتیاط نامہ بھی دیا جاتا ہے۔

بعض لوگ مجھ سے گلہ کرتے ہیں کہ میں کئی کیسوں

میں ادویات نہیں لکھتا۔ تو اس بارے میں عرض یہ ہے کہ اول تو ہر کیس ایک جیسا نہیں ہوتا لہٰذا یہ لازمی نہیں کہ ایک کیس میں تجویز کردہ ادویات دوسرے میں بھی 100% سیٹ ہو جائیں۔ یہ بات ہر عقلمند معالج جانتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ میڈیکل ڈائجسٹ نہیں۔ تیسری اور آخری بات یہ ہے کہ میں نے بارہا اپنے کیسوں میں لکھا ہے کہ معالجین مجھ سے ادویات اور کیسوں کے بارے میں ڈسکس کر سکتے ہیں مگر وہ نہیں کرنا چاہتے تو ان کی مرضی۔ دراصل وہ پکی پکائی کھانا چاہتے ہیں اور ایسا ہر جگہ نہیں ہوتا۔ ان ہومیوپیتھکوں سے تو وہ ایلوپیتھک بہتر ہیں جو آپس میں بیٹھ کر کیس ڈسکس کرتے ہیں اور اس طرح ان کے علم میں اضافہ ہوتا ہے مگر پتا نہیں ان کو کیا ہے کہ مجھ سے وہی سلوک کرتے ہیں جو حضرت علیؓ سے اس وقت کے لوگوں نے کیا۔

میں وہ واقعہ بھی بتا دیتا ہوں۔ لوگ ان سے عجیب و غریب سوال کرتے رہتے تھے جن کا وہ نہایت مدلل جواب دیتے تھے۔ ایک دن ان سے کسی نے سوال کیا یا حضرت کون سے جانور انڈے دیتے ہیں اور کون سے بچے۔ انہوں نے فرمایا "جن کے کان باہر ہیں وہ بچے دیتے ہیں اور جن کے اندر ہیں وہ انڈے دیتے ہیں"۔ بعد میں کسی انگریز عالم نے جب یہ جواب سنا تو کہا کہ افسوس ان لوگوں پر جو ان سے ایسے سوال کرتے رہے اور وقت ضائع کرتے رہے۔ میں اس وقت ہوتا تو ان سے آسمانوں اور زمین کے پوشیدہ راز معلوم کر لیتا۔

نوٹ:۔ اگر میں کیسوں میں ادویات لکھوں گا تو یہی لوگ مجھے ایک نئی بحث میں الجھا کر میرا وقت ضائع کرتے رہیں گے اور میں مزید تحقیق نہیں کر سکوں گا۔ اب بھی میں وہ کیس کر رہا ہوں جہاں دیگر معالج ہاتھ کھڑے کرتے ہیں۔

***

سالانہ چندہ

رجسٹرڈ ائرمیل

پاکستان 800 روپے

1 — 7000 روپے

سعودی عرب، کویت، اُردن، ایران، سری لنکا، ابوظہبی، بحرین، دوبئ، مسقط، قطر، شارجہ، بھارت، سوڈان، یوگنڈا، کینیا، نائیجیریا اور دیگر افریقی ممالک، مشرقی اور مغربی جرمنی، ڈنمارک، انگلینڈ، ناروے، سویڈن، فرانس، ملائشیا، سوئٹزرلنڈ، سنگاپور، ہانگ کانگ، آسٹریا، برونائی

2 — 7000 روپے

آسٹریلیا، کینیڈا، فجی، نیوزی لینڈ، بہاماز، وینز ویلا، یونان، امریکہ، نورو، برازیل، چلی، کولمبیا، کیوبا، ارجنٹائن، جمیکا، میکسیکو، گرینیڈا

- غیر ممالک سے رقوم بھجوانے کے لئے "وقاص شاہد" کے نام کا ڈرافٹ بنوائیں۔
- پاکستان کے علاوہ دوسرے ممالک وی پی نہیں جاتی، رقم پہلے بھجوانی ضروری ہے۔
- کتابوں پر ڈاک خرچ خریدار حضرات کے ذمہ ہوگا۔
- خط و کتابت اور بدلِ اشتراک روانہ کرتے وقت خریداری حوالہ نمبر لکھنا ضروری ہے۔

نوٹ تبدیلیٔ پتہ کی اطلاع مہینے کی پندرہ تاریخ سے پہلے دیجئے۔

26- پٹیالہ گراؤنڈ، لنک میکلوڈ روڈ، لاہور - فون: 042-37356541

چشم دید

اردو کے منفرد اسلوب کے مالک خواجہ حسن نظامی کی یادداشتوں میں سے ایک مسیحا نفس حکیم اور ایک روشن طبع طوائف کا قصہ

☆انتخاب: عارف محمود

نابینا حکیم

حکیم حافظ عبدالوہاب انصاری لقمان الملک غازی پور یوپی کے رہنے والے تھے۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم کے بڑے بھائی تھے۔ جس طرح ڈاکٹری میں ڈاکٹر انصاری تمام اقوام ہند میں سب سے بڑے ڈاکٹر مانے جاتے تھے، اسی طرح حکیم نابینا یونانی طب میں سب سے بڑے نباض تسلیم کیے جاتے تھے۔ ان کی نباضی کے کمالات حیرت میں ڈال دیتے ہیں جس کا خود مجھے کئی بار تجربہ ہوا ہے۔ ایک مریض کو میں اُن کے پاس لے گیا۔ نبض دیکھنے کے بعد کہا۔ چالیس سال پہلے تم کو فلاں بیماری ہوئی اور اس بیماری کی وجہ سے اب تمہارے چہرے پر فلاں فلاں جگہ سیاہ دھبے ہو گئے ہوں گے۔ چونکہ حکیم صاحب نابینا تھے اور میں نے یا کسی اور نے بیمار کے چہرے کا ذکر بھی نہیں کیا تھا، پھر بھی انہوں نے چہرے کی وہ کیفیت نبض دیکھ کر بیان کر دی جو حیران کرنے والی تھی۔

مہاراجا سر کشن پرشاد بہادر آں جہانی سابق وزیراعظم حیدرآباد دکن کہتے تھے۔ ”ایک دفعہ حیدرآباد میں حکیم صاحب کو میں نے بلایا کہ رانی بیمار ہیں، ان کو دیکھ لیجئے۔ جب حکیم صاحب میرے مکان میں آ کر بیٹھ گئے تو میں نے رانی کو اشارہ کیا کہ ذرا دور بیٹھ جاؤ اور مَیں خود اُس کرسی پر آ کر بیٹھ گیا جو رانی کے لئے حکیم صاحب کے سامنے بچھائی گئی تھی اور نبض دیکھنے کے لئے حکیم صاحب کے آگے ہاتھ بڑھایا۔ حکیم صاحب نے نبض دیکھ کر کہا۔ ”یہ نبض عورت کی نہیں معلوم ہوتی اور یہ نبض مَیں نے پہلے بھی کبھی دیکھی ہے۔ یہ نبض بالکل مہاراج کی سی معلوم ہوتی ہے“۔

مہاراج ہنسنے لگے اور کہا۔ "ہاں حکیم صاحب! میں آپ کی نباضی کی شہرت سنتا تھا اس لئے امتحان کے لئے یہ حرکت کی تھی۔ مجھے معاف کیجئے"۔

حکیم صاحب مرحوم میرے ہاں درگاہ میں ہر جمعرات کو آیا کرتے تھے اور صبح میرے مکان پر ناشتہ کر کے واپس جایا کرتے تھے۔ ایک دن میں نے اُن سے کہا۔ خواجہ بانو کچھ بیمار ہیں، ذرا اُن کی نبض دیکھ لیجئے۔ حکیم صاحب نے نبض دیکھی مگر کچھ بولے نہیں، نہ کوئی نسخہ لکھوایا، حالانکہ اُن کی عادت تھی کہ مریض کی نبض دیکھتے ہی مریض سے پوچھے بغیر خود اُس کا حال بتا دیا کرتے تھے اس لئے مجھے وہم ہوا کہ کوئی ایسی بیماری ہے جس کی نسبت کچھ کہنا اُن کو مناسب معلوم نہیں ہوا۔ گھر سے باہر چلے تو موٹر تک جاتے وقت بھی خاموش رہے۔ میری تشویش بہت بڑھ گئی، موٹر میں بیٹھ گئے تو میں نے چپکے سے پوچھا۔

"آپ نے مریضہ کی نسبت کوئی رائے نہیں دی، نہ کوئی دوا تجویز کی"۔

انہوں نے آہستہ سے جواب دیا۔ "ان کو آٹھ دن کا حمل ہے اور ڈھائی مہینے میں ساقط ہو جائے گا اور کوئی دوا کارگر نہیں ہو گی۔ اس لئے میں نے سکوت مناسب سمجھا، آپ فکر نہ کیجئے، خطرے کی کوئی بات نہیں ہے"۔

حکیم صاحب چلے گئے تو میں نے یادداشت کی کتاب میں لکھا کہ فلاں وقت فلاں تاریخ حکیم صاحب نے یہ رائے دی مگر مجھے اس کا یقین نہیں ہے کیونکہ خلاف عقل بات ہے۔ اگر ڈھائی مہینے کے بعد ویسا ہی ہوا جیسا حکیم صاحب نے کہا ہے تو میں اس کو حکیم صاحب کا کمال نہیں بلکہ کرامت خیال کروں گا۔

چنانچہ ٹھیک ڈھائی مہینے بعد اسقاط حمل ہوا اور مجھے ان کے کمالات کا جتنا یقین تھا وہ بہت زیادہ بڑھ گیا۔

مرحوم بچپن سے نابینا تھے اور اُن کی مادری تعلیم و تربیت ایسی اعلیٰ تھی کہ انہوں نے قرآن شریف بھی حفظ کیا اور حدیث و تفسیر اور فقہ کے تمام علوم میں بھی اعلیٰ کمال حاصل کیا اور طبی کمالات بھی ایسے حاصل کئے جس کی مثال نہ میں نے کسی تاریخ میں پڑھی نہ طبی تذکروں میں پڑھی۔ آخر عمر میں انہوں نے ایک ضخیم کتاب بھی نباضی اور امراض خاص کے علاج کی نسبت زبانی بول کر لکھوائی تھی اور شائع کرائی تھی اور جس میں انہوں نے اپنی نباضی کے تمام خفیہ راز ظاہر کر دیئے تھے۔ یہ کتاب ان کے فرزندان نے شائع کی تھی اور ابھی حال میں جبکہ میں حیدر آباد میں مقیم تھا، میں نے یہ کتاب "کمالاتِ حکیم نابینا" کے نام سے اپنے دیباچے اور نئے ٹائٹل کے ساتھ شائع کی تھی۔

اس مثال کو درج کرتے وقت میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ حکیم نابینا یونانی طب کے ایک ایسے جوہر تھے جس کی نظیر کل ایشیا اور یورپ اور افریقہ اور امریکہ میں کہیں بھی نہیں ملے گی اور یہ سب خوبیاں مادری تربیت کی تھیں۔

شہزادی طوائف

سنہ یاد نہیں ہے مگر جس سال بنارس میں کانگریس کا جلسہ ہوا تھا اور اس کے بعد علی گڑھ ایجوکیشنل کانفرنس کا جلسہ علی گڑھ میں ہوا تھا، اُس سال کا ذکر ہے کہ علی گڑھ کانفرنس میں تین مسلمانوں سے میری ملاقات ہوئی جن میں ایک نامور اسلامی خدمت کرنے والے وکیل تھے، دوسرے ایک نامور اردو رسالے کے ایڈیٹر تھے اور تیسرے ایک ریاست کے وزیر تھے۔ انہوں نے مجھ کو بنارس کی ایک بازاری عورت شہزادی کا قصہ سنایا جس پر وہ خود بھی حیرت زدہ تھے۔ یہ قصہ سن کر مجھ کو بھی بہت حیرت ہوئی۔ انہوں نے کہا۔ جس دن کانگریس کے اجلاس ختم ہوئے، ہم تینوں نے فیصلہ کیا کہ علی گڑھ صبح کی ریل میں جائیں گے۔ آج بنارس کی کسی گانے والی کا گانا

سننا چاہیے، چنانچہ ہم تینوں دال منڈی میں بنارس کی ایک مشہور گانے والی طوائف شہزادی کے ہاں گئے اور دو بجے رات تک گانا سنتے رہے۔ دو بجے اس عورت نے کہا۔ مجھے اجازت دیجئے کہ میں ضروریات ذاتی سے فارغ ہو جاؤں، تین بجے تک حاضر ہو جاؤں گی اور حسب معاہدہ صبح پانچ بجے تک گانا گاؤں گی۔

ہم نے بخوشی اجازت دی، وہ بالاخانے پر چلی گئی۔ ہم تینوں پان کھاتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ کچھ دیر کے بعد ہمارے رفیق وزیر صاحب بھی باہر چلے گئے۔ ہم نے خیال کیا، پیشاب کرنے گئے ہوں گے۔ یکا یک وہ اندر آئے مگر اس قدر گھبرائے ہوئے اور پریشان کہ ہم دونوں اُن کو دیکھ کر گھبرا گئے۔ وجہ پوچھی تو وہ خاموش رہے، جواب نہ دیا۔ یہاں تک کہ وہ عورت بالاخانے سے نیچے آئی اور گانا شروع ہوا۔ وزیر صاحب کی وہ شوخیاں غائب تھیں جو وہ اوّل شب سے دو بجے تک گانے کے وقت کرتے رہے تھے یعنی عورت سے مذاق کرتے جاتے تھے۔

پانچ بجے گانا ختم ہوا اور ہم سب سٹیشن پر آئے اور علی گڑھ کی ریل میں سوار ہوئے مگر وزیر صاحب اب تک خاموش تھے، کسی بات کا جواب نہ دیتے تھے اور ہم کو ان کے سکوت سے بڑی حیرت تھی۔ جب ریل بنارس سے ایک دو سٹیشن آگے بڑھ آئی تو وزیر صاحب نے قصہ سنایا کہ میں طوائف کے جانے کے بعد چپکے سے بالاخانے پر اس لئے گیا تھا کہ وہاں دیکھوں کہ وہ رات کے دو بجے ایک گھنٹے کے لئے کس کام سے گئی ہے۔ میں نے دیکھا، کمرے کے اندر اگربتیاں جل رہی ہیں، جانماز بچھی ہوئی ہے، شمع روشن ہے اور وہ عورت تسبیح ہاتھ میں لئے ہوئے کچھ پڑھ رہی ہے۔ میں بغیر جھجک کے اس کمرے کے اندر داخل ہوا تو اس عورت نے نہایت غصے سے بہت زور کے ساتھ "ہوں" کی جس سے میں لرز گیا۔ اس کے

غزل

شمع جلی پروانے جاگے
نقش اُبھرے افسانے جاگے
غم جاگا غم خانے جاگے
خوابوں کے ویرانے جاگے
سُن کے بری رُودادِ محبت
اپنے اور بیگانے جاگے
بستی بستی شور مچا ہے
شاید پھر دیوانے جاگے
ساغر چھلکے کرنیں پھوٹیں
وہ دیکھو! مے خانے جاگے

☆......ساغر صدیقی

بعد اُس عورت نے میرا نام لے کر کہا۔ ارے فلاں تجھ کو شرم نہیں آتی کہ بیوی جالندھر میں پڑی ہے، جا دور ہو، خبردار اپنے ساتھیوں سے کچھ نہ کہیو جب تک کہ تیری ریل بنارس سے دور نہ چلی جائے۔ اس واسطے میں نے آپ کے سوالوں کا جواب نہ دیا، یہاں تک کہ ریل بنارس سے آگے آ گئی۔

یہ قصہ سن کر مجھے شہزادی کے دیکھنے کا شوق پیدا ہوا کہ اس زمانے میں بڑے بڑے نامور درویش بھی اتنا مکاشفہ نہیں رکھتے، پھر ایک بازاری عورت کو یہ مکاشفہ کیوں کر ہونے لگا۔

الغرض علی گڑھ کانفرنس ختم ہوتے ہی شہزادی کا پتہ دریافت کر کے میں بنارس گیا اور سرائے میں ٹھہرا اور مغرب کے بعد دال منڈی میں گیا۔ ایک مسلمان دُکان دار سے شہزادی طوائف کا کوٹھا پوچھا۔ دُکان دار نے مجھے گھور کر دیکھا اور کہا۔ کیا آپ وہاں جائیں گے؟ میں نے کہا۔ ہاں۔ یہ جواب سن کر دکاندار نے کہا۔ لعنت ہو تمہارے ان لمبے بالوں پر اور اس لمبے کرتے پر، تم کو شرم

نہیں آتی۔ یہ لباس، یہ صورت اور یہ کرتوت۔ جاؤ جاؤ، منہ کالا کرو، یہی زینہ اُس کے کوٹھے کا ہے۔

مجھ پر دکاندار کی باتوں نے بہت زیادہ اثر کیا مگر ارادہ کر چکا تھا اور تحقیقات کا شوق غالب تھا، کوٹھے پر چڑھ گیا۔ وہاں دو ہندو لڑکے بیٹھے تھے اور وہ عورت نہ تھی۔ اُن لڑکوں نے مجھ کو دیکھ کر مذاق کرنا شروع کیا۔ ایک نے کہا آیئے، شاہ جی۔ دوسرے نے کہا، یہ شاہ جی تعویذ دینے آئے ہوں گے۔ میں نے کچھ توجہ نہ کی اور وہیں ایک جگہ بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد زرد ریشمی لمبا کرتہ پہنے ایک گوری سی جوان عورت سامنے آئی اور اس نے غور سے مجھ کو دیکھا اور کہا خواجہ صاحب آپ نے کیوں تکلیف کی۔ اس کے بعد وزیر صاحب کا نام لے کر کہا۔ "فلاں نے آپ کو بہکا دیا، میں گنہگار، میرا کام سیاہ کار، مجھ میں کاشفہ کہاں سے آسکتا ہے"۔

اس کے بعد اس عورت نے ان ہندو لڑکوں سے کہا۔ جاؤ آج میں گانا نہیں گاؤں گی، کل آنا۔ وہ دونوں مجھے بُری نظروں سے دیکھتے ہوئے چلے گئے تو میں نے عورت سے کہا۔ "مجھے کسی نے بہکایا یا سیدھا راستہ بتایا، اس پر غور کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں تو یہ معلوم کرنے آیا ہوں کہ جب خدا نے تم کو یہ نعمت دی ہے تو پھر یہ بازاری تماشا کس غرض سے ہے؟"

عورت رونے لگی اور کہا۔ "آپ سچ کہتے ہیں۔ میں یقیناً اہل مکاشفہ کی پاک بازی کے لئے ایک داغ اور دھبہ ہوں"۔

کچھ دیر سکوت طاری رہا، آخر میں نے کہا۔ "مجھے بھی واپس جانا ہے اس لئے میرے سوال کا جواب جلدی دے دو۔ عورت نے کہا۔ "جی ہاں آپ نے سرائے کی بھٹیاری سے کھچڑی پکوائی ہے۔ اس کے ٹھنڈے ہو جانے کے خیال سے جانے کی جلدی ہے"۔

میں نے کہا۔ "تم کب تک اپنے مکاشفات کا ڈنکا بجاتی رہو گی، مجھے فقط اتنی بات پوچھنی ہے کہ تم اس پیشے کے پردے میں کیوں پوشیدہ ہوئی ہو؟"

عورت نے طعن آمیز انداز سے جواب دیا۔ "میرے حضرت قل ہو اللہ شاہ صاحب فرماتے تھے، ایک دن ایک بزرگ نے دیکھا، پانچ آدمی ایک جگہ بیٹھے ہوئے ہیں اور اُن میں سے چار بھنگ پی رہے ہیں مگر پانچواں بھنگ نوشی میں شریک نہیں ہے تاہم اُن کے پاس بیٹھا ہے اور آسمان سے نور اُس پانچویں آدمی پر نازل ہو رہا ہے۔ کچھ دیر بعد وہ پانچوں وہاں سے روانہ ہوئے تو یہ بزرگ ان کے پیچھے پیچھے گئے اور پانچویں آدمی کا ہاتھ پکڑ کر ٹھہرایا اور کہا۔ مجھے آپ سے ایک بات پوچھنی ہے، وہ صاحب ٹھہر گئے مگر بھنگ پینے والے چاروں آدمی آگے بڑھ گئے۔ میں نے کہا، خدا نے آپ کو اتنا بڑا درجہ دیا ہے کہ آسمانی نور آپ پر برستا رہتا ہے پھر آپ ان نشے باز لوگوں میں کیوں بیٹھے تھے؟ یہ سن کر اُس پانچویں آدمی نے خفگی سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور کہا۔ میں اس لئے بیٹھا تھا تا کہ تو بُرے لوگوں کو بُرا نہ کہے کیونکہ خدا بُروں میں اچھوں کو بھی ملائے رکھتا ہے۔

اس کے بعد شہزادی نے کہا۔ "اور میرے حضرت یہ بھی فرماتے تھے کہ ہمارا سلسلۂ عزت مولانا فخر صاحب چشتی نظامی دہلوی سے ملتا ہے۔ حضرت مولانا فخر صاحب کی خدمت میں ایک دفعہ دہلی کا ایک آدمی آیا اور کہا۔ میں آپ کا مرید ہونا چاہتا ہوں مگر مجھے بھنگ پینے کی عادت ہے، اگر آپ بھنگ پینے سے نہ روکیں تو میں آپ کا مرید ہو جاؤں کیوں کہ میں اپنی عادت سے لاچار ہوں۔

حضرت نے فرمایا ہم کو تمہاری شرط قبول ہے، ہم تم کو بھنگ پینے سے منع نہیں کریں گے مگر ایک شرط ہماری بھی ہے کہ ہمارے سامنے بھنگ نہ پینا۔ اس نے جواب

دیا، تو بہ تو بہ میں آپ کے سامنے کبھی بھنگ نہیں پیوں گا۔
حضرت نے اس کو اُسی وقت مرید کرلیا اور وہ مرید ہونے کے بعد واپس چلا گیا۔ شام کو اُس کے بھنگ پینے والے یار جمع ہوئے اور اس نے کہا۔ لو بھئی آج ہم مرید ہو گئے اور پیر بھی ایسا ملا کہ جس نے ہماری یہ شرط مان لی کہ وہ ہم کو بھنگ پینے سے منع نہیں کریں گے۔

اس کے بعد اُس نے بھنگ تیار کی اور ایک ایک پیالہ سب یاروں کو بانٹ دیا۔ جوں ہی ان سب نے بھنگ کے پیالے اٹھائے کہ پینا شروع کریں، سامنے سے حضرت مولانا فخر صاحب آ گئے۔ پیر کو آتا دیکھ مرید نے بھنگ کا پیالہ پھینک دیا اور اس کے یاروں نے بھی پیالے پھینک دیئے۔ مولانا صاحب نے فرمایا، ہم تمہارے مکان کے سامنے سے جا رہے تھے، ایک شخص نے کہا۔ آج جو بھنگ پینے والا آپ کا مرید ہوا تھا۔ وہ اس مکان میں رہتا ہے اس لئے ہم تم سے ملنے آ گئے۔ پھر کچھ دیر حضرت مولانا وہاں بیٹھے رہے اور بھنگ پینے والوں کو بھنگ کی برائیاں سناتے رہے۔ جب بھنگ پینے کا وقت ختم ہو گیا تو مولانا صاحب بھی وہاں سے چلے آئے۔

دوسرے دن مرید نے یاروں سے کہا۔ کل تو نشہ پانی کا ناغہ ہو گیا، چلو آج ایک دوسرے مکان میں چلیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ پیر آج پھر یہاں آ جائیں۔ وہ سب ایک نئے مکان میں جا کر بیٹھے اور بھنگ تیار کی، یکا یک عین وقت پر مولانا صاحب پھر وہاں آ گئے اور فرمایا۔ ہم پہلے مکان پر گئے تو لوگوں نے بتایا کہ تم اس مکان میں آ گئے، اس لئے ہم یہاں بھی آ گئے۔

تیسرے دن مرید نے ایک اور مکان کا انتظام کیا اور یاروں سے کہہ دیا، گھر کے اُس پاس جو لوگ رہتے ہیں، اُن سے کہہ دو کہ اگر مولانا صاحب اِدھر آئیں تو اُن کو میرا پتہ نہ بتائیں۔ آخر آج بھی بھنگ تیار ہوئی اور پیالے ہاتھ میں لیتے ہی مولانا صاحب پھر وہاں آ گئے۔ مرید نے خفا ہو کر پیالہ پھینک دیا اور کہا۔ آپ یہاں بھی آ گئے، لیجئے میں بھنگ پینے سے توبہ کر لیتا ہوں۔ مولانا صاحب نے فرمایا۔ تم خدا کی یاد کا نشہ کرو، وہ تم کو دونوں جہان کی نعمت دے دے گا“۔

شہزادی نے یہ دونوں قصے سنا کر مجھ سے کہا۔ ”میری والدہ بھی حضرت کی مرید تھیں اور انہوں نے میری والدہ سے فرمایا تھا کہ اگر تم اپنی لڑکی کو پیشہ نہ کراؤ اور اس کا نکاح کر دو تو بہت اچھا ہو گا ورنہ کم سے کم ہماری یہ بات مانو کہ تمہاری لڑکی گانے بجانے کا پیشہ کرے۔ حرام کاری نہ کرے تا کہ ہم جو چیز اس کو دیں گے، وہ ملامت کی چادر میں چھپ جائے اور غافلوں کو جو بدکار عورتوں کے پاس آتے ہیں، حق کا راستہ یاد دلا دے اور اس کے بعد انہوں نے وہ دونوں واقعات سنائے جو ابھی میں نے آپ سے کہے، بس یہ وجہ ہے کہ میں اس پیشے میں ہوں کہ حرام کاری سے خدا بچاتا ہے اور گانے بجانے کے ذریعے روزی دیتا ہے اور پیر کی برکت سے جو نعمت حاصل ہوئی ہے اس کا اظہار اس لئے کرتی ہوں کہ پیر نے یہ بھی فرمایا تھا کہ خدا نے قرآن شریف میں فرمایا ہے کہ اپنے رب کی نعمت کا دوسروں کے سامنے چرچا کیا کرو۔ اس لئے جو لوگ میرے ہاں گانا سننے آتے ہیں اُن کے سامنے میں اپنے کشف کی نعمت ظاہر کر دیتی ہوں تا کہ وہ سمجھیں کہ بُرے اور بدکار لوگوں کو نفرت اور حقارت سے نہ دیکھا جائے اور لوگ سمجھیں کہ بدکار لوگوں میں بھی خدا کے نیک بندے ہوتے ہیں۔

شہزادی طوائف کا یہ قصہ میں نے اس لئے لکھا ہے کہ اس میں مادری تربیت کا کچھ تھوڑا بہت دخل تھا اور یہ ظاہر کرنا بھی مقصود تھا کہ قدامت کے طریق تربیت کے مختلف پہلو کتاب پڑھنے والوں کے سامنے آ جائیں۔

❀❀❀

افسانہ

''ابو! تمہارے کندھے تو پہلے ہی جنازے کے بوجھ سے اتنا جھک گئے ہیں، باقی تین جنازوں کو رخصت کرنے کا حوصلہ کہاں سے لاؤ گے؟''

جنازے کا مہمان

☆ شہاب جمال

باورچی کے کرخت حکم پر جب اُس نے دیگ کے نیچے جلتی آگ میں ایک اور لکڑی جھونکی تو اسے محسوس ہوا جیسے اس نے اپنے جسم کی ایک ہڈی آگ میں جھونک دی ہو، جس کا شعلہ اُس کے پاؤں کے ناخن سے لے کر سر کے بالوں تک لپک گیا ہو۔ آنچ کی اس تیزی پر اُسے یہ جان کر سکون سا محسوس ہوا کہ پچھلے دو روز سے بھڑکتا ہوا اُس کے پیٹ کا جہنم سرد پڑ گیا ہے۔ دو تین برس سے کچھ بے روزگار اور کچھ عادی کاہلوں کی قطار میں لگ کر وہ مختلف تقریبات، نذر نیاز اور مرے ہوؤں کے چہلم کے موقع پر جا کر خواہ مخواہ کوئی نہ کوئی کام سنبھال لیتا اور کچھ جھوٹے اور کچھ سچے کھانے کے آمیزے سے اس کے دو ایک روز اطمینان سے گزرنے کے ساتھ زبان کا ذائقہ بھی بدل جاتا۔

وہ صرف مڈل تک پڑھا تھا، مڈل پاس نہیں کیا تھا۔ وہ لوگوں کے گھروں کے آگے پکتی دیگوں کے اردگرد منڈلاتے جائز و ناجائز فقیروں کے جھرمٹ میں اپنے آپ کو ہمیشہ اندھوں میں کانا سمجھا کرتا اور کچھ اس مہارت سے باورچی کی نبض پکڑتا کہ وہ اعتماد کی لَے پر مست ہو جانے پر مجبور ہو جاتا، پھر باورچی مالکوں کی نظروں سے بچائے ہوئے گھی اور مصالحوں کی پوٹلی اُسے تھما کر اپنے اڈے پر پہنچا دینے کی فرمائش کرتا۔ اتنی ترقی اسے ایسے ہی نصیب نہیں ہو گئی تھی بلکہ اُس کی فطری ایمانداری نے

رنگ جمایا تھا۔ اسی لئے لوٹ کا مال صحیح سالم ملنے پر کئی خاندانی باورچیوں سے اس کی دوستی ہوگئی تھی جو اسے فقیروں کی بھیڑ میں اس طرح شامل کر دیتے تھے جس طرح پٹا ہوا لیڈر حزب مخالف کے جلسے میں ہنگامہ کرانے کے لئے، اپنے پیشہ ور کارکنوں کو عوام میں شامل کر دیتا ہے لیکن ایسا موقعہ کبھی کبھار ملتا تھا۔ اسی لئے آج وہ دو دن کے فاقے سے تھا۔

آٹھ دس سال کے عرصے میں اس نے سودا سلف اٹھانے سے لے کر اینٹ اور گارا تک ڈھویا تھا۔ جب تک کندھے نازک رہے وہ چھوٹے بڑے لفافے خریداروں کی کاروں تک پہنچاتا رہا اور جب کندھے بوجھ اٹھانے کی تربیت پا کر توانا ہو گئے تو وہ سیمنٹ اور ریت کی بوریوں کو کھنگالنے لگا۔ اب اس کے دل میں یہ حسرت اپنی جگہ قائم تھی کہ کوئی فلمی قسم کا بڑا مگر رحمدل سیٹھ ترس کھا کر اسے اپنے بنگلے پر لے جائے جس کی صرف ایک ہی بیٹی ہو اور وہ بیٹی بھی صرف اسی کا انتظار کر رہی، مگر دیگیں پکوانے والے سیٹھ فلمی سیٹھوں کی طرح شاید رحمدل نہیں تھے جبھی اس کے پیٹ کی دیگ دو روز سے خالی تھی۔

جب وہ اپنے گھر سے بھاگا تھا تو اس کے چھوٹے چھوٹے کندھے خود دوسروں کے کندھوں کے محتاج تھے کیونکہ اس کی اپنی ٹانگیں ابھی بہت چھوٹی تھیں لیکن اس کے ضمیر نے اسے گھر سے بھاگنے پر کبھی کچوکے نہیں لگائے تھے۔ پتہ نہیں ضمیر نے اسے کچل دیا تھا یا اس نے ضمیر کو مسل ڈالا تھا یا وہ اپنا ضمیر باپ کے گھر چھوڑ آیا تھا یا وہ ابھی تک یہی سمجھتا تھا کہ وہ گھر سے بھاگا نہیں، صرف اپنا ننھا وجود سمیٹ کر بغیر کسی کو نقصان پہنچائے گھر سے نکل آیا تھا۔ اس کا باپ بھی تھا اور ماں بھی۔ بیشک وہ سوتیلی ہی تھی لیکن اس نے کبھی سوتیلی ماں ایسا سلوک نہیں کیا تھا نہ ہی اس کا یہ قصور تھا کہ اس نے اس کی سوتیلی

بہن کو جنم دے کر اس تنے سر پر مسلط کر دیا تھا بلکہ لڑکی کی پیدائش کے بعد تو وہ اس کا اور بھی زیادہ خیال کرنے لگی تھی۔ لڑکا ہوتا تو سلوک شاید مختلف ہوتا، البتہ بیٹی کی پیدائش کے بعد باپ جیسے غیر جانبدار پارٹی بن کر رہ گیا۔

یہیں سے اُس کے ذہن میں خلا پیدا ہونا شروع ہوا جو اپنی اور سوتیلی بہن کی عمر کی نسبت سے وسیع ہوتا رہا۔ لگتا تھا اس کی شخصیت کی نازک کونپلیں خلا کی اس بنجر زمین پر ایک ایک کر کے مرجھا رہی ہیں۔ اس کی کوئی چیز اس کی اپنی نہیں رہی جس کی بنیاد پر وہ اپنی شخصیت کو قدآور بنا سکتا۔ بہت بڑے باپ کے مقابلے میں اس نے جن چھوٹی چھوٹی چیزوں میں پناہ لینا چاہی، اس کی یہ بہن انہی چھوٹے چھوٹے سہاروں کو نگلتی چلی گئی اور باپ انہیں چھوٹی چھوٹی باتیں سمجھ کر نظرانداز کرتا رہا۔

مہینوں بعد ایک ایک پیسہ جمع کر کے جب وہ ٹکٹوں والی ایک خوبصورت البم خرید کر لایا تو اس کی یہ بہن کسی چھاپہ مار کی مانند اس پر جھپٹ پڑی۔ ”تم نے میرے ابا کے پیسوں کی خریدی ہے“۔

اس نے اپنے چھوٹے سے ذہن کی بساط کے مطابق اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ اس نے اپنے پیسے جمع کر کے خریدی ہے، مگر بہن کے خیال میں یہ اُس کے ابا ہی کے پیسے تھے۔ جھگڑے نے طول کھینچا تو بہن نے کلائی پر کاٹ کھایا۔ بچی کا چھوٹا سا منہ بھائی کی شہ رگ تک نہیں پہنچ سکا تھا۔ اس نے بھائی کے پھول سے بدن میں یہ کہہ کر کانٹے ٹھونک دیئے کہ وہ گھر اُس کا نہیں ہے، صرف وہی اپنے باپ کی بیٹی ہے۔ وہ سر سے پاؤں تک جم گیا جیسے کلورین گزار کر اس کے پورے وجود کو منجمد کر دیا گیا ہو۔

”اتنی چھوٹی سی بات کا بتنگڑ بنانے کی کیا ضرورت ہے بیٹا!“ اس کے باپ نے اسے کہا تھا۔ ”نا سمجھی میں ایسا کہہ دیا ہے تو کیا ہوا۔ اس نے تمہیں گھر سے تو نہیں نکال

دیا"۔

اس نے باپ کے سامنے زخمی کلائی کرتے ہوئے جب سہمی ہوئی شکایت کی تو باپ نے اپنا پورا بوجھ اس کے چھوٹے سے بلبلاتے ذہن پر رکھ دیا تھا جسے وہ برداشت کرنے کے اہل نہ تھا۔ وہ تو مرہم لینے آیا تھا...... پیار اور شفقت کی مرہم...... ایک احتجاجی چیخ اس کے اندر ہی اندر گھٹ کر رہ گئی۔ تکلیف پہنچنے پر جانور بھی چیخ کر، غرا کر درد کی شدت کم کر دیتا ہے لیکن وہ حلق پھاڑ کر چیخ بھی نہ سکا۔

"یہ گھر میرا نہیں ہے، یہ گھر میرا نہیں ہے"۔ اس کے بدن کے کھوکھلے گنبد میں یہ الفاظ گونج بن کر بازگشت پیدا کرتے چلے گئے۔ تب اس نے اپنے آپ کو اس گھر سے سمیٹ لیا تھا۔

فٹ پاتھوں پر لوگوں کے جوتوں کی چھوڑی ہوئی گرد پر وہ سر رکھ کر سوتا رہا۔ گشتی پولیس کی گھرکیاں، گالیاں اور تھپڑ تک بھی "یہ گھر میرا نہیں ہے" کی گونج پر غالب نہ آسکے۔ وہ ہر قسم کی مصیبت جھیلتا رہا اس لئے کہ اس کا کوئی گھر نہیں تھا۔ لاشعور میں ابلتی ہوئی نفرت نے جہاں اسے ایک طرف قائم رکھا تھا وہیں دوسری طرف اسے کسی کے سامنے پھیلنے بھی نہیں دیا۔ اس نے مہینوں اس امید میں مانگ مانگ کر اخبار دیکھے کہ شاید اس کے باپ نے اس کی گمشدگی کا اشتہار دیا ہوگا مگر اشتہار تو کیا کسی جاننے والے کی زبان سے اپنی گمشدگی کے بارے میں ایک لفظ تک نہیں سنا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آرزوئیں مایوسی کی بھٹی میں پک کر جوان انتقام کا زہریلا خنجر بنتی رہیں۔ وہ اپنے باپ کے جیتے جی اپنی یتیم کی لاش گھسیٹتا رہا، دفن نہیں کر سکا۔

اس کا نازک ملیح چہرہ سخت اور کھردرا ہوتا گیا۔ اسے نہیں پتہ، نرم نرم مسیں کب بھیگیں۔ ان پر تو زمانے بھر کی گرد جم کر خشکی کی دبیز تہہ چڑھ گئی تھی۔ داڑھی کے بال ایسے نکلنے لگے جیسے خنجر کی نوک اس کے چہرے کو کھرچ کھرچ کر اندر کی سوئیاں باہر نکال رہی ہو یا بے شمار پھانسیں ہوں جو اندر ہی اندر گل کر خودبخود باہر آ گئی ہوں اور آج وہ انہی سوئیوں کی اوٹ میں چہرہ چھپائے اس دیگ کے نیچے لکڑیوں کے ساتھ ساتھ آگ میں اپنی ہڈیاں بھی جھونک رہا تھا جو کسی پھٹتے ہوئے بم کے دھماکے کی طرح اس کی بہن کی شادی کا اعلان کر رہی تھیں۔

خاندانی باورچی نے ہی اسے بلایا تھا کیونکہ اس کا ارادہ آج شاید لمبا ہاتھ مارنے کا تھا لیکن باورچی اس سے بے خبر تھا کہ آج اس کا یہ خفیہ مددگار اس سے بھی لمبا ہاتھ مارنے آیا ہے۔ جس نے کئی دفعہ چیتھڑوں جیسی قمیص کے کئی ٹانکے لگی جیب کو احتیاط سے تھپتھپا کر محسوس کیا تھا گویا اس میں سالوں کی نفرت کا خزانہ جمع ہو۔

"استاد جی! آج کوئی پیسے بننے کا آسرا نہیں ہو سکتا؟" اس نے پانی کا بڑا سا ڈول باورچی کو پکڑاتے ہوئے لجاجت سے کہا۔ "قسم ہے پیر بادشاہ کی، مہینوں سے کوئی فلم نہیں دیکھی"۔

"پہلے میرا کام کر دو جب تک تمہارے لئے بھی کچھ سوچتا ہوں"۔ پانی پڑنے کی وجہ سے دیگ کی شوں میں باورچی نے سرگوشی کی لیکن اس کے کھدبد کرتے ذہن نے اس بہلاوے سے پہلے ہی ترکیب سوچ لی۔

"بہتر ہے استاد...... مگر خیال ضرور رکھنا"۔ اس نے اپنی ترکیب پر پردہ ڈالنے کے لئے استاد کو بہلایا۔

اس نے پانی لانے کے بہانے اس گھر کے دو تین چکر لگائے جو اُس کا نہیں تھا۔ اُس نے چور نظروں سے اس کمرے میں دیکھا جہاں اس کی بہن نے کلائی پر کاٹ کھایا تھا۔ اُسے محسوس ہوا کپڑوں کے کئی سرخ سرخ جوڑوں کی شکل میں اب بھی اس کے خون کے قطرے وہیں جمے ہوئے ہیں جہاں وہ پہلے دن گرے تھے۔ کونے والے آخری کمرے میں اس کی ہم عمر سہیلیاں جمع

ہو کر اس کی بہن کو شاید دلہن بنا رہی تھیں۔ وہ ان سب کو پہچانتا تھا مگر اُسے اب کوئی نہیں پہچان سکتا تھا۔ اس کی پہچان برسوں گزرے اسی گھر میں مرگئی تھی جہاں آج وہ ایک فقیر کے روپ میں باورچی کے ساتھ کام کر رہا تھا۔

''ہوں!'' اس کے نتھنوں سے خود بخود نفرت سے جلتا بھپکا سا نکلا اور اس کے جسم پر گندی میلی چادر جو جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی تھی خوشی سے جیسے ہلکورا لے کر رہ گئی جسے اس نے کندھے پر سمیٹ لیا۔

''کون ہو تم؟ گھر کے اندر یہاں کیا کر رہے ہو؟''

اس کے باپ نے کرخت سی آواز میں اس سے پوچھا۔ لگتا تھا اس کا باپ منوں بوجھ تلے دبا اندر ہی اندر اسی کی طرح چیخ پڑا ہو۔

''جی باؤ جی...... وہ میں...... اپنے استاد کے کچھ برتن ڈھونڈ رہا ہوں''۔ وہ ایک دم ٹپٹا گیا۔ اس کی بھاری گھر دری آواز اور بالکل اجڈ لہجہ اس کے باپ کو بہت ناگوار گزرا۔ جب وہ اس گھر سے رخصت ہوا تھا تو اس کی آواز میں بچپن کی موسیقی تھی۔ وہ اپنے چہرے سے بھی باپ پر کوئی اچھا تاثر قائم نہ کر سکا۔ اس نے جی بھر کر بھرپور نگاہوں سے باپ کو دیکھنا چاہا لیکن لاشعوری طور پر سہم کر اس نے نگاہیں جھکا لیں بالکل اُس دن کی طرح جب اس نے باپ سے آخری شکایت کی تھی۔ خون جسم کے اندر بہہ رہا ہو یا جسم کے باہر کبھی نہیں چھپتا مگر اس کے اپنے ہی چہرے پر وقت نے شاید اتنا دبیز پردہ ڈال دیا تھا کہ پاس کھڑا باپ اپنے ہی خون کی باس محسوس نہ کر سکا۔

''جاؤ بھاگو! خبردار جو دوبارہ گھر کے اندر آئے...... تمہیں دکھائی نہیں دیتا گھر کے اندر عورتیں جمع ہیں''۔ اس کا باپ بڑی تلخی سے بولا۔

''جی باؤ صاب! غلطی ہوگئی''۔ اس نے ذرا سا ہکلا کر کہتے ہوئے باپ پر اچٹتی نگاہ ڈالی اور باہر کی جانب چل دیا۔

''اب جو برتن لینے آئے تھے لے جاؤ، پھر بغیر اجازت اندر نہیں آنا''۔ پہلے سے قدرے نرم لہجے میں باپ نے تنبیہ کی اور اس کی روح میں جیسے شہد سا گھل گیا۔

اس نے چاہا باپ ایک بار اُسے ڈانٹے، اس سے پوچھے کہ وہ بغیر بتائے کہاں چلا گیا تھا۔ آئندہ گیا تو اس کی ٹانگیں توڑ دے گا مگر جسم کا یہ زہر اس کے اپنے بدن کے پیالے ہی میں لہریں لیتا رہا۔ اس نے غسل خانے کے پاس پڑا پرانا سا پتیلا خواہ مخواہ ہی اٹھا لیا۔

صحن عبور کر کے ابھی وہ باہر کے دروازے تک پہنچا بھی نہیں تھا کہ دولہا کی سواری پہنچنے کا شور اٹھا اور دیکھتے ہی دیکھتے تمام لڑکیاں اور عورتیں اس طرح ہڑبڑا کر باہر بھاگیں گویا دولہا نہ آیا ہو زلزلہ آ گیا ہو۔ کمروں تک ایک دم سناٹا پھیل گیا۔ گھر کی ساری رونق کوڑے کرکٹ کی مانند باہر گلی میں پھیل گئی۔ وہ خود اس کمی کو پورا کرنے کے لئے پھر کمروں کی جانب گھوم پڑا۔ اس کا باپ اس شدید سناٹے سے شاید دہشت زدہ ہو کر بیٹی کے سنسان کمرے کی طرف چلا گیا۔ بیٹی بھی اس اچانک ویرانی اور آنے والے انجان لمحوں کے خوف سے گھبرا اٹھی تھی۔ اس نے نظر اٹھا کر دیکھا، باپ لڑکھڑاتے قدموں اور وحشت زدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ بیٹی کو خوف ہوا، جیسے باپ اس کے پاس پہنچنے سے پہلے ہی تیورا کر گر پڑے گا۔ وہ بیتابی سے چند قدم آگے بڑھی اور پھر دونوں مثلث کے دو ضلعوں کی طرح آپس میں مل گئے۔ بیٹی کی آنکھوں سے طوفانِ نوح پھوٹ پڑا مگر اس کا باپ کسی صحرا کی طرح خاموش تھا جس پر پانی بھرے بادل چھائیں بھی تو نہیں برستے۔

''ایک تو آنسو بہاؤ ابا! دیکھو اس وقت میرے سوا یہاں اور کوئی نہیں ہے''۔

جھنجھوڑے جانے کے باوجود باپ بدستور خشک

آنکھیں لیے اس کے سر پر لرزتا ہوا ہاتھ پھیرتا رہا اور صحرا کی ہوا کی طرح خشک سانس لینے لگا جسے صرف وہی محسوس کرسکتی تھی۔

"کیا آپ نے اپنے حصے کے آنسو بھی مجھے دے دیے ہیں ابا!" بیٹی نے بلک کر کہا۔ "اب تو یہاں کوئی نہیں ہے ابو! اپنی بیٹی کو تھوڑے سے آنسو دے کر اپنا بوجھ ہلکا کرلیجئے"۔

مگر لڑکی اس حقیقت سے انجان تھی کہ دروازے کی اوٹ میں مثلث کا تیسرا ضلع انتقامی بھوت بن کر کھڑا اس کے جذباتی مکالمے سن کر دل ہی دل میں ہنس رہا ہے، جس نے اپنا کھلا ہاتھ جیب میں ڈال کر ایک بند مٹھی باہر نکال لی ہے اور وہ صرف اس لمحے کا منتظر ہے جب دلہن باپ کے سینے سے سر اٹھا کر اپنا خوبصورت چہرہ اوپر اٹھائے گی۔ پھر برسوں جلتی ہوئی آگ سرد ہو جائے گی۔ انتقام کا بھوت کواڑ کی اوٹ سے دیکھ رہا تھا کہ برسوں گزرے جن دانتوں نے اس کا بازو کاٹ کھایا تھا وہ آج کتنے خوبصورت کتنے دلکش ہو گئے تھے۔ اس کے اپنے دانت انتقام کے جذبے سے پسنے لگے۔

"ابو! تمہارے کندھے تو پہلے ہی جنازے کے بوجھ سے اتنا جھک گئے ہیں، باقی تین جنازوں کو رخصت کرنے کا حوصلہ کہاں سے لاؤ گے؟" بیٹی نے ایک لمبی سسکی لی۔ "کاش! بھیا موجود ہوتا تو آج میرے جنازے کو اپنے مضبوط کندھوں پر رکھ کر تمہارے کندھوں کو اتنا جھکنے نہ دیتا......" بیٹی نے ایک لمحے کے لئے تھوڑا سا سر اٹھا کر باپ کو دیکھا۔

بیٹے کی مٹھی گولہ داغنے کے لئے تیار ہوگئی۔

"جانے والے کی پیٹھ کی پرچھائیں دیکھنے کی بجائے آنے والی خوشی کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کرو بیٹی!" باپ نے پھٹی ہوئی آواز سے کہا۔

"کاش میں ایسا کرسکتی...... آہ! میں کتنی نادان تھی، اپنے کو اس گھر کا مالک سمجھ بیٹھی۔ مَیں تو صرف آج تک کی مہمان تھی۔ اس گھر میں اور جو مالک تھا جانے کہاں کھو گیا۔ کاش! میرا بھیا......" بیٹی نے اپنا پورا چہرہ اوپر اٹھایا تو اس کی نظر باپ کے کندھوں سے ہوتی ہوئی اس کی پیٹھ پیچھے ایک بھیانک چہرے پر مقناطیس کی مانند چپک گئی۔ آنسوؤں کا جھرنا رک گیا۔ ذرا کی ذرا بھیانک چہرے کی آنکھوں میں شعلے سے لہرائے اور پھر لاوا اگلتی آنکھوں میں بھیگے بادل تیرنے لگے، اس کی مٹھی پہلے سے زیادہ بھنچ گئی تھی۔

"کک...... کک...... کون ہو تم؟" اچانک وہ گھگھیائی تو باپ ایک دم گھوم پڑا۔ وہی چہرہ ایک دفعہ پھر اس کے سامنے تھا جسے اس نے ابھی ابھی ڈانٹا تھا کہ بغیر اجازت اندر نہ آنا۔

"تم...... چور...... بدمعاش!" وہ تڑپ کر اس کی طرف بڑھا۔

"ابا!" ابا کے لفظ کے ساتھ ہی اس چور بدمعاش کی آنکھیں ایسی ہوگئیں جیسے برفیلی چوٹی پر جما برف کا تودا سورج کی تیز شعاعوں سے پگھلنا شروع ہو گیا ہو، چور بدمعاش نے برسوں کا جمع سرمایہ باپ کے پاؤں میں ڈھیر کر دیا لیکن بیٹی کے جسم میں اس کی روح میں "ابا" نے خنجر اتار دیا۔ وہ بجلی کی طرح لہرا کر ایک دفعہ پھر اس پر جھپٹی جس طرح برسوں پہلے ٹکٹوں والے البم پر جھپٹی تھی۔

"بھیا!" اس نے چیخنا چاہا مگر اس کی چیخ بھی بھیا کی طرح حلق سے نہ نکل سکی۔ بس ٹوٹی شاخ کی مانند بھیا کی بانہوں میں جھول گئی۔ بھیا کی بند مٹھی پوری طاقت سے بھنچ گئی، اتنی زور سے مٹھی بند ہوئی کہ اُس کے ہاتھ میں جو شیشی تھی وہ ٹوٹ گئی۔ ٹھنڈا تیزاب اس کی ہتھیلی پر پھیل کر اس کی پوری روح میں ٹھنڈک ڈالتا چلا گیا۔

●□●

اپنی شخصیت کی نفی کر کے دوسروں کے پیمانے میں ڈھل جانا کس قدر تکلیف دہ امر ہے لیکن اپنی خوشیوں اور اپنے گھر کو قائم رکھنے، دوسروں کے دل میں جگہ بنانے کے لئے یہ قربانی دینی ہی پڑتی ہے۔

مفاہمت

☆ ندیم عباس ڈھکو

شہلا کے لئے وقاص کا رشتہ آیا تو گھر میں سب سے زیادہ اودھم احسن نے مچایا تھا۔ بھڑکا پھرتا تھا، پاؤں زمین پر پٹخ کر اس نے اعلان کر دیا تھا کہ یہ رشتہ ہرگز نہیں ہو سکتا، ایک وجہ تو یہ کہ وقاص کے گھر والے سب کے سب پینڈو ہیں۔ پورے خاندان میں کوئی ایک بھی ایم اے پاس نہیں ملے گا۔ چند بی اے کی ڈگری لئے ہوئے ہیں مگر وہ بھی محض تھرڈ ڈویژن۔ اگر یہ شادی ہو بھی گئی تو آپس میں ذہنی ہم آہنگی کے فقدان کی وجہ سے جلد ہی ناکام ہو جائے گی۔ نیز یہ کہ لاہور میں رہنے والی لڑکی سندھ میں نہیں رہ سکتی۔ "یہاں" اور "وہاں" کے ماحول میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

وہ یہ رشتہ قبول نہ کرنے کے لئے بضد تھا لیکن امی ابو اس کے دلائل کو احمقانہ اور بچگانہ باتوں سے زیادہ اہمیت نہ دیتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ جو جس ماحول میں رہتا ہے وہیں کے طور طریقے اختیار کر لیتا ہے۔ اب وہ شروع ہی سے سندھ کے پسماندہ سے محلے میں رہ رہے تھے تو جدید طور طریقے کہاں سے اختیار کرتے۔ باپ کا انتقال کئی سال پہلے ہو چکا تھا، باپ کی عدم موجودگی میں اعلیٰ تعلیم بچوں کو کون دلواتا، ماں کے اعلیٰ خواب خاک میں مل گئے، چھوٹی چھوٹی عمروں میں ہی اولاد کو گھر کی

ذمہ داریاں سنبھالنا پڑیں۔ خواہ پرائیویٹ ہی سہی بہر حال ایک بھائی نے میٹرک اور ایک نے بی اے کر ہی لیا۔ اب دونوں اپنا اپنا کاروبار سنبھالے ہوئے تھے۔ خاصی آمدنی بھی ہو رہی تھی۔ چھوٹا بھائی انٹر میں پڑھ رہا تھا، بڑے بھائیوں کا خیال اس کو اعلیٰ تعلیم دلوانے کا تھا تاکہ ان کی آنکھوں میں بسے خواب چھوٹا بھائی تکمیل تک پہنچائے اور یہ ضروری نہیں کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور یکساں تعلیمی ڈگری کے حامل افراد کی ہی شادیاں کامیاب ہوں، کامیاب ازدواجی و عائلی زندگی ایک دوسرے کے حقوق و فرائض احسن طریقے سے پورے کر کے اور باہمی حسن و خلوص اور احترام سے ہی قائم رہتی ہے۔ شہلا نیک اور سمجھدار لڑکی ہے، ہر حال میں گزارا کر لے گی۔ ویسے بھی اس نے بی ایڈ کر لیا تھا، نوکری کے لئے کوشش کی اور اب وہ ایک سرکاری سکول میں ملازم بھی تھی، یوں تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا۔

لیکن امی کو اس وقت بڑی کوفت ہوتی تھی۔ جب کوئی ان سے شہلا کی شادی کے متعلق پوچھتا تھا، انہیں محسوس ہوتا جیسے سب سمجھ رہے ہیں کہ وہ دانستہ اس کی شادی کے فرض سے غافل ہیں۔ وقاص بھائی کے گھر والوں سے ان کی بہت دور کی رشتہ داری تھی، ان کے حالات پاکستان میں ہجرت کے بعد خراب ہوئے تھے ورنہ ہندوستان میں ان کے گھرانے کا شمار بھی محلے کے چند اچھے کھاتے پیتے گھرانوں میں ہوتا تھا، زمینیں بھی تھیں۔ ان کے لئے تعلیم کی کوشش بھی کی لیکن ناکام رہے، بعد میں سندھ آ بسے۔ گھر کی زمین کافی تھی، فقط دو کمرے بنے ہوئے تھے۔ جوں جوں حالات اچھے ہوتے گئے گھر میں توسیع کرتے رہے۔

وقاص بھائی کی والدہ کسی عزیز کی بیٹی کی شادی میں لاہور آئی تھیں وہیں انہوں نے شہلا کو بھی دیکھا۔ دبلی پتلی کھلتے ہوئے رنگ کی لڑکی تھی، کم گو اور خاموش خاموش سی، انہیں اچھی لگی۔ مزید معلومات حاصل کیں تو پتا چلا بی اے پاس ہے، سکول میں پڑھاتی ہے۔ انہوں نے فوراً اُسے دل ہی دل میں اپنے بیٹے کے لئے منتخب کر لیا۔ ان کے خیال میں وہ ان کے لئے ایک بہترین بہو ثابت ہو سکتی تھی۔ سکول سے ملنے والی تنخواہ سے مہنگائی کے زمانے میں اپنے شوہر کو کافی سہارا بھی دے سکتی تھی۔ کچھ اور نہ سہی کم از کم اپنا خرچہ تو پورا کر سکتی تھی۔

اس کے علاوہ انہیں اپنے بڑے بیٹے کی شادی کر کے خاصا تلخ تجربہ ہوا تھا۔ بڑی بہو محلے ہی کے ایک گھرانے سے تعلق رکھتی تھی، مڈل پاس تھی لیکن زبان دراز اس قدر کہ وہ اس سے کوئی معمولی بات کرتے ہوئے بھی گھبراتی تھیں۔ ہر وقت آستین کہنی تک چڑھائے وہ ٹارزن بنی پھرتی تھی۔ گھر میں کسی کی کچھ کہنے کی ہمت نہ پڑتی۔ ایک دو مرتبہ بیوی کے انداز و اطوار پر شوہر نے اعتراض کیا تو بیوی ان ہی پر چڑھ دوڑی۔ اپنی قسمت پھوٹ جانے اور جاہل گھرانے میں بس جانے کا شکوہ کیا۔ اپنا سامان بیگ میں سمیٹ گھر کی طرف چل دی۔ گھر ہی کون سا دور تھا، ان کی گلی کے بعد تیسری گلی میں دوسرا مکان تھا۔ بہو کے جانے کے بعد گھر میں سکون چھا گیا، سب نے اطمینان کا سانس لیا، یوں محسوس ہوتا تھا جیسے گھر میں اژدہا گھس آیا تھا جس کی وحشت سے سب لرزہ براندام تھے اور اب سکون کا سانس لے رہے تھے لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ چند گھنٹوں بعد ہی بہو کے چاروں بھائی ان کے گھر آ پہنچے اور بہنوئی کے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہو کر کہنے لگے۔

''آج تو تم نے ہماری بہن کو گھر بھجوا دیا ہے''۔ ایک نے بڑھک لگائی۔ ''لیکن خبردار! آئندہ ایسا نہ ہو اگر آئندہ ایسا ہوا تو تمہاری ناک اور کان کاٹ کر تمہیں دنیا میں منہ دکھانے کے قابل نہ چھوڑیں گے۔ جاؤ جا کر اسے لے کر آؤ''۔

ان کی گردن جھک گئی، جا کر بیوی کو لے آئے۔

اس واقعے کے بعد عمان بھائی بالکل بدل کر رہ گئے تھے۔ پہلے تو کبھی کبھار دُکان سے آ کر سب سے ہنسی مذاق کر لیا کرتے تھے لیکن اب سنجیدگی اور چپ نے ان کو بدل کر رکھ دیا تھا۔ بہو بیگم جو پہلے شوہر کی ڈھیل اور والہانہ محبت کا ناجائز فائدہ اٹھا کر گھر میں دندناتی ہوئی پھرتی تھیں، شوہر کے رویے سے حیران و پریشان تھیں۔ نہ وہ ان میں دلچسپی لیتے تھے اور نہ ہی بچوں میں، ان کے لئے سب کا ہونا یا نہ ہونا برابر تھا، وہ کمرے میں ان کے قریب ہوتیں لیکن وہ دوسری طرف منہ کئے کروٹ بدل کر سوتے رہتے۔ ان سے لاپروا اور بے نیاز۔ کئی مرتبہ احتجاج بھی کرنا چاہا لیکن جواب میں انہوں نے انہیں نفرت بھری نگاہوں سے دیکھا، کہنے لگے۔

"تمہارے لئے یہی بہت ہے کہ تم اس گھر میں رہ رہی ہو ورنہ میں تمہیں اسی دن طلاق دے دیتا جس دن تمہارے بھائی مجھے دھمکیاں دینے اس گھر میں آئے تھے"۔

ان کے چہرے پر زلزلے کے سے آثار نمودار ہوئے۔ انہوں نے بھی غصے سے کچھ کہنا چاہا لیکن عمان بھائی نے روک دیا۔

"ہاں، کہہ دینا، یہ باتیں بھی اپنے بھائیوں سے جا کر...... کہہ دینا"۔ انہوں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "اچھا ہے میرے کان، ناک کاٹ دیئے جائیں۔ میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہوں اور کہیں جا کر خاموشی سے خودکشی کرلوں۔ نہیں، بلکہ ایسا کرنا کہ ناک کان تو وہ کاٹ ہی دیں گے زہر کا پیالہ تم اپنے ہاتھ سے پلا دینا"۔

وہ ان کی باتیں سن کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔ وہ انہیں معاف کرنے پر تیار نہ تھے۔ شوہر کے دل میں بال آ گیا تھا، ان کی تمام تر محبت انتہائی نفرت میں بدل چکی تھی اور اس کی وجہ فقط ان کی اپنی ذات تھی۔ ان کی غیر سنجیدگی اور گھریلو معاملات میں میکے کو ملوث کرنے نے آج یہ دن دکھایا تھا کہ سیدھا سادہ شوہر اب مرکھنے بیل میں بدل چکا تھا۔

شہلا اچھی اور سمجھدار لگتی تھی، انہوں نے اسے وقاص بھائی کے لئے منتخب کر لیا۔ انہوں نے یہ بھی سوچا تھا کہ وہ تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے یقیناً اپنی آئندہ ہونے والی اولاد کی تعلیم و تربیت پر بھی توجہ دے گی۔ انہوں نے اپنے فیصلے پر عمل درآمد کرنے میں دیر نہ لگائی۔ وقاص بھی ان کے ہمراہ شادی میں شرکت کی غرض سے آئے تھے، انہیں بھی دکھایا گیا۔

شہلا کی اس رشتے کے بارے میں قطعاً کوئی رائے نہ تھی۔ اسے اپنے والدین پر اعتماد اور خدا پر یقین تھا کہ جو کچھ ہوگا یقیناً اس کے لئے وہ بہتر ہوگا۔ اسے اگر اندازہ بھی ہوتا کہ شادی کے بعد اسے کس قسم کے کٹھن حالات کا سامان کرنا پڑے گا تو ممکن تھا وہ دہل کر شادی ہی سے انکار کر دیتی۔

دنیا میں اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی اور کی بوئی ہوئی فصل کسی دوسرے کو کاٹنا پڑ جاتی ہے۔ وقاص بھی اپنی بھابی کے دیئے ہوئے زخموں کی سزا انجانے میں شہلا کو دینے لگا۔ گھر کے سارے کاموں کی ذمہ داری شہلا کو سونپ دی گئی۔

شادی کے بعد بڑی بہو کے خوب لاڈ پیار کئے گئے تھے۔ ایک سال تک کسی کام کو ہاتھ نہ لگوایا گیا نتیجتاً اسے ہڈحرامی اور آرام طلبی کی عادت پڑ گئی۔ خود سے تو کیا کام کرتی ساس اگر کسی کام کو بھی کہتی تو اسے ٹال دیا جاتا۔ انہیں غصہ آتا تو خود بھی بڑھ چڑھ کر زبان چلاتی، ساس بہت چوٹیں دل پر کھائے ہوئے تھیں۔ قیام پاکستان کے وقت شوہر ختم ہو چکے تھے، عزیز بہن بھائیوں کی جدائی جھیل چکی تھیں، بہو الگ گھر میں رہنا چاہتی تھی جہاں دل بھر کر اپنی من مانی کرتی، اپنے مفت خورے بہن بھائیوں

کی مہمانداری کرتی لیکن اس کا الگ رہنے کا ارمان پورا نہ ہوسکا، یوں تو عمان ان کی تقریباً تمام تر باتیں مان ہی لیا کرتا تھا لیکن الگ ہونے کا مطالبہ اس نے یکسر مسترد کر دیا۔

ساس نے روز روز کی چخ چخ ہونے کی وجہ سے ان کا کھانا پینا الگ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ بہو بیگم کا رویہ انتہائی تکلیف دہ تھا۔ کھانے کی تیاری کے ابتدائی و آخری مراحل کے دوران کچن کے قریب تک نہ پھٹکتی لیکن جیسے ہی کھانا تیار ہو جاتا وہ ڈونگے میں آدھی پتیلی کا سالن اچھی اچھی تمام بوٹیاں نکال کر کمرے میں لے جاتی۔ ساس اور گھر کے بقیہ افراد ہڈیوں اور چربی یا پھر چند بچی کھچی بوٹیوں پر مشتمل سالن استعمال کرتے۔ الگ کر دینے سے گھر میں قدرے امن ہو گیا تھا۔ شہلا کی تو شادی کے بعد ایک بھی ناز برداری نہ کی گئی۔ وہی مہربان ساس جو ایک سال تک بڑی بہو کی ناز برداری کرتے نہ تھکتی تھیں اب شہلا کے لئے سخت گیر ساس تھیں۔ شادی کے ایک ہفتے بعد ہی اسے کچن کا چارج سنبھالنے کے لئے دے دیا گیا۔ پہلے تو سب کا اسے ملازمت کروانے کا ارادہ تھا لیکن وقاص نے کہا کہ ”اپنی کمائی یہ گھر میں لائے گی تو اس کا دماغ خراب ہو جائے گا“۔ اس نے بغیر احتجاج کئے استعفیٰ بھجوا دیا۔ بڑی بہو معنی خیز انداز سے اسے کام میں جتے دیکھتی رہتی۔ ایک دن اس سے کہنے لگی۔

”تمہارے ماں باپ کو لاہور ہی میں کوئی نہیں ملا تھا جو تمہیں یہاں پھینک دیا؟ سچ کہتی ہوں تمہارے ساتھ بڑی زیادتی ہوئی ہے“۔

شہلا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس گھر میں کوئی بھی تو اس سے خوش نہ تھا۔ ساس تھیں تو ننگی تلوار بنی اس کے سامنے رہتی تھیں۔ جٹھانی کی الگ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد تھی۔ وہ اس کے تعلیم یافتہ اور اچھے گھرانے کی ہونے کی وجہ سے اس سے جلتی تھی۔ اس سے گریزاں اور گھریلو ماحول سے اس کو برگشتہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتی تھی، دیور کی اپنی سرگرمیاں تھیں، اسے کسی سے بھی گلہ نہ تھا۔ گلہ تھا تو محض وقاص سے جنہوں نے اسے شادی کے چند دن بعد ہی ناپسند کر دیا تھا۔

”میں تو سمجھا تھا، شہری لڑکی ہو“۔ وقاص نے کہا تھا۔ ”خوب زندہ دل ہو گی، میرے ساتھ ہنسی مذاق کرو گی۔ میں محبتوں میں شدت کا قائل ہوں لیکن تم تو......“

وہ طنزاً اس کی طرف دیکھ کر ہنسا۔ ”تم تو جیسے ایک زندہ لاش ہو، ایک بوڑھی روح جسے مجھ پر مسلط کر دیا گیا ہے۔ تمہارے والدین نے بتایا تھا کہ تمہاری عمر تیس سال ہے لیکن نہیں، میرا خیال ہے تم چالیس سال کی ہو گی۔ تمہارا یہ بزرگانہ انداز، سیدھے سادے اطوار، تیز اور شوخ رنگ نہ پہننا، زیور اور میک اپ میں دلچسپی نہ لینا، یہی ظاہر کرتا ہے کہ تمہیں نہ اپنے آپ سے دلچسپی ہے اور نہ مجھ سے۔ دلچسپی ہوتی تو اپنے آپ کو سجانے اور سنوارنے کی کوشش کرتیں، تمہاری شادی کو محض چند ماہ ہوئے ہیں لیکن یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کئی برس گزر گئے ہوں“۔

اس نے بڑے زہریلے لہجے میں لفظ چبا چبا کر کہا تھا کہ کر مطمئن ہو گیا، کم گو، سنجیدہ اور اپنے آپ میں لئے دیئے رہنے والی شہلا رخ موڑے سب کچھ سن رہی تھی، اسے بجنے سنورنے کی فرصت ہی بھلا کب ملتی تھی لیکن اس نے شوہر سے کچھ نہ کہا۔ وہ اندھا تو نہ تھا، جو اسے کچھ نظر نہ آتا تھا لیکن پھر بھی اس کی بہت سی باتیں صحیح تھیں، اس کا حلیہ واقعی صحیح نہ ہوتا تھا۔ بستر پر لیٹتے ہی اس کی آنکھیں خود بخود تھکن سے بند ہو جاتی تھیں۔ صبح کو تیار ہونے کا موقع نہ ملتا تھا، وہ اب شام کو نہا دھو کر تیار ہونے لگی، دوپہر اور رات کا کھانا الگ الگ پکانے کے بجائے ایک ہی وقت پکانے لگی، صرف روٹیاں رات کو پکاتی تھی۔ مہکی مہکی شہلا وقاص کے دل میں سما گئی۔ پہلے جب وہ ہلکا سا میک اپ کرتی تھی اور صرف بندے پہن لیا کرتی تھی تو

شکل ہی بدل جاتی تھی اب بھی ایسا ہی ہوا۔ سلائی کڑھائی سیکھ رکھی تھی۔

جہیز میں بہت سے جوڑے بغیر سلے رکھے تھے، ان سب کو نئی وضع قطع سے سی ڈالا۔ وقاص جسے ''بوڑھی روح'' کہا کرتا تھا اب اس کی تعریفیں کرتا نہ تھکتا۔

مرد کو بدلتے دیر نہیں لگتی۔ اس کا بدلنا اس کے لئے خوش آئند ثابت ہوا۔ گو کہ ساس کو اس کے نئے انداز و اطوار پسند نہ آئے تھے۔ ''باسی کھانا'' بھی اچھا نہ لگتا تھا۔ وقاص سے بھی کہا لیکن اُس نے نظر انداز کر دیا کہنے لگا۔

''گھر میں افراد زیادہ ہوں تو دونوں وقت پکانے میں کوئی قباحت نہیں لیکن لوگ ہی کتنے ہیں۔ بڑے بھائی، بھابی بچے الگ کھاتے پکاتے ہیں۔ میرے، آپ کے اور نعمان کے لئے ایک وقت کا پکا ہی کافی ہے۔ شہلا سے کہہ دیں، وہ سالن دوپہر کو پکا دیا کریں۔ ایک آپ دوپہر کو کھا لیا کریں، دوسرا رات کو، ویسے بھی کھانا فریج میں رکھ دیا جاتا ہے، باسی کہاں ہوتا ہے''۔

''بیوی کے پڑھائے سبق مجھے نہ پڑھاؤ''۔ وہ چڑ کر بولیں۔ ''اچھی خاصی وہ دن بھر کام میں لگی رہتی تھی، نہ جانے کس نے الٹی پٹی پڑھائی کہ کام کاج سے غافل ہر وقت آئینے کے سامنے رہنے لگی، یہ بڑی بہو کا ہی کارنامہ ہوگا۔ وہی ہمیں سکھ چین سے جیتے نہیں دیکھ سکتی''۔

''نہیں، اماں! ایسی کوئی بات نہیں''۔

وقاص مسکرانے لگا، ان سے کیا کہتا کہ الٹی پٹی بڑی بہو نے نہیں بلکہ خود اسی نے اپنی بیوی کو پڑھائی تھی۔ وقاص نے اگلے دن آفس سے آکر شہلا کو بتایا کہ اس کی چھوٹی بہن ثمینہ کا اس کے آفس میں فون آیا تھا۔ وہ اور اس کا بڑا بھائی دو دن بعد لاہور آرہے ہیں۔ وہ خوش ہو گئی، ولیمے والے دن ہی سب لوگ آئے تھے، دو مرتبہ اس کے ابو اس سے آکر مل گئے تھے، ایک مرتبہ وہ خود شادی کے چند دن کے بعد رہ کر آئی تھی لیکن اب تقریباً دو تین ماہ سے سوائے کبھی کبھار کے کوئی رابطہ نہ ہو پایا تھا۔

ولیمہ گھر ہی میں ہوا تھا۔ ثمینہ نے اسی دن ہر چیز کا تنقیدی جائزہ لیا تھا۔ پہلے کی طرح اب بھی وہ رائے بدلنے پر آمادہ نہیں تھی۔ ولیمے میں شریک خواتین اسے بالکل پینڈو اور جاہل لگ رہی تھیں۔ ان کے لباس احمقانہ اور جاہلانہ لگے تھے۔ اسے وقاص بھائی کی امی کا بڑا سا پرس سنبھال کر شہلا کے برابر میں بیٹھنا بھی پسند نہیں آیا تھا۔ مہمان خواتین دلہن کا منہ دیکھ کر رقم کا لفافہ یا نوٹ اسے دینا چاہتیں تو اسے وہ دلہن تک پہنچنے سے قبل ہی اچک لیتیں۔ ایک لڑکی کاپی پنسل لئے ان کے سامنے بیٹھی تھی۔ نوٹ جلدی جلدی گن کر وہ پرس میں ڈال لیتیں۔

''ہاں، ری شبو! ذرا لکھ تو سہی کہ لیاقت مٹھائی والے کی بیوی نے ہزار روپیہ دیا ہے''۔

تیل چڑے شادی میں شریک لمبے لمبے پراندے ڈالے خواتین اسے بالکل پسند نہ آئیں۔ وہ ہونق چہرہ بنائے سب آنے جانے والوں کو بغور دیکھ رہی تھی۔

''میں تو پریشان ہوں''۔ ثمینہ نے شہلا سے کہا تھا۔ ''تم یہاں رہو گی کیسے؟ میرے تو سر میں درد ہونے لگا ہے''۔ ثمینہ کو دیہاتی ماحول سے وحشت سی ہونے لگی تھی۔

وہی اس کے گھریلو ماحول سے شاکی اس کی چھوٹی بہن اب اس کے گھر رہنے آرہی تھی۔ دو دن بھی جیسے پلک جھپکتے ہی گزر گئے۔

ثمینہ آئی تو وہ اس سے آتے ہی لپٹ گئی۔ یہی بہنیں کبھی ساتھ ساتھ رہا کرتی تھیں، سہیلیوں کے ہاں ساتھ جاتیں، گھر کے کاموں میں ایک دوسرے کی شریک رہتیں۔ بس مزاج کا فرق تھا۔ ثمینہ قدرے ہنس مکھ طبیعت کی، قدرے تیز مزاج لڑکی تھی اور وہ سنجیدہ، باوقار اور سیدھی سادی لیکن اب شاید اس میں بھی کوئی تبدیلی ہو چکی تھی، انوکھی اور خوش رنگ تبدیلی، سرخ زمین پر پیلے

پھولوں والا اس چوڑا لمبا سا کرتہ، دوپٹہ پہنے، سرخ شلوار اور سرخ چپل میں یہ شہلا تو نہ لگ رہی تھی۔ یہ تو کوئی پہلے سے بہت مختلف ماڈرن سی لڑکی تھی۔ ہلکا میک اپ اور ہلکے پھلکے زیورات پہن کر وہ بالکل بدل گئی تھی۔ چہرے پر تازگی اور ملاحت تھی۔

''بڑی جچ رہی ہو''۔ ثمینہ نے اسے بھرپور نگاہوں سے دیکھ کر اپنی آنکھیں نیم وا کرلیں۔ ''ذہنی ہم آہنگی ہو گئی ہے، کچھ زیادہ ہی''۔ اس نے پھر سرگوشی کی۔ احسن بھائی اسے بغور دیکھ رہے تھے۔ سچی خوشیوں اور مسرتوں کے عکس ان کی بہن کے چہرے پر جھلملا رہے تھے، وہ مطمئن تھے۔ وقاص نے اپنی محبوب بیوی کو خوش کرنے کے لئے جواب ہر معاملے میں ان کے ساتھ تھی، ان کا خیال رکھتی تھی، ان کے بتائے انداز اختیار کر چکی تھی۔ ثمینہ اور احسن بھائی کا بہت خیال رکھا اور ان کو سندھ کی سوغاتیں تحفے کے طور پر دیں۔ واپسی پر احسن بہت خوش تھا، جاتے ہوئے کہنے لگا۔

''مجھے احساس ہو رہا ہے کہ امی میری باتوں کو احمقانہ اور بچگانہ سچ ہی کہا کرتی تھیں۔ میرے خیالات کس قدر غلط تھے۔ لڑکی خواہ کہیں کی بھی ہو، کہیں بھی رہ سکتی ہے فقط اس کا سمجھدار ہونا اور شوہر اور سسرال والوں کا خیال رکھنا اس ضمن میں ایک ضروری امر ہے''۔

شہلا ہنس دی، بڑے بھائی سے کیا کہتی۔

اپنی شخصیت کی نفی کر کے دوسروں کے پیمانے میں ڈھل جانا کس قدر تکلیف دہ امر ہے لیکن اپنی خوشیوں اور اپنے گھر کو قائم رکھنے، دوسروں کے دل میں جگہ بنانے کے لئے یہ قربانی دینی ہی پڑتی ہے۔ شہلا نے بھی اپنے ماں باپ کی عزت کی خاطر اپنے آپ کو مکمل تبدیل کر کے یہ قربانی دی تھی۔

O*O

اسرائیلی خفیہ ایجنسی موساد کی اندرونی کہانی

پوپ کے چنیدہ جاسوس

میاں محمد ابراہیم طاہر

قسط: 12

ویٹی کن سٹی کی گھنٹیوں کی محراب کے نیچے کے بھاری بھرکم داخلی گیٹ نصف شب کی نوبت بجتے ہی بند ہو چکے تھے جبکہ نیلے رنگ کی جانی پہچانی لیموزین کار گیٹ کے سامنے آ کر رکی۔ گاڑی کی روشنی میں پہریداروں کے لئے مخصوص پتھر کی حفاظتی چوکی میں دو سوئس پہریدار سخت سردی میں کپکپاتے ہوئے دکھائی دیئے۔ اُن کے پیچھے ویٹی کن سکیورٹی کا ایک اہلکار بھی کھڑا دکھائی دیا۔ ایک گارڈ نے چوکی سے باہر نکل کر کار کو رکنے کا اشارہ کیا۔ اگرچہ اس کار کی آمد متوقع تھی اور ڈرائیو کرنے والا ڈرائیور بھی نامانوس نہ تھا لیکن پوپ پر قاتلانہ حملے کے بعد ہر شخص ہی بہت محتاط تھا۔

گارڈ نے پچھلی سیٹ پر بیٹھی معتبر شخصیت کو دیکھ کر سلیوٹ مارا اور پیچھے ہٹ گیا لیکن اس شخص نے گارڈ کے سلام کا کوئی جواب نہیں دیا۔ ویانا سے روم آنے والی فلائٹ تقریباً ایک گھنٹہ لیٹ پہنچی تھی اور ڈرائیور کو ائرپورٹ پر رک کر انتظار کرنا پڑا تھا۔

کار سینٹ پیٹرز باسیلیکا کے پاس سے گزرتی ہوئی، پوپ کے محل کے سان داماسو صحن کو پار کر کے محل کے مرکزی دروازے کے سامنے جا کر رک گئی۔ ڈرائیور کود کر باہر آیا اور اپنے مسافر کے لئے کار کا پچھلا دروازہ کھولا۔ آرچ بشپ لوگی پوگی (Archbishop Luigi Poggi) اپنے سیاہ رنگ کے مخصوص چغے اور

گردن کے گرد مفلر لپیٹے ہوئے گاڑی سے باہر نکلا۔ اس کی جسمانی ساخت اور ظاہری شکل و شباہت رانی ایتان سے بہت مشابہہ تھی۔ وہی مضبوط کندھے، گردن اور چال ڈھال اور سرد مہری، آنکھوں کی چمک دمک۔

لوگی پوگی ہمیشہ ہلکے پھلکے سامان کے ساتھ سفر کرنے کا عادی تھا۔ اس کے پاس عموماً ذاتی استعمال کی اشیاء کے لئے ایک چھوٹا سا چمڑے کا سوٹ کیس اور دستاویزات کے لئے خفیہ تالے والا بریف کیس ہوتا تھا۔ وہ اکثر مذاقاً کہا کرتا تھا کہ اُس کا زیادہ وقت ہوائی جہاز کی نشستوں پر اونگھنے میں گزرتا ہے اور بہت کم اپنے کھلے ڈھلے، آراستہ پیراستہ پوپ کے محل کے عقب میں اپنے سونے کے کمرہ میں۔

پوگی دینا (Vienna) کی پرانی یہودی آبادی میں ایلی نامی شخص سے اکثر ملاقاتیں ہوتی رہی تھیں اور وہ بڑے انہماک سے اس کی باتیں سنا کرتا تھا۔ موساد سے معاملات طے کرنے میں اب پوگی پوری طرح ہوشیار اور محتاط ہوگیا تھا۔ ایلی (Eli) کے بارے میں اسے صرف اتنا ہی معلوم تھا کہ وہ کئی زبانیں جانتا تھا اور ان میں گفتگو کر سکتا تھا اور آخرکار اس نے پوگی کو اس سوال کا جواب مہیا کردیا تھا کہ پوپ جان پال کی جان لینے کی سازش کس نے تیار کی تھی۔

جہاں تک لوگی پوگی کے اپنے خفیہ کام اور سرگرمیوں کا تعلق تھا ویٹی کن کے اُس رجسٹر میں، جہاں مختلف لوگوں کی ڈیوٹیوں اور فرائض کا اندراج ہوتا تھا، اس کا کوئی ذکر ہی نہ تھا۔ وہ گزشتہ 20 سال سے اپنی خفیہ سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے تھا اور اس کے رابطے کریملن، واشنگٹن اور یورپ کے اہم دارالحکومتوں سے قائم تھے۔ وہ سب سے پہلا شخص تھا جسے معلوم ہوا تھا کہ روسی لیڈر یوری اندروپوف (Yuri Andropov) متعدی مرض ہیپاٹائٹس سے قریب المرگ تھا۔ یہ پوگی ہی تھا جسے جنیوا کے روسی مشن میں بیٹھنے کا موقع ملتا تھا۔ جو انیسویں صدی کی ایک خوبصورت عمارت میں قائم تھا اور جہاں بہترین قسم ووڈ کا کاویئر شراب ملتی تھی۔ یہیں اسے سب سے پہلے معلوم ہوا تھا کہ روس یورپ کی طرف منہ کئے ہوئے اپنے ایٹمی ہتھیار ہٹانے کو تیار تھا بشرطیکہ امریکہ تخفیف اسلحہ کے بارے میں اپنے سخت مؤقف میں نرمی پیدا کرے۔ یہ اہم خبر اس نے روم میں سی آئی اے کے سٹیشن کمانڈر کو اس وقت پہنچادی تھی جب وہ اگلے جمعہ کی شام کو پوپ کو ہفتہ وار رپورٹ پیش کرنے کے لئے حاضر ہوا تھا۔ دو دہائیوں تک پوگی، پوپ جان پال کا خفیہ اطلاعات و معلومات اکٹھی کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ بنا رہا۔ اس طرح انہیں دوسرے ذرائع سے ملنے والی اطلاعات و معلومات کی چھان پھٹک اور تجزیہ کرنے کا بہترین موقع ملتا تھا۔ اس طرح انہیں اپنی پالیسی مرتب کرنے اور ایک درجن سے زائد ذرائع سے ملنے والی معلومات و اطلاعات کی روشنی میں لائحہ عمل طے کرنے کا بہترین موقع میسر آجاتا تھا کیونکہ اُسے کئی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔

ایلی سے اپنی اگلی ملاقات میں اس نے اپنی انتہائی نرم آواز جو اس کا "تجارتی نشان" بن چکی تھی، اپنی تیز براؤن آنکھوں اور شیریں لبوں کے ساتھ، چہرے پر سنجیدگی طاری کئے ہوئے ایلی سے کئی سوال و جواب کئے۔

لیکن اُس ٹھنڈی اور یخ بستہ رات کو مسلسل سفر کی وجہ سے پوگی کافی تھکاوٹ محسوس کررہا تھا اور اس کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔ پہریدار کی چوکی سے گزر کر پوپ کے محل میں داخل ہوتے ہوئے اس نے محل کے سوئس گارڈ کو مستعدی سے کھڑے ہوئے دیکھا۔ پوگی لفٹ میں سوار ہوکر پوپ کی خواب گاہ کی طرف روانہ ہوگیا۔

پوپ کے خانساماں نے پوگی کو جان پال کے

طالبے کے کمرے میں پہنچا دیا۔ کمرے میں لگی الماریاں پوپ کی دلچسپی کے موضوعات کی کتب سے بھری ہوئی تھیں۔ چمڑے کی جلد بندی میں محفوظ کی گئی پولینڈ کی قدیم کتب، مذہبی، ادبی اور کلاسیکل ادب کے علاوہ وہاں ''انٹرنیشنل ڈیفنس ریویو''، ''پرابلم آف ملٹری ریڈی نیس'' اور ''ملٹری بیلنس اینڈ سرپرائز اٹیک'' جیسے دفاعی موضوع پر بھی کتب موجود تھیں۔ اس سے پوپ کے اس مؤقف کی تائید ہوتی تھی کہ اُس وقت 1983ء تک اس کا سب سے بڑا دشمن ''کمیونزم'' (Communism) ہی تھا۔

پوپ جان پال اپنے ذاتی عملے اور سٹاف کو یہ یاد دہانی کرانا کبھی نہیں بھولتا تھا کہ اگلی صدی کے طلوع آفتاب سے قبل ''کوئی چیز'' دنیا کا نقشہ تبدیل کر کے رکھ دے گی۔ جب اس سے اس تبدیلی کی وضاحت کے لئے کہا جاتا تھا تو وہ اپنا بھاری بھرکم سر ہلا کر کہتا تھا کہ سب دعا کرو کہ کمیونزم اور سیکولرازم کے مقابلے میں چرچ کا اثر ورسوخ مزید نہ سکڑ جائے اور کمیونزم امریکہ، جرمنی اور ہالینڈ جیسے ممالک تک نہ پھیل جائے۔ اس کا اصرار تھا کہ سینٹ پیٹرز سکوائر کے قاتلانہ حملے میں اس کی زندگی اسی لئے بچائی گئی تھی کہ ''میں کمیونزم اور سیکولرازم کے مقابلے میں جنگ کی قیادت کروں''۔

پوگی کو اس بات کا علم تھا کہ یہی فکر جان پال کی ذہنی اور جسمانی حالت پر اثرانداز ہوئی تھی۔ پوگی نے اپنے استقبال کے وقت محسوس کر لیا تھا کہ عوام کی نظروں سے اوجھل، پوپ جان پال، پہلے سے زیادہ تنہائی اور عجلت پسند بن گیا تھا۔ اغکا (Agca) کی گولیوں نے جہاں اس کی ہڈیوں اور گوشت پوست کو زخمی کیا تھا وہیں اس کے جذبات کو مجروح کر کے تنہائی پسند بنا دیا تھا۔

پوپ کے سامنے ہمیشہ کی طرح مؤدب بیٹھ کر اور اپنے دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھ کر آرک بشپ پوگی نے وہ کہانی سنانی شروع کی جس کا آغاز اغکا کی گولیوں سے ہوا تھا۔

13 مئی 1981ء کی شام کو سینٹ پیٹرز سکوائر میں پیش آنے والے حادثے کی خبر جب اسرائیلی دارالحکومت تل ابیب پہنچی تو موساد کے اس وقت کے ڈائریکٹر جنرل یزہاک ہوفی کا پہلا تاثر یا ردعمل یہ تھا کہ یہ کسی پاگل جنونی کا فعل تھا۔ اگرچہ روم میں پیش آنے والا یہ سانحہ دنیا کو جھنجھوڑ دینے والا تھا لیکن موساد کی اس وقت کی کارروائیوں سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔

اگرچہ اس وقت اسرائیل میں رہنے والے عربوں کے خیالات و معمولات میں بنیادی تبدیلیاں رُونما ہو رہی تھیں لیکن انتہا پسند یہودی، جن کی قیادت ''کہانے کاخ پارٹی'' (Kahane Kach Party) کے ممبران کر رہے تھے، تشدد اور انتہا پسندی کو زیادہ ہوا دے رہے تھے۔ اس انتہا اور تشدد پسند گروپ کی طرف سے مسلم امہ کے یروشلم میں مقدس ترین مقام گنبد صغریٰ کو بم سے اڑانے کی سازش عین بروقت پکڑ کر ناکام بنا دی گئی تھی۔ اگر یہ سازش کامیاب ہو جاتی تو اس کے نتائج انتہائی بھیانک نکلنے تھے، جن کا سامنا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ امریکہ کی دوڑ دھوپ اور شٹل ڈپلومیسی اور بیروت، دمشق اور یروشلم کے دوروں کے باوجود لبنان میں جنگ جاری تھی۔ اسرائیلی کابینہ کے اندر وزیراعظم بیگن (Begin) ایک ایسی پارٹی کی قیادت کر رہا تھا جو اس بات پر زور دے رہی تھی کہ پی ایل او کے ساتھ ایک آخری اور فیصلہ کن معرکہ سر کر لیا جائے۔ یاسر عرفات کے قتل کا حکم اب بھی موساد کی ترجیحات میں سب سے اوپر تھا اور اسی ماہ جب کہ پوپ پر قاتلانہ حملہ ہوا تھا، موساد کی طرف سے پی ایل او کے چیئرمین کے قتل کی دو کوششیں ناکامی سے دوچار ہو چکی تھیں۔

بظاہر مغرب کے ہر ملک کی انٹیلی جنس ایجنسی اپنے طور پر پوپ پر قاتلانہ حملے کے بارے میں تفتیش و تحقیق

میں مصروف تھی لیکن موساد کے سربراہ ہوفی نے اپنی ایجنسی کو اس معاملے سے الگ رہنے کی ہدایت کی تھی۔ وہ ایسی ہر صورت حال میں سب سے پہلے سانحے یا واقعے کے پس منظر کو سمجھنے کی کوشش کرتا تھا۔

وہ ابھی اسی انتظار میں تھا کہ اس کی جگہ ستمبر 1982ء میں ناہوم ایڈمونی کو موساد کا ڈائریکٹر جنرل لگا دیا گیا، جس کے مہاجر والدین کا تعلق بھی پولینڈ کے علاقے گڈانسک (Gdansk) کے قریبی علاقے کے ایک متوسط خاندان سے تھا۔ ایڈمونی کو ہمیشہ سے ہی کیتھولک چرچ سے دلچسپی رہی تھی۔ جب وہ خفیہ جاسوس کے طور پر امریکہ اور فرانس میں کام کرتا رہا تھا تو اس نے محسوس کر لیا تھا کہ کیتھولک چرچ کا لوگوں کی زندگیوں میں کتنا زبردست اثر تھا۔ امریکہ میں ایک کیتھولک صدر، کینیڈی کو منتخب کرانے میں روم نے بھرپور کردار ادا کیا تھا اور اسے وائٹ ہاؤس (امریکن ایوانِ صدر) پہنچا دیا تھا۔ اسی طرح فرانس میں سیاسی اتار چڑھاؤ اور مدوجذر میں کیتھولک چرچ کا بہت اثر تھا۔

اپنے نئے عہدہ کا چارج لیتے ہی ایڈمونی نے موساد کی وہ فائل منگوا بھیجی جس میں پوپ پر قاتلانہ حملے کا ذکر تھا۔ فائل میں اخباری تراشوں اور روم میں متعین موساد کے ایجنٹ کی معمول کی رپورٹ کے علاوہ کوئی خاص بات نہ تھی۔ خلاف معمول بات یہ تھی کہ جن چھ ایجنسیوں نے اس کیس کی تفتیش کی تھی اور روم کی ہائی سکیورٹی جیل "رابیبیا پریزن" (Rabibbia Prison) کی قید تنہائی کی کوٹھری میں بند اغکا سے ملاقاتیں بھی کی تھیں۔ وہ بھی کسی نتیجے پر پہنچنے میں ناکام رہی تھیں۔ موساد کے سربراہ ایڈمونی نے فیصلہ کیا کہ خود اس کیس کی انکوائری کروائے گا۔

ولیم کیسی، جو اس وقت امریکن سی آئی اے کا ڈائریکٹر تھا، نے بعدازاں اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ شاید موساد نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ویٹی کن کے اندر سرایت کرنے کی کوشش کی ہوگی۔ ایڈمونی کا خیال ہوگا کہ اپنے پولش پس منظر کی وجہ سے شاید وہ اپنے ہموطن پولش پوپ تک رابطے قائم کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔

اسرائیلی خاتون وزیراعظم گولڈا میئر کی ویٹی کن کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کرنے کی ناکام کوشش کے بعد، اس وقت کے موساد کے چیف زوی (Zvi Zamir) نے مستقل طور پر روم میں ایک جاسوس متعین کر کے اس کی ڈیوٹی لگا دی تھی کہ وہ ویٹی کن کے اندر خفیہ رابطے پیدا کرنے کی کوششیں جاری رکھے۔

روم میں اسرائیلی سفارتخانے کے قریب ہی واقع ایک الگ عمارت میں موجود اس ایجنٹ نے ویٹی کن کے اندر کوئی مخبر تلاش کرنے کی اپنی سی کوشش کی تھی لیکن ناکام رہا تھا۔ جو کچھ معلومات اور اطلاعات یہ ایجنٹ حاصل کر سکا تھا وہ ویٹی کن کے اردگرد واقع ریسٹورانوں، طعام گاہوں اور باروں میں ہونے والی گپ شپ، افواہ سازی اور ہنسی مذاق کے سوا کچھ نہ تھا، جو ویٹی کن کے عملے کے لوگ وہاں بیٹھ کر کیا کرتے تھے۔ اس نے اس کے علاوہ کوئی قابل اعتبار چیز نہ دیکھی تھی کہ امریکن سی آئی اے کا روم میں سٹیشن چیف ہر جمعہ کی شام کو باقاعدگی کے ساتھ ویٹی کن کے اندر اپنی گاڑی میں پوپ کو دنیا بھر کی خفیہ معلومات اور اطلاعات پہنچانے جایا کرتا تھا۔ پوپ جان پال کی صحت یابی کے فوراً بعد معمول کا یہ کام دوبارہ شروع ہو گیا تھا۔

پوپ جان پال کی صحت یابی کے دوران ویٹی کن سٹیٹ کے تمام انتظامی امور سیکرٹری آف سٹیٹ، کارڈینل اگوسٹینو کسارولی (Agostino Casaroli) چلاتا رہا تھا۔ اسرائیلی ایجنٹ کو کسی ذریعہ سے معلوم ہوا تھا کہ کسارولی نے پوپ پر حملے کے بعد

سخت ردِعمل کا اظہار کرتے ہوئے سی آئی اے کو لتاڑا تھا ۔ جاسوس ایجنسی کو اغکا کے بارے میں معلومات ہونی چاہئیں تھیں اور اس کا منصوبہ قبل از وقت ناکام بنانا چاہئے تھا۔ اس نے سیکرٹری آف سٹیٹ کے ردِعمل سے تل ابیب کو آگاہ کر دیا تھا؟

امریکن خفیہ ایجنسیوں میں عام تاثر یہ پایا جاتا تھا کہ پوپ کے قتل کی سازش روسی خفیہ ایجنسی کے جی بی نے تیار کی تھی اغکا صرف آلہ کار بنا تھا۔ ایک دستاویز، جس پر انتہائی خفیہ یعنی ''ٹاپ سیکریٹ'' لگا تھا اور جس کا عنوان تھا ''اغکا کی پوپ کے قتل کی کوشش۔ روس کے ملوث ہونے کی تحقیق'' میں کہا گیا تھا کہ روس کو یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ پولینڈ میں، جو روس کے زیر اثر تھا، وہاں پوپ نیشنلزم کی آگ بھڑکا سکتا تھا (کیونکہ نوجوانی میں پوپ بذاتِ خود ماسکو کے قبضے کے خلاف پولینڈ کی تحریک مزاحمت کا حصہ رہا تھا، مترجم)۔

پہلے ہی 1981ء سے اپنے لیڈر لیخ والیسا (Lech Walesa) کی زیر قیادت صنعتی مزدوروں کی تحریک ''سالیڈیرٹی'' حکوم کے خلاف زور آزمائی کی تیاری کر رہی تھیں اور ماسکو کی طرف سے حکومت پولینڈ پر سخت دباؤ تھا کہ مزدور یونین کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں کے آگے بند باندھا جائے۔

پوپ کی طرف سے ولیسا کو زور دے کر کہا گیا تھا کہ وہ کوئی ایسی حرکت نہ کرے جس کو بہانہ بنا کر روس کو براہِ راست ملٹری ایکشن کا جواز مل جائے۔ جان پال نے وہاں کے قریب المرگ کارڈینل سٹیفن وی زنسکی کارکنوں کے سامنے یونین کے لیڈر ولیسا کے سامنے لیٹ کر اس کی ٹانگ پکڑ لی اور کہا کہ وہ اس وقت تک اس کی ٹانگ سے چمٹا رہے گا جب تک اس کا دم نہیں نکل جاتا۔ چنانچہ یونین لیڈر ولیسا کو ہڑتال کا اعلان واپس لینا پڑا تھا۔

تل ابیب میں موساد کے تجزیہ کاروں کا خیال تھا کہ پوپ، روس کے ساتھ مصالحانہ رویہ رکھنا چاہتا تھا تاکہ پولینڈ میں سالیڈیرٹی نے جو طاقت جمع کر لی تھی وہ کسی قسم کے ٹکراؤ سے منتشر نہ ہو جائے۔ لہٰذا یہ بات ممکن نظر نہیں آتی تھی کہ ماسکو پوپ کو قتل کرانا چاہتا تھا۔ البتہ ماضی میں ایسی مثالیں موجود تھیں کہ روس نے اپنے بعض پرورده پیاروں کو بوقتِ ضرورت مروایا بھی تھا۔ روس کی خفیہ ایجنسی کے بی جی ماضی قریب میں بلغاریہ میں ایسا مشن انجام دے چکی تھی۔ تجزیہ کاروں کے مطابق پولش پوپ کے بارے میں ایسا کوئی امکان نہیں تھا۔

موساد کے سربراہ ناہوم ایڈمونی نے اب یہ سراغ لگانے کی کوشش شروع کی کہ سی آئی اے اور پوپ کے موجودہ تعلقات کس قسم کے تھے۔ سی آئی اے کے ڈائریکٹر کیسی کی پوپ سے باقاعدہ ملاقاتوں کے علاوہ، ویٹی کن اور سی آئی اے کے درمیان تعلقات کا نہایت اہم ذریعہ فلاڈلفیا کا کارڈینل جان کارول تھا، جو وائٹ ہاؤس اور پوپ کے محل کے درمیان چکر لگاتا رہتا تھا۔ پوپ کے انگریزی زبان کے سیکرٹری جان مگی کے مطابق کرول، ہولی فادر کا بہت ہی خصوصی چنیدہ بندہ تھا۔ دونوں کا پس منظر ایک جیسا تھا۔ دونوں کو پولینڈ کے پسندیدہ گیت اور کہانیاں یاد تھیں اور دونوں کھانے کی میز پر بیٹھے ہوئے پولش زبان میں ہلکی مذاق کیا کرتے تھے۔ ہم اُن کے اردگرد بیٹھے ہوئے صرف مسکراتے رہتے تھے کیونکہ ہمیں ان کی گفتگو کا ایک بھی لفظ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

یہ کرول ہی تھا جو جان پال کے پوپ منتخب ہونے کے بعد سی آئی اے (CIA) کے ڈائریکٹر کیسی کو ان کے حضور پیشی کے لئے ہمراہ لے کر گیا تھا۔ اس کے بعد کیسی کے نائب ورنن والٹرز کو بھی اسی نے پوپ سے متعارف کرایا تھا۔ اس وقت سے سی آئی اے کے افسروں اور

پوپ کے درمیان جن موضوعات پر بات چیت اور گفتگو ہوتی رہی تھی، ان میں مڈل ایسٹ میں دہشت گردی، چرچ کے اندر کی سیاست اور کریملن لیڈروں کی صحت کے مسائل شامل رہے تھے۔ رچرڈ ایلن، جو امریکن صدر رونالڈ ریگن کا اولیں سکیورٹی ایڈوائزر تھا، کے الفاظ میں، جو خود بھی کیتھولک تھا۔ ''سی آئی اے اور پوپ کے درمیان تعلقات انتہائی گہرے تھے اور صدر ریگن پُر امید تھا کہ دنیا کا نقشہ بدلنے میں پوپ اس کی مدد کرے گا''۔

دونوں نے مل کر یقینی اہداف مقرر کر لئے تھے۔ صدر ریگن اور پوپ نے مشترکہ طور پر اسقاط حمل، ابورشن کی ملامت کر دی تھی۔ امریکہ نے ان ممالک کی کئی ملین ڈالر کی امداد معطل کر دی تھی جو فیملی پلاننگ یعنی منصوبہ بندی کے پروگراموں پر عمل پیرا تھے۔ پوپ نے جان بوجھ کر خاموشی اختیار کر کے امریکن ملٹری کی نیٹو (Nato) کو نئے قسم کے کروز میزائل سپلائی کرنے کی بلاواسطہ حمایت کر دی تھی۔ سی آئی اے باقاعدگی کے ساتھ سینٹرل امریکہ کے اُن بشپس اور پادریوں کے ٹیلی فون سنتی (بگ کرتی) تھی، جو مذہبی آزادی کی حمایت اور نکاراگوا اور ایل سلویڈور میں امریکہ کی پشت پناہی سے چلائی جانے والی حکومتی پالیسیوں کی مخالفت کرتے تھے۔ ان مذہبی رہنماؤں کی فون کالوں کی کاپیاں پوپ پال کو روم کے سی آئی اے کے سٹیشن چیف کی ہر جمعہ کی شام کو پوپ کو مہیا کی جانے والی دستاویزات واطلاعات کا حصہ ہوتی تھیں۔ صدر ریگن نے کرنل اولیور نارتھ کو، جو اس وقت نیشنل سکیورٹی کونسل میں کام کرتا تھا، اختیار دے دیا تھا کہ پوپ کے وفادار ان پادریوں کو معقول ادائیگیاں کرتا رہے جن کی ویٹی کن سفارش کرے، جو سینٹرل اور جنوبی امریکہ، افریقہ اور ایشیا میں کام کر رہے تھے۔ یہ پیسہ پادریوں کو پُرآسائش اور آرام دہ زندگی گزارنے، اسقاط حمل اور طلاق کی مخالفت کے لئے خرچ کیا جاتا تھا۔

پوپ کے ذاتی سیکرٹری کے ایک نائب ایمر کابونگو کی ڈیوٹی تھی کہ منظور شدہ پادریوں کی فہرست کو ہر وقت مکمل رکھے۔ اس کے فرائض میں یہ بھی شامل تھا کہ سی آئی اے کی طرف سے مہیا کردہ کاغذات اور دستاویزات کو فائلوں میں لگائے اور پوپ کے ساتھ ہونے والی خفیہ میٹنگوں کے نوٹ لیتا رہے۔

کابونگو کا پہلی دفعہ واشنگٹن کے جاسوسوں سے سامنا 30 نومبر 1981ء کو ہوا تھا جبکہ پوپ جان پال نے قاتلانہ حملے کے زخموں سے صحت یاب ہونے کے بعد اپنے فرائض دوبارہ سنبھالے تھے۔ کابونگو نے جان پال کے ساتھ 5:15 بجے کی عبادت میں شرکت کی تھی جو دونوں نے پوپ کی رہائش کے برآمدے میں ایک چھوٹے سے چرچ میں اکٹھے ادا کی تھی۔ اس کے بعد وہ اکٹھے ہی پوپ کے دارالمطالعہ کے کمرے میں سی آئی اے کے ڈپٹی ڈائریکٹر ورنن والٹرز سے ملنے گئے تھے۔

کابونگو کی یادداشت کے مطابق ''میں کمرے میں اپنی معمول کی جگہ پر ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ نوٹ بک میرے گھٹنوں پر رکھی تھی۔ درمیان میں کوئی مترجم موجود نہیں تھا۔ جنرل والٹرز نے پوچھا کہ عزت مآب کون سی زبان میں بات کرنا پسند فرمائیں گے۔ ہز ہولی نیس نے جواب دیا کہ وہ اٹالین زبان میں سہولت محسوس کریں گے۔ والٹرز نے صدر ریگن کی طرف سے صحت یابی پر مبارک باد اور نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ پوپ نے شکریہ ادا کیا۔ اب معمول کی باتیں شروع ہو گئیں۔ والٹرز نے خلائی سیاروں کے ذریعے کھینچی تصاویر پیش کیں جنہیں دیکھ کر پوپ نے اظہارِ مسرت کیا کہ تصویریں بہت صاف تھیں۔ اس کے بعد والٹرز نے ایک گھنٹے تک روسی عزائم کے بارے میں سی آئی اے کے نقطۂ نظر کی وضاحت کی۔ پوپ نے شکریہ ادا کیا۔ میٹنگ کے آخر میں والٹرز نے کچھ تسبیحیں پیش کیں اور پوپ نے

درخواست کی کہ وہ ان پر دَم کر دیں کیونکہ یہ عزیز و اقارب اور دوست احباب کی طرف سے تھیں۔ پوپ نے انہیں ہاتھ میں لے کر ان پر پھونکیں ماردیں"۔

پوپ جان پال کی دنیاداری سے روحانیت کی طرف سفر کی اہلیت و قابلیت کا پتہ چلانے کے لئے ایڈمونی نے امریکہ کے سیکرٹری آف سٹیٹ (وزیر خارجہ) الیگزنڈر ہیگ کا سہارا لیا۔ دونوں کی اس وقت سے واقفیت اور شناسائی تھی جب ایڈمونی واشنگٹن کے اسرائیلی سفارتخانے میں کام کرتا تھا۔ اس نے سی آئی اے سے پوپ جان پال کی نفسیاتی تجزیاتی رپورٹ کی کاپی کے لئے رجوع کیا۔

یہ ایک ایسے شخص کا خاکہ تھا جس کا مذہبی جنون اور جوش و جذبہ اپنی انتہاؤں کو پہنچا ہوا تھا۔ وہ عبادت کے دوران روتا سسکتا اور اکثر ماربل کے فرش پر منہ کے بل گر کر اور اپنے دونوں بازو پھیلا کر صلیب کا نشان بنا لیتا تھا اور اس وقت اس کا جسم ایسے بے حس و حرکت ہوتا تھا کہ جیسے اس میں جان ہی نہ ہو، ایک مردہ پڑا ہو۔ وہ اسی حالت میں گھنٹوں پڑا رہتا تھا۔ اس کے باوجود اس کا غصہ ناقابل برداشت خوفناک ہوتا تھا۔ ایسی حالت میں اس کا اپنے آپ پر کوئی کنٹرول نہیں رہتا تھا اور وہ چیختا چلاتا تھا۔ زمینی حقائق اور سیاست پر اس کی گرفت بہت مضبوط تھی اور اس سلسلے میں اس کا رویہ خوفناک اور کسی بھی ڈکٹیٹر کی طرح غیر لچکدار ہوتا تھا۔ جان پال ویٹی کن کی سول سروس یعنی افسر شاہی کا سامنا کرنے سے نہیں گھبراتا تھا۔ یہ سول سروس "کوریا" کہلاتی تھی۔ نہ وہ سول سروس کے پرانے اور کہنہ مشق سیکرٹری آف سٹیٹ کی پروا کرتا تھا جس کا نام آگوسٹینو کسارولی (Agostino Casaroli) تھا۔ اس نفسیاتی خاکے سے لگتا تھا کہ اسے پولینڈ کی عملی سیاست کا وسیع تجربہ تھا اور اب دنیا کی سیاست میں اپنا کردار ادا کرنے کے لئے بیقرار تھا۔

موساد کے سربراہ ناہوم ایڈمونی پر ایک بات واضح ہو چکی تھی کہ امریکن سی آئی اے اور پوپ کے درمیان قریبی تعلقات نے جان پال کو باور کرا دیا تھا کہ اس پر قاتلانہ حملے کے پیچھے کریملن (روسی ایوانِ اقتدار) کا ہی ہاتھ تھا۔

لیکن اگر بالفرض امریکہ کا یہ مؤقف غلط ثابت ہو جائے تو پوپ کا ردِعمل کیا ہوگا؟ کیا ایسی صورت میں اس کا سی آئی اے سے اعتبار اٹھ جائے گا وہ تمام انٹیلی جنس ایجنسیوں کی خفیہ رپورٹوں پر یقین کرنا چھوڑ دے گا؟ اور اگر موساد یہ ثابت کر دے کہ اس پر قاتلانہ حملے کے پیچھے کسی اور کا ہاتھ تھا تو کیا اس سے ویٹی کن کے بھاری بھرکم تانبے کے دروازوں کے اندر اسرائیل کا داخلہ ممکن ہو سکے گا؟ اگر یہ سب کچھ نہ بھی ہو سکے تو کیا اسرائیل کے بارے میں پوپ کے رویے میں کسی تبدیلی کا امکان ہو سکتا تھا؟ اور پوپ کم از کم ایک دفعہ موساد کی رپورٹ پیش کر کے وضاحت کی اجازت دے سکتا تھا؟

چھ مہینے کے بعد موساد کے سربراہ ناہوم ایڈمونی کو اس کے پہلے سوال کا جواب مل گیا کہ کیا پوپ کے قتل کی سازش اور منصوبہ بندی کسی اور نے کی تھی؟ یہ جواب اس کی خواہش اور تسلی کے مطابق تھا۔

اس سازش کا تانا بانا تہران میں، آیت اللہ روح اللہ خمینی کی مکمل اجازت سے تیار کیا گیا تھا۔ پوپ کے قتل کا ارادہ اس جہاد کا نقطۂ آغاز تھا جو مغرب کے خلاف شروع کیا جانا تھا۔ خمینی کے خیال میں چرچ کی وہ اقدار زوال پذیر ہو چکی تھیں جن کی منظوری سب سے بڑا چرچ دیا کرتا تھا۔

ایڈمونی کے لئے موساد کی طرف سے جو رپورٹ تیار کی گئی تھی اس میں کہا گیا تھا۔

"خمینی انتہا پسندی، تعصب اور کٹرپن کی عمدہ مثال ہے۔ اس نے اپنے لوگوں پر اپنے آپ کو خدائی فوجد

مقرر کر لیا ہے۔ اپنی اس اساطیری حیثیت کو برقرار رکھنے کے لئے وہ زیادہ سے زیادہ ایسے طریقے اپنائے گا جس سے اسرائیل، مغرب اور تمام دنیا کے لئے زیادہ سے زیادہ خطرات پیدا ہوں"۔

قبل از وقت اس بات کا خیال کر کے اغکا اپنے مشن میں ناکام بھی ہو سکتا تھا۔ اس کے ایرانی سرپرستوں نے اس کے ماضی میں انتہا پسند اور جنونی ہونے اور تنہا رہنے کی کہانی پہلے ہی پھیلا دی تھی تاکہ اس کا قاتلانہ حملے کا فعل اس کا اکیلے کا ذاتی فعل دکھائی دے۔ مہمت علی اغکا مشرقی ترکی کے ایک دور افتادہ گاؤں یاسیل تپے (Yesiltepe) میں پیدا ہوا تھا اور سخت اسلامی بنیاد پرستی کے ماحول میں اس کی پرورش ہوئی تھی۔ انیس سال کی عمر میں اس نے ایران کے حمایت یافتہ انتہا پسند اور دہشت گرد گروپ گرے وولف میں شمولیت اختیار کر لی۔ ترکی جمہوریت کی حمایت میں ہنگامہ آرائی اور فسادات کا یہی گروپ ذمہ دار تھا۔ فروری 1979ء میں اغکا نے استنبول کے ایک اخبار کے ایڈیٹر کو صرف اس بناء پر قتل کر دیا کہ وہ مغرب نواز تھا۔ اغکا پکڑا گیا لیکن گرے وولف کی مدد سے قید سے فرار ہو گیا۔ اگلے ہی روز اخبار کو پوپ کے ترکی کے دورے کے بارے میں ایک افسوناک خط موصول ہوا جبکہ اس دورے میں صرف تین دن باقی رہ گئے تھے۔

مغربی نوآبادیاتی ملاقاتیں، اس خوف کے زیر اثر کہ ترکی اور اس کے برادر اسلامی ممالک، مڈل ایسٹ میں ایک سیاسی، فوجی اور اقتصادی طاقت بن جائیں گے، اس نازک موقع پر صلیبیوں کے کمانڈر انچیف جان پال کو ترکی بھیج رہی ہیں۔ جان پال، جس نے مذہبی لبادہ اوڑھ رکھا ہے۔ اگر اس دورے کو منسوخ نہ کیا گیا تو میں کمانڈر پوپ کو قتل کرنے کے بارے میں سوچوں گا"۔

ایڈمونی اس بات کا قائل ہو گیا کہ یہ خط تہران میں لکھا گیا تھا کیونکہ تقریباً اَن پڑھ اغکا میں اسی طرح اور اس طرز کی تحریر لکھنے کی صلاحیت ہی نہ تھی۔ موساد نے اپنی کمپیوٹرز کی تحقیق سے خمینی کی پرانی تقریروں میں ایسے الفاظ تلاش کر لئے جو پوپ جان پال کا حوالہ دیتے وقت استعمال کئے گئے تھے جیسے "صلیبیوں کا کمانڈر" یا "کمانڈر پوپ"۔

آخر کار پوپ جان پال کا ترکی کا دورہ بغیر کسی سانحے اور حادثے کے گزر گیا۔ اغکا کا نام اور تصویر مختلف انٹیلی جنس ایجنسیوں کے کمپیوٹروں کی زینت بن گئی لیکن موساد نے اسے اپنے کمپیوٹر میں نہیں لیا۔ پوپ جان پال پر قاتلانہ حملے کی تحقیقات پر مامور آسٹریا کی سیکورٹی ایجنسی کے انچارج اتو کارنک نے محسوس کیا کہ اس بارے میں موساد کو آگاہ رکھنا ضروری نہیں تھا کیونکہ اسرائیل وہ آخری ملک ہو گا جہاں اغکا چھپنے کے لئے جائے گا۔

موساد کی تحقیق کے مطابق جیل سے فرار کے بعد اغکا کی روحانی کشش اسے ایران لے گئی جہاں اس نے کئی ماہ مختلف تربیتی کیمپوں میں گزارے، جہاں اس کے دل و دماغ میں نئے نئے مذہبی رجحانات ڈالے گئے۔ موساد نے ان کیمپوں کے بارے میں اپنی اطلاعات و معلومات پر مبنی خفیہ رپورٹوں سے اغکا کی کیمپوں کے دور کی زندگی کا اپنا ایک خاکہ تیار کر لیا۔

"وہ صبح صادق سے قبل نیند سے بیدار ہو جاتا تھا۔ اس وقت اس کے لمبوترے چہرے پر اس کی آنکھیں سرخ ہوتی تھیں۔ وہ اپنے دوسرے زیرِ تربیت ساتھیوں کو جگاتا تھا۔ صبح کی پہلی کرن کے ساتھ انہیں اپنی جھونپڑی کی دیواروں پر آیت اللہ خمینی کی تصویریں، پوسٹر اور انقلابی نعرے چسپاں نظر آتے تھے جن سے ان کے خون میں نیا جوش و جذبہ جنم لیتا تھا۔ لاؤڈ اسپیکر پر گونجنے والے مذہبی گیت اور ترانے ان کا خون گرمانے کا کام کرتے تھے۔

بنیان اور نیکر میں ملبوس اغکا ایک غیر معمولی شخص تھا۔ اُس کے لمبے ہاتھ اور پیر اُس کے جسم اور چھاتی سے مطابقت نہیں رکھتے تھے۔ اس کے کندھے جھکے ہوئے، بازو پتلے اور ٹانگیں لمبوتری تھیں۔ ہر صبح اُس کا پہلا کام، تمام دوسرے رضا کاروں کی طرح اپنا جاء نماز بچھا کر رکوع و سجود کرنا اور اللہ کے نام کا ورد کرنا تھا جو دونوں جہاں کا ملک و مختار، یوم قیامت کا اور دنیا کی ہر چیز کا قادر مطلق ہے، کی تعریف و توصیف کرنا تھا۔ پھر وہ اپنی دعا میں سامراجی طاقتوں، نیٹو، امریکہ اور ان عرب ملکوں، جنہوں نے بڑی طاقتوں کو تیل کی سپلائی بند نہیں کی تھی، کی تباہی کے لئے گڑگڑاتا تھا۔

آخر میں اُس میں مذہبی منافرت ہی بھری رہ گئی تھی، جو سخت قسم کے کینسر کی طرح اس کے دل و دماغ کو چاٹ رہی تھی۔ وہ دوسرے تمام مذاہب کو اپنے مذہب کا دشمن اور مخالف سمجھتا تھا۔ اُس کے تربیت کنندگان نے اس نفرت کو بڑھا چڑھا کر اپنی انتہا تک پہنچا دیا تھا۔ خصوصاً پوپ سے اُس کی نفرت کو مہمیز لگا دی تھی۔ ''ایک شخص جو سفید براق چغے میں ملبوس، بڑے بڑے محلات، جو پہاڑوں سے بھی اونچے ہیں، میں رہتا ہے، قدیم دور کے خلفاء کی طرح حکومت کرتا ہے، فتوے اور حکم نامے جاری کرتا ہے جن کی لاکھوں لوگ تعمیل کرتے ہیں۔ یہ شخص اپنے احکامات کی تعمیل اسی طرح کراتا ہے جس طرح اس کے پیشرو انیس سو سال سے کراتے آئے تھے۔ ناموری اور شان و شوکت اور خطابات ایسے جیسے اللہ کے ہوں، یہ شخص خدا کے خادموں کا خادم کہلاتا تھا، مغربی طاقتوں کا سردار، حضرت مسیح کا نائب تمام کرۂ ارض پر، روم کا بشپ، ویٹی کن سٹی سٹیٹ کا خود مختار حکمران، سب سے بڑا پادری عزت مآب جان پال دوم۔

مہمت علی اغکا (Mehmet Ali Agca) کو یقین دہانی کرائی گئی تھی کہ وقت آنے پر اُسے پوپ کو قتل کرنے کا موقع فراہم کیا جائے گا۔ اس کے کان بھرے گئے تھے کہ پوپ اس وقت برسراقتدار آیا جس وقت اس کے محسن و مربی خمینی نے شاہ (ایران) کی حکومت سے لوگوں کی گلوخلاصی کرائی تھی۔ یہ کوئی اتفاقاً نہیں ہوا تھا۔ ''کافر اور بے دین روم''، جیسا کہ اغکا کے استادوں نے اسے پڑھایا تھا، جان پال کو اس انقلاب کو ملیامیٹ کرنے کے لئے برسراقتدار لایا گیا ہے، جو خمینی نے قرآن کے نام پر برپا کیا ہے۔

اس بیان میں تھوڑی بہت سچائی بھی تھی۔ جان پال اسلام کے بارے میں سخت معاندانہ رویہ رکھتا تھا اور اس کی بنیاد پرستی میں خطرات پنہاں تھے، اُن سے خوفزدہ تھا۔ اٹلی کے مقام ایوریا میں واقع اولیویٹی فیکٹری کے وزٹ کے دوران اس نے اپنی تقریر سے کارکنوں کو اس وقت حیران کر دیا جب اس نے کہا۔

''قرآن اپنے پیروکاروں کو جارحیت کا سبق دیتا ہے جبکہ ہم اپنے لوگوں کو امن کا درس دیتے ہیں۔ یقیناً یہ انسانی فطرت ہے کہ مذہب جو پیغام دیتا ہے آپ اس میں خرابیاں پیدا کر لیتے ہیں لیکن اس کے باوجود کہ لوگوں کو ان کی گمراہی اور بری عادات سیدھے راستے سے بھٹکا دیتی ہیں، عیسائیت امن اور محبت کا پرچار کرتا ہے لیکن اسلام، حملہ، یلغار، جارحیت اور چڑھائی کی تبلیغ کرتا ہے۔ اگر آپ تمام لوگوں کو جارحیت کا سبق پڑھائیں گے تو ہر شخص میں منفی جذبات پیدا ہوں گے۔ آپ کو علم ہے کہ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ وہ ہم پر حملہ آور ہوں گے''۔

جنوری 1981ء میں اغکا ہوائی جہاز سے لیبیا گیا تھا۔ اس کے اس سفر کے بارے میں موساد شش و پنج کا شکار تھی کہ ٹریپولی، لیبیا کے دارالحکومت میں موجود موساد کے ایک مخبر نے انکشاف کیا کہ امریکن انٹیلی جنس ایجنسی سی آئی اے کا ایک باغی اور منحرف افسر فرینک ٹرپل (Frank Terpil) بھی انہی ایام میں ملک میں موجود

تھا۔ ٹرپل پر واشنگٹن میں گرانڈ جیوری نے لیبیا کو ہتھیار سپلائی کرنے، قاہرہ میں قذافی کے ایک مخالف کے قتل کی سازش میں ملوث ہونے، امریکہ کے ریٹائرڈ فوجی پائلٹوں کو لیبیا کے جہاز اڑانے کے لئے بھرتی کرنے اور گرین بیریٹس کی خدمات قذافی کے دہشت گردی کے ٹریننگ کیمپ چلانے کے لئے خدمات حاصل کرنے کے الزامات لگائے تھے۔ لیبیا میں وہ دہشت گردوں کو اس چیز کی تعلیم و تربیت دینے پر مامور تھا کہ مغرب کی خفیہ ایجنسیوں کی نظروں سے اپنے آپ کو کس طرح چھپایا جا سکتا ہے۔ لیبیا سے ٹرپل بیروت (لبنان) چلا گیا تھا، جہاں جا کر وہ غائب ہو گیا تھا۔ موساد کا دعویٰ تھا کہ جب اس کی افادیت و اہمیت ختم ہو گئی تو اسے قتل کر دیا گیا تھا۔

موساد نے معلوم کر لیا تھا کہ اغکا کا ٹرپل سے رابطے کا انتظام تہران میں موجود اس کو کنٹرول کرنے اور اس کی طنابیں ہلانے والوں نے کیا تھا اور پوپ پال پر ناکام قاتلانہ حملے کے بعد روسی ایجنسی کے بی جی پر منکشف کر دیا گیا تھا تاکہ روسی یہ دعویٰ کر سکیں کہ حملے کی منصوبہ بندی امریکن سی آئی اے کی طرف سے کی گئی تھی۔ موساد کی طرح کے بی جی کا نفسیاتی جنگ کے تجزیے کا شعبہ بھی قائم تھا۔ امریکن سی آئی اے بارے میں ہزاروں صفحوں پر مشتمل قصے کہانیاں اور افسانے لکھے ہوئے تھے اور انہیں نشر کرنے کی ضرورت پڑتی تو کئی گھنٹوں کا وقت درکار ہوتا۔ پانی کو مزید گدلا کرنے کے لئے، ایرانی ملاؤں نے اغکا کے لئے انتظام کیا کہ وہ لیبیا کو چھوڑ کر بلغاریہ کے شہر صوفیہ کا سفر اختیار کرے۔ وہاں اس کی ملاقات ایسے لوگوں سے ہوئی جو اپنے آپ کو ملک کی خفیہ ایجنسی کے ارکان بتاتے تھے لیکن اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ وہ واقعی خفیہ والے ہی تھے۔ اس نے فروری 1981ء میں لیبیا سے صوفیہ کا سفر اختیار کیا تھا۔ کے بی جی کی طرف امریکن ایجنسی کو بدنام کرنے کی کوشش کے ردِعمل میں سی آئی اے نے دعویٰ کر دیا۔ کریملن کے ایماء پر بلغارین اغکا کو ہدایات دیتے رہے تھے۔

موقع سے فائدہ اٹھانے کے لئے موساد کے لئے یہ صورتِ حال انتہائی مناسب تھی۔ ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کی انگریز کی پالیسی کی بجائے موساد کا نعرہ تھا۔ ہم تقسیم کرتے اور حکومت کرتے ہیں۔ اس سے نہ صرف موساد سی آئی اے پر ویٹی کن کا انحصار اور اعتبار ختم کرانے میں کامیاب ہو جائے گی بلکہ اپنے نقطۂ نظر اور کہانی کو درست ثابت کر کے اپنے کو ویٹی کن کا سچا خیر خواہ بھی ثابت کر دے گی۔ موساد نے اپنی بات پوپ کے کانوں تک پہنچانے کے لئے ایک طریقہ بھی ڈھونڈ نکالا تھا۔ باقی ہر کام خود بخود ہوتا چلا جاتا تھا۔ اس کے افسروں کی سیکرٹری آف سٹیٹ کے خفیہ اطلاعات جمع کرنے کے نیٹ ورک تک رسائی ہو جائے گی۔ اس کے مخبر اس کے ساتھ مل کر کام کرنے اور بوقتِ ضرورت پادریوں اور ننوں کو اپنے مقاصد کے حصول کے لئے استعمال کرنے اور موقع ملنے پر ویٹی کن کے ہر اہم مقام پر بگنگ ڈیوائسز (خفیہ بات چیت سننے کے آلات) نصب کرنے کے قابل ہو جائیں گے، جیسا کہ زوی نیمر نے اشارتاً بتایا تھا۔

جب تل ابیب میں مہمت علی اغکا کی کہانی کو آخری شکل دے دی گئی تو موساد کے سربراہ ناہوم ایڈمونی نے اس ایک سوال کا جواب دینے کا فیصلہ کر لیا جس پر پوری کہانی کا مدار تھا۔ کمپیوٹر سرچ نے ایک دفعہ پھر مسئلے کا حل پیش کر دیا۔ رافی ایتان کے وقت کا ایک کیتھولک جاسوس جو میونخ میں رہتا تھا، نے بتایا تھا کہ پوپ کی زندگی کے معمولات میں لوگی پوگی کا کس قدر عمل دخل ہے۔ ایڈمونی نے ایلی کو پیغام بھیجا کہ وہ پوگی سے روابط پیدا کرے۔

اب پوپ جان پال پر قاتلانہ حملے کے دو سال بعد پوگی اسے وہ کہانی سنا رہا تھا جو اس نے ایلی سے سنی تھی۔

ایک مہینے بعد 23 دسمبر 1983ء کو 4:30 صبح، سینٹ پیٹرز سکوائر میں لگے کرسمس ٹری کی دن کے وقت روشنیاں بجھانے کے 3 گھنٹے قبل ہی خانساماں نے پوپ جان پال کو بیدار کر دیا تھا۔

حیرت انگیز طور پر خوابگاہ کا کمرہ چھوٹا سا تھا۔ اس کی دیواروں پر اب بھی اس کے پیشرو کی پسندیدہ لینن لگی ہوئی تھی۔ لکڑی کا فرش پالش سے چمک رہا تھا، جس کا کچھ حصہ ایک اونی قالین سے ڈھکا ہوا تھا۔ یہ قالین پولش ننوں نے کھڈی پر تیار کیا تھا۔ بستر کے ایک طرف کی دیوار پر مصلوب مسیح کا مجسمہ لٹک رہا تھا۔ اسی کمرے میں اس کے چار پیشروؤں نے موت کے انتظار میں زندگی کے آخری لمحات گزارے تھے۔ دوسری دیوار پر مقدس مریم کی تصویر تھی۔ یہ دونوں تحائف حکومت پولینڈ کی طرف سے جان پال کو پیش کیے گئے تھے۔ جن خادمانِ خاص اور پادریوں نے جان پال کو اس وقت دیکھا وہ خوش ہوئے پوپ نے اپنی جسمانی طاقت وقوت دوبارہ حاصل کر لی تھی۔

ہمیشہ کی طرح پوپ جان پال نے اپنے دن کا آغاز عبادت کے لئے مخصوص پرائیویٹ جگہ پر گھٹنوں کے بل جھک کر مناجات سے کیا۔ اس کے بعد اس نے شیو کی اور غسل کیا اور وہ کپڑے زیب تن کیے جو اس کے خادم خاص نے نکال کر رکھے تھے۔ ایک لمبا سفید اونی جبہ جس نے اس کے کندھوں کو ڈھانپ لیا۔ سفید قمیص، گھٹنوں تک سفید لمبی جرابیں، براؤن رنگ کے جوتے اور سفید ٹوپی وہ اغکا سے ملنے کے لئے روم کے ریبیبیا (Rebibia Prison) جیل جانے کے لئے تیار تھا۔

اس ملاقات کی اجازت پوپ کی اپنی درخواست پر دی گئی تھی۔ پوپ کے کہنے کے مطابق وہ اغکا کو معاف کرنا چاہتا تھا لیکن درحقیقت وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ موساد نے جو کہانی سنائی تھی، اس میں سچائی کتنی تھی۔ اسے قید خانے وہی ڈرائیور لے کر گیا جو سینٹ سکوائر میں گولی چلنے کے وقت پوپ کی گاڑی چلا رہا تھا۔ روم کی پولیس کا ایک دستہ حفاظتی گارڈ کے طور پر اس کے ساتھ موجود تھا۔ پوپ کی لیموزین کار تیز رفتاری سے شہر میں سے گزرتی ہوئی شمال مشرق کی طرف واقع قید خانے کی طرف بڑھ گئی۔ اس کے پیچھے آنے والی کار میں صحافیوں کا ایک مختصر گروپ سوار تھا، جس میں اس کتاب کا مصنف بھی شامل تھا۔ ان کو اس تاریخی موقع کے مشاہدے کے لئے لے جایا گیا تھا جبکہ پوپ اور اس کا ناکا قاتل روبرو ملنے والے تھے۔

دو گھنٹے بعد پوپ جان پال کو انتہائی سخت سکیورٹی والے حصے میں جانے دیا گیا۔ وہ اکیلا ہی برآمدے میں چلتا ہوا کوٹھری نمبر T-4 تک پہنچا جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور اغکا اس کا منتظر کھڑا تھا۔ اخبار نویس برآمدے میں کھڑے ہو کر انتظار کرنے لگے۔ ان کے ساتھ جیل کے محافظ بھی کھڑے تھے تاکہ اگر اغکا اپنے مہمان کے ساتھ کوئی دھمکی آمیز رویہ اختیار کرے تو فوراً وہاں پہنچ سکیں۔

جیسے ہی پوپ نے اپنا انگوٹھی والا ہاتھ آگے بڑھایا، اغکا تھوڑا آگے آیا، جھجکتے ہوئے پوپ کا ہاتھ تھام لیا اور جھک کر اس کی انگوٹھی کو بوسہ دیا اور مختصر وقت کے لئے پوپ کا ہاتھ اپنے ماتھے کو لگایا۔ پھر ان کے درمیان اٹالین زبان میں مختصر بات چیت ہوئی کیونکہ پوپ کو بتایا گیا تھا کہ اغکا نے جیل میں یہ زبان سیکھ لی تھی۔

''کیا تم مہمت علی اغکا ہو؟''

''جی ہاں''۔ اغکا نے فوراً مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''شب و روز کیسے گزر رہے ہیں؟'' جان پال نے بغور کوٹھری کا جائزہ لیا۔

وہ دلچسپی سے اس جگہ کو دیکھ رہا تھا جہاں اس ناکام قاتل کی بقایا زندگی بسر ہونی تھی۔

جان پال اس کرسی پر بیٹھ گیا جو کوٹھری کے دروازے کے ذرا سا اندر اس کے لئے رکھی گئی تھی۔ اغکا اپنے بستر میں گھس گیا، اپنے ہاتھوں کو ملتے ہوئے۔

"یہاں کیسا محسوس کر رہے ہو؟" پوپ نے پدرانہ شفقت کے لہجے سے پوچھا۔

"ٹھیک ٹھاک ہوں"۔ اب اغکا اتنی آہستگی سے بول رہا تھا کہ اس کے الفاظ پوپ کے علاوہ کسی کے کانوں تک نہیں پہنچ رہے تھے۔

جان پال کا رویہ اور بھی نرم ہو گیا۔ اس کا منہ اغکا کے چہرے کے قریب تھا جس کی وجہ سے محافظوں اور اخبار نویسوں کو نظر نہیں آ رہا تھا۔

اغکا نے پوپ کے بائیں کان میں کچھ کھسر پھسر کی۔ پوپ نے گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے سر ہلایا۔ اغکا نے چند لمحوں کے لئے خاموشی اختیار کر لی۔ اس کے چہرے سے بے اطمینانی کا اظہار ہو رہا تھا۔ جان پال نے دائیں ہاتھ کے اشارے سے اسے کہا کہ وہ اپنی بات جاری رکھے۔ دونوں ایک دوسرے کے اتنے قریب تھے کہ دونوں کے سر تقریباً جڑے ہوئے لگ رہے تھے۔ اغکا کے ہونٹ بمشکل حرکت کرتے تھے۔ جان پال کے چہرے پر دکھ کے آثار نظر آتے تھے۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں جیسے وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا ہو۔

بات کرتے ہوئے اغکا نے جان پال کو آنکھیں بند کئے دیکھ کر اپنا فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔ جان پال نے پھر بھی آنکھیں نہیں کھولیں۔ صرف اس کے لب ہلے جنہیں صرف اغکا ہی سن سکتا تھا۔

ایک دفعہ پھر اغکا نے اپنی بات شروع کر دی۔ چند منٹ کے بعد پوپ نے اپنے ہاتھ سے کچھ اشارہ کیا۔ اغکا نے بولنا بند کر دیا۔ جان پال نے اپنا بایاں ہاتھ اپنے ماتھے پر رکھ لیا، جیسا کہ وہ اپنی آنکھیں اغکا سے چھپانا چاہتا ہو۔

پھر جان پال نے اپنا ہاتھ بڑھا کر نوجوان اغکا کے کاندھے پر رکھ دیا، گویا اس نے جو کچھ بتایا تھا اس پر اس کا شکریہ ادا کر رہا ہو۔ ان کی یہ ملاقات 21 منٹ تک جاری رہی۔ پھر پوپ آہستہ آہستہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ اغکا کی حوصلہ افزائی کے لئے آگے بڑھایا تا کہ اغکا بھی ایسا ہی کرے۔ دونوں اشخاص نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھا۔ پوپ نے یہ انتہائی متاثر کن ڈرامہ اس طرح ختم کیا کہ اس نے اپنے چغے کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور اس میں سے گتے کی بنی ہوئی ایک ڈبی نکالی، جس پر پوپ کا سرکاری کراس بنا ہوا تھا جو اس نے اغکا کو تھما دی۔ حیران و ششدر اغکا نے وہ ڈبی اپنے ہاتھ پر رکھ لی۔

پوپ نے کچھ توقف کیا۔ اس کے لبوں پر انتہائی میٹھی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اغکا نے ڈبی کھولی۔ اس کے اندر چاندی سے بنا ہوا گلاب کا پھول تھا جس کے مرکز میں انتہائی قیمتی موتی، جسے "موتیوں کی ماں" کہا جاتا تھا، جڑا ہوا تھا۔

اغکا نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ "تی رنگریزیو، تی رنگریزیو"۔

"تانئیٹے! تانئیٹے"۔ پوپ نے جواب دیا۔ پھر پوپ نے آگے جھک کر اس سے کوئی بات کی جسے صرف اغکا ہی سن سکا۔

اس کے بعد کوئی مزید بات کئے بغیر پوپ کوٹھری سے باہر آ گیا۔

بعد ازاں ویٹی کن کے ایک ترجمان نے بتایا۔ "علی اغکا کسی حد تک ہی (سازش کنندگان) سے آگاہ ہے۔ بالائی سطح پر اُسے کچھ معلوم نہیں ہے۔ اگر کسی نے کوئی سازش تیار کی تھی تو یقیناً وہ کوئی پیشہ ور لوگ ہوں گے، جو اپنے پیچھے کوئی نشانی نہیں چھوڑتے۔ کسی کو کبھی بھی

سلیت معلوم نہیں ہو سکتی"۔

یہ کوئی پہلا موقع نہیں تھا کہ ویٹی کن نے سچائی کو مان لیا تھا۔ انگا نے ان باتوں کی تصدیق کر دی تھی۔ جو موساد نے لوگی پوگی کو بتائی تھیں۔ پوپ کو ہلاک کرنے کی منصوبہ بندی تہران میں کی گئی تھی۔ اس علم کے بعد اسلام اور اسرائیل کے بارے میں جان پال کے رویے میں تبدیلی آ جانی چاہئے تھی۔ اس نے اپنے سٹاف کو بتایا تھا کہ دنیا میں دن بدن بڑھتے ہوئے ٹکراؤ کا زیادہ امکان مشرق اور مغرب کے درمیان نہیں، نہ ہی امریکہ اور روس کے درمیان ہے بلکہ اسلامی بنیاد پرستی اور عیسائیت کے درمیان ہے لیکن عام پبلک میں اسلام، ایک مذہب اور اسلامی بنیاد پرستی کا وہ ذکر نہیں کرتا تھا۔

اسرائیل میں موساد کے تجزیہ کاروں نے دیکھا کہ پوپ کے رویے میں تبدیلی سے لگتا تھا کہ اس نے موساد کی طرف سے پوگی کے سامنے پیش کی گئی شہادت کو تسلیم کر لیا ہے لیکن فوری طور پر ایسے کوئی آثار نظر نہیں آئے تھے کہ دنیا کے معاملات کے بہتر ادراک کے لئے جان پال موساد کو بھی مدعو کرے گا، تاہم اس نے پوگی کے ایلی سے مذاکرات و گفتگو کی افادیت کو مان لیا تھا۔ اسرائیلی حکومت اور ایڈمونی نے ایلی کو کہا کہ وہ پوگی سے اپنے روابط برقرار رکھے۔ وہ دونوں یورپ کے مختلف شہروں میں میل ملاقات کرتے رہے، کبھی کسی اسرائیلی سفارتخانے میں اور کبھی کسی چرچ میں۔ ان کی گفتگو اور بات چیت وسیع موضوعات پر ہوتی رہتی تھی لیکن ہمیشہ ہی گفتگو کا مرکز مشرق وسطیٰ کی صورت حال اور پوپ کی "ارض مقدس" کے دورے کی خواہش ہوتی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ جان پال کی یہ دیرینہ خواہش اور کوشش بھی تھی کہ فلسطینیوں کو آزاد وطن حاصل ہو جائے۔

پوگی نے واضح کر دیا تھا کہ پوپ پی ایل او کے رہنما یاسر عرفات کو نہ صرف پسند کرتا ہے بلکہ اس سے گہری عقیدت بھی رکھتا ہے۔ جان پال کو موساد کے سابق سربراہ رافی ایتان، ڈیوڈ، کمشے اور یوری ساگتوئی کے ان نظریات سے قطعی اتفاق نہیں تھا کہ پی ایل او کا سربراہ (یاسر عرفات) "ایک وحشی جلاد، قصاب، ہمارے بچوں اور عورتوں کا قاتل، ایک ایسا خونی شخص ہے جسے میں اپنے خالی ہاتھوں سے قتل کرنا چاہتا ہوں"۔

پولینڈ میں پوپ کی اپنی ابتدائی زندگی نازیوں کے خلاف مجاہدانہ جدوجہد اور مزاحمت کرتے ہوئے گزری تھی، اسی قسم کی جدوجہد اب فلسطین کی آزادی کے لئے یاسر عرفات کر رہا تھا، اس کی شخصیت ایک کرشماتی شخصیت تھی جسے ہر آزادی پسند سراہتا تھا۔ "موساد" کی طرف سے قتل کی کئی کوششوں کے باوجود وہ ہر دفعہ بچ نکلا تھا۔ پوگی نے ایلی پر واضح کیا کہ یاسر عرفات نے ایک دفعہ جان پال کو بتایا اس کی چھٹی حس ہمیشہ بیدار رہتی ہے اور خطرے سے بروقت آگاہ کر دیتی ہے بلکہ اس نے ایک ساتویں حس بھی اپنے اندر پیدا کر لی ہے۔ "ایسے آدمی کو زندہ رہنے کا حق ہے"۔ پوگی نے ایلی پر واضح کر دیا۔

اس قسم کی جھلکیوں سے ایلی نے پوپ کی ذہنی سوچ کا ایک واضح خاکہ تیار کر لیا تھا لیکن جان پال محض زبانی جمع خرچ کی بجائے اس تاریخی سچائی کو پیش نظر رکھتا تھا عیسائیت کی جڑیں یہودیت میں پیوست ہیں لہٰذا یہ حقیقت فراموش نہیں ہونی چاہئے اور صیہونی مخالف جذبات، جو اس کے اپنے وطن عزیز، پولینڈ میں بھی اپنی انتہا پر ہیں، ختم ہونے چاہئیں۔

مئی 1984ء میں پوگی نے ایلی کو ویٹی کن آنے کی دعوت دی۔ دونوں شخصیات آرچ بشپ کے دفتر میں، جو پاپائے روم کے محل میں واقع تھا، گھنٹوں باتیں کرتے رہے۔ آج تک کوئی یہ نہیں جان سکا کہ ان کے درمیان کیا بات چیت ہوئی۔

اسرائیل کے لئے ایک دفعہ پھر قومی انٹیلی جنس

کمیونٹی کو ایک نئے سکینڈل کے لئے متحرک کرنے کا موقع تھا۔ ایک ماہ قبل 12 اپریل کو چار پی ایل او دہشت گردوں نے ایک مسافر بس کو، جس میں 35 مسافر تھے اور جو جنوبی قصبے عشق لون کی طرف روانہ ہوئی تھی، اغوا کر لیا تھا۔ سرکاری بیان کے مطابق اندرونِ ملک سکیورٹی کی ذمہ دار ایجنسی شن بیت کے ایجنٹوں نے بس پر یلغار کر کے، دوطرفہ فائرنگ میں دو دہشت گردوں کو ہلاک اور دو کو زخمی کر دیا تھا، جو ہسپتال جاتے ہوئے راستے میں ہلاک ہو گئے تھے۔

اخباری رپورٹوں کے مطابق جب زخمی دہشت گردوں کو بس سے نکالا گیا تو وہ معمولی زخمی تھے اور ان کی حالت بظاہر زیادہ خراب نہ تھی۔ انکشاف یہ ہوا کہ ہسپتال لے جاتے ہوئے شن بیت کے افسروں نے ایمبولنس کے اندر دونوں زخمیوں کو اتنے شدید تشدد کا نشانہ بنایا کہ دونوں ہلاک ہو گئے۔ اگرچہ اس واقعہ میں موساد براہِ راست ملوث نہ تھی لیکن پوری دنیا میں اسے ہی نشانہ بنایا گیا اور اس کی مذمت کی گئی۔

اسی پس منظر میں پوگی نے ایلی کو وضاحت سے بتایا کہ ایسی صورتِ حال میں جان پال کے لئے اسرائیل سے سفارتی تعلقات قائم کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جواب میں ایلی نے پوگی کو صاف کہہ دیا کہ ایسے حالات میں پوپ کو ارضِ مقدس کے دورے کی اجازت کا بھی سوال پیدا نہیں ہو سکتا۔

ویٹی کن اور اسرائیل کے درمیان پل بنانے کے آغاز کا یہ اچھا موقع تھا۔ لہٰذا دونوں نے فیصلہ کیا وہ رابطہ قائم رکھیں گے اور امید کا دامن نہیں چھوڑیں گے۔

13 اپریل 1986ء کو جان پال نے ایک ایسا کام کیا جو آج تک کسی پوپ نے نہیں کیا تھا۔ وہ روم میں، لنگو ٹیورروڈ پر واقع یہودیوں کی عبادت گاہ، ''سائنا گوگ'' میں داخل ہوا جہاں شہر کے سب سے بڑے مربی نے اس کا استقبال کیا اور اس سے بغلگیر ہوا۔ دونوں اپنے مذہبی لباسوں میں ملبوس تھے۔ دونوں افراد ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے، خاموش اجتماع سے گزر کر ''تیوا''، وہ پلیٹ فارم جہاں سے تورات کی تلاوت کی جاتی ہے، پہنچے۔

اجتماع کے پیچھے ایلی بھی بیٹھا ہوا تھا۔ یہ تاریخی لمحہ اسی کی کوششوں سے ظہور پذیر ہوا تھا۔ اس کے باوجود یہ وہ مقصد پورا نہ کر سکا، جس کا اسرائیل خواہشمند تھا۔ پوپ کی طرف سے اسرائیل کی سفارتی سطح پر قبولیت۔

یہ موقع دسمبر 1993ء میں آیا جبکہ ویٹی کن سٹی سیکرٹریٹ کے سخت مؤقف رکھنے والے افسروں کی مخالفت کے باوجود اسرائیل کو سفارتی سطح پر تسلیم کر لیا گیا۔

اس وقت تک ناہوم ایڈمونی، موساد کا سربراہ نہیں رہا تھا۔ اس کے جانشین شبتائی شاوت نے موساد کو ویٹی کن کے قریب لانے کا نازک کام جاری رکھا۔ اس دوران وہ پوپ کو اس بات کا قائل کرنے کی کوشش کرتے رہے کہ دونوں اسرائیل اور پی ایل او کسی متفقہ فیصلے پر پہنچنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں اور دونوں، عیسائیت اور یہودیت کو اسلامی بنیاد پرستی سے خطرہ ہے۔ پوپ جان پال عملی طور پر اس کا زخم خوردہ تھا۔

اس دوران موساد نے اپنی خفیہ سرگرمیوں کا رخ ایسے براعظم کی طرف موڑ دیا جہاں کے لوگوں میں مستقبل کے بارے میں ویٹی کن نے امیدوں کے بے شمار چراغ روشن کر رکھے تھے۔ براعظم افریقہ، جہاں سے پوپ کو امید تھی کہ کسی سیاہ فام پوپ کا ظہور ہوگا لیکن یہی وہ جگہ تھی جہاں موساد نے پہلے ہی ایک بلیک انٹیلی جنس ایجنسی کو دوسری کے خلاف صف آراء کر رکھا تھا تا کہ اپنی پوزیشن بہتر کر سکے۔

(جاری ہے)

تحفۂ خداوندی

ایک صابر شاکر اور قناعت پسند انسان کا حال
جسے شکر کے بدلے اللہ نے نعمت عطا کی۔

☆ نوید اسلام صدیقی

گزشتہ رمضان میں کچھ کتابوں کی خریداری کے لیے اردو بازار جانا پڑا، اردو بازار جائیں اور شبیر صاحب کی بک شاپ پر نہ جائیں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دکان میں شبیر صاحب کے سامنے ایک پندرہ سولہ سالہ لڑکا بیٹھا ہوا تھا۔ شبیر صاحب نے بتایا کہ یہ یعقوب صاحب کا پوتا عرفان ہے۔ میں نے پوچھا کہ یعقوب صاحب کا کیا حال ہے، شبیر صاحب نے بتایا کہ وہ تو ہر سال رمضان مکہ میں گزارتے ہیں، آج کل ادھر ہی بیٹھے اللہ اللہ کر رہے ہوں گے۔ ہم کافی دیر یعقوب صاحب کو یاد کرتے رہے۔

اُن کی زندگی ایک مردِ مومن کی زندگی ہے۔ وہ اس بات کا بڑا خیال رکھتے ہیں کہ اللہ کا دیا ہوا پیسہ وہاں خرچ نہ ہو جہاں اُس نے اجازت نہیں دی ہے۔ جب پاکستان بنا ہے، مکانوں اور زمینوں کی الاٹ منٹ بغیر رشوت دیئے ہونی ممکن نہ تھی، آپ نے کہا میں ساری عمر جھونپڑی میں گزار لوں گا لیکن رشوت ایک دھیلا نہیں دوں گا۔ نتیجہ یہ کہ ایک جھونپڑی میں خوار ہوتے رہے۔ رشوت جمع کرنے کے لیے کارندے ہر طرف پھر رہے ہوتے تھے، ایک کارندہ جب بھی اس علاقے میں آتا آپ سے اگر ملاقات ہو جاتی تو سمجھانے کی کوشش کرتا کہ ہم آپ سے رشوت اسلامی طریقے سے شریعت کے مطابق دلوائیں گے، لیکن وہ ہنس کر ٹال دیتے۔ ایک دن وہ آیا اور کہنے لگا کہ آرڈر ہوا ہے کہ تمام جھونپڑیوں میں رہنے والے مہاجروں کو چار چار مرلے دے کر راستوں میں سے تمام جھونپڑیاں ختم کردی جائیں۔ کل آپ دفتر آئیں آپ کو زمین الاٹ ہو جائے گی۔

وہ اگلے دن دفتر گئے، وہاں وہی آدمی ملا اور کہنے لگا ابھی بھی موقع ہے، سو روپے مجھے پکڑائیں، آپ کو اچھی جگہ پر چار مرلے لے دیں، نہیں تو پھر گلہ نہ کرنا۔ آپ نے پھر صاف انکار کر دیا کہ رشوت میں ایک روپیہ نہیں دوں گا۔ نتیجتاً آپ نے جب آ کر الاٹ شدہ زمین دیکھی تو وہ ایک لمبی سی پٹی تھی جو پانی کا ایک چھوٹا سا جوہڑ تھا، جس میں ہر وقت دو چار بھینسیں بیٹھی رہتیں۔ آپ نے اللہ کی مرضی سمجھ کر، اللہ کا فیصلہ سمجھ کر اس جگہ کو قبول کر لیا۔

اُس میں دن بھر مٹی لا کر ڈالتے رہتے، جب کچھ معقول بلندی ہوگئی تو جھونپڑی وہاں بنالی، زمین کے گرد سرکنڈوں کی دیوار بنالی اور دوسرے سرے پر ایک کھلے جھونپڑے میں چائے کا ہوٹل کھول لیا، کچھ عرصہ بعد کھانے کا انتظام بھی کر لیا گیا۔ ہوٹل بڑا کامیاب رہا کیونکہ تمام علاقے میں مکانوں کی مرمت اور تعمیر کا کام ہو رہا تھا۔ یعقوب صاحب ہر وقت شکر الحمد للہ کی تسبیح پڑھتے رہتے اور خدا کی عنایات کا ہر ایک سے ذکر کرتے، اور کہتے ہمارے لیے تو بھئی یہ تحفۂ خداوندی ہے۔

چند سال بعد اس علاقے کا باقاعدہ نقشہ بنایا گیا، اللہ کی قدرت یہ چار مرلے زمین ایک چوک کا کارنر پلاٹ بن گیا۔ کاروباری لوگوں کو پتہ لگا تو صبح شام چکر لگانے لگے، ہر ایک دوسرے سے بڑھ کر قیمت لگا رہا تھا۔ اور یوں زمین کی قیمت ایک دم کئی ہزار تک پہنچ گئی۔ یعقوب صاحب نے زمین نہ بیچنے کا فیصلہ کیا کہ یہ تو وہ زمین ہے جو تحفۂ خداوندی ہے، میں اسے کیوں بیچوں۔ اسی دوران اُن کی ملاقات سُنار حاجی عبدالغفور صاحب سے ہوئی، انہوں نے کہا کہ میں آپ کے اس فیصلے سے سو فیصد متفق ہوں کہ یہ زمین بیچنی نہیں چاہیے، کیونکہ جب یہاں پکی سڑک بن گئی، چوک آباد ہو گیا تو اِس زمین کی قیمت ایک دم لاکھوں میں جائے گی۔

حاجی صاحب نے کہا کہ ایک تجویز پیش کرتا ہوں کہ یہاں ایک مارکیٹ بنادی جائے، دو دکانیں میں کرائے پر لوں گا، بلڈنگ بننے میں جو میری رقم خرچ ہوگی وہ کرائے کے حساب میں ایڈجسٹ ہوتی رہے گی۔ باقی دکانیں بھی لوگوں سے ایڈوانس کرایہ لے کر بنالیں گے۔ اِس طرح ایک مارکیٹ بنائی گئی جس میں نیچے دکانیں تھیں اور اوپر یعقوب صاحب کی رہائش تھی۔ ہوٹل ختم ہو چکا تھا، یعقوب صاحب ایسے ہی اِدھر اُدھر گپ شپ کر کے دن گزارتے، ایک دن شبیر صاحب کی دکان پر اردو بازار چلے گئے، شبیر صاحب نے کہا یہاں ایک پبلشر کو ایک پڑھا لکھا آدمی دکان پر چاہیے، کام کی جو نوعیت ہے وہ آپ کے لیے بالکل مناسب ہے، یعقوب صاحب نے انٹرویو دیا اور وہاں کام شروع کر دیا۔ کتابوں اور سٹیشنری کے کام میں اُن کی ساری زندگی گزر گئی۔ آج اُن کا ایک بیٹا اپنی سٹیشنری کی دکان چلا رہا ہے، اور دوسرا تعلیمی اداروں کے لیے کتب شائع کرتا ہے۔

پختہ سڑک بنتے بنتے کئی سال لگ گئے، جب پختہ سڑک تیار ہوئی تو یعقوب صاحب کی دکانیں سڑک سے ایک ڈیڑھ فٹ نیچے ہو گئیں۔ اس موقع پر بہت سارے کاروباری لوگ یہ جگہ خریدنے کے لیے اُن کے پیچھے پڑے رہے، دو بڑے بینک اپنی برانچ وہاں تعمیر کرنا چاہتے تھے، لیکن یعقوب صاحب نے ہر ایک کو ایک ہی جواب دیا کہ بھئی میرے لیے یہ زمین کا ٹکڑا نہیں ہے یہ تو میرے لیے عطیۂ خداوندی ہے۔ اب اگر جگہ بیچنی نہیں تھی تو ضرورت اس امر کی تھی کہ عمارت کو گرا کر دوبارہ تعمیر کیا جائے۔ یعقوب صاحب کے لئے بھی اب پیسوں کا بندوبست کرنا ممکن ہو چکا تھا۔ انہوں نے پہلی عمارت گرا کر تین منزلہ نئی بلڈنگ بنوائی اور خود وہاں چوک سے ایک مکان میں منتقل ہو گئے جو قریب ہی ایک گلی میں تھا۔

تازہ ترین صورتِ حال یہ ہے کہ جب سے لاہور کی رنگ روڈ بنی ہے، جو یہاں قریب سے ہی گزرتی ہے، اِس جگہ کی قیمت ایک دم زمین سے آسمان پر پہنچ گئی ہے۔ ایک کروڑ روپے سے بھی زیادہ کی آفرز آ رہی ہیں، وجہ یہ ہے کہ اگر یہ کونے کی جگہ مل جاتی ہے تو پچھلی زمینیں کم قیمت پر لے کر تین چار کنال پر پھیلی ہوئی بڑی بلڈنگ بن سکتی۔ مگر یعقوب صاحب کہتے ہیں میں یہ تحفۂ خداوندی کسی قیمت پر نہیں بیچوں گا۔

◆◆◆